ستم نصیب
PDFBOOKSFREE.PK
ملک صفدر حیات
(ریٹائیرڈ ڈی ایس پی)

فہرست

سیاہ کار:

بہت پرانی کہاوت ہے۔ عورت چوہے سے ڈرتی ہے' چوہا مرغی سے۔ مرغی بلی سے اور بلی کتے سے۔ کتا مرد سے اور مرد عورت سے جب کہ عورت... چوہے سے۔ ڈرانے اور ڈرنے کا عمل کڑی در کڑی ایک زنجیر کی صورت جاری رہتا ہے۔ اج میں اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا جو واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں' یہ تمام کردار کسی نہ کسی شکل میں اس کا حصہ ہیں۔

ان دنوں میں ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک دور دراز قصبے میں تعینات تھا۔ ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا روز مرہ کے امور نمٹا رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا' کوئی فریادی عورت مجھ سے ملنے آئی تھی۔ میں نے اطلاع دینے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔

''وہ عورت کون ہے اور کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟''

کانسٹیبل نے بتایا ''ملک صاحب! اس عورت کا نام عابدہ خانم ہے۔ نزدیکی گاؤں سے آئی ہے۔ اس کے ساتھ چودہ پندرہ سالہ ایک نوجوان لڑکا بھی ہے۔ وہ آپ کے پاس کسی کے خلاف رپورٹ درج کروانے آئی ہے۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں بتایا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کانسٹیبل سے کہا ''تم ان دونوں کو اندر بھیج دو۔''

کانسٹیبل ''اچھا جی'' کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد عابدہ خانم نامی وہ عورت میرے سامنے موجود تھی۔ اس کی عمر پینتالیس چھیالیس سال کے قریب تھی۔ اس کے ساتھ جو نوجوان تھا اس کی عمر کے بارے میں کانسٹیبل کا اندازہ درست نظر آتا تھا۔ مذکورہ لڑکے کے سر پر کسی گھریلو کپڑے کی موٹی تازی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ میری میز کے سامنے رکھی کرسیوں پر

بیٹھ گئے۔ میں نے سوالیہ نگاہ سے اس عورت کو دیکھا اور پوچھا۔

''عابدہ خانم! تم کس کے خلاف رپورٹ لکھوانے آئی ہو؟''

''وہ نامراد کوئی غیر نہیں، ہمارا اپنا رشتے دار ہی ہے۔'' عابدہ نے زہریلے لہجے میں جواب دیا ''صدیقا'' میرے گھر والے کا بھانجا لگتا ہے تھانے دار صاحب۔ اسی شیطان نے میرے امتیاز کو مارا ہے۔ اندرونی چوٹیں تو رہیں ایک طرف، یہ دیکھیں'' اس نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لڑکے کے سر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''صدیقا نے تو میرے بچے کا سر بھی پھاڑ دیا ہے۔ بڑی مشکل سے خون رکا ہے۔ میں محمد صدیق عرف صدیقا کے خلاف رپورٹ درج کروانے آئی ہوں۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے سوال کیا ''صدیقا نے تمہارے بیٹے امتیاز کو کس بات پر مارا ہے؟''

جواب دینے کے بجائے عابدہ نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا ''نا'' تھانے دار صاحب! آپ ہی بتائیں... سچ بولنا اور سچی بات سب کے سامنے کہنا کوئی جرم ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں، یہ کوئی جرم نہیں۔''

''یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔'' وہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی ''لیکن کوئی میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ میرے لاڈلے بچے نے تو ایک سچی اور کھری بات کی تھی جس پر صدیقا نے اس بے چارے کو بری طرح مارا اور سر پھاڑ دیا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''تھانے دار صاحب! آپ رپورٹ درج کر کے صدیقا کے خلاف فوراً کارروائی کریں۔''

عابدہ خانم جس گاؤں سے تعلق رکھتی تھی وہ میرے تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے یہ تو اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے بیچ کوئی باہمی خاندانی تنازع جھگڑے کا باعث ہوگا تاہم میں نے اس کے منہ سے حقیقت جاننا ضروری سمجھا اور پوچھا۔

''عابدہ! تم نے ابھی تک یہ تو بتایا ہی نہیں کہ تمہارے بیٹے نے ایسی کون سی کھری اور سچی بات کہہ دی تھی جس پر اسے اپنے پھوپی زاد سے مار کھانی پڑی؟''

بات ختم کر کے میں نے سوالیہ نگاہ سے عابدہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے امتیاز حسین کو بھی دیکھا۔ وہ جب سے آیا تھا، خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ عابدہ خانم نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''تھانے دار صاحب! بات یہ ہے کہ صدیقا کی ماں آسیہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔''

اس کے لہجے میں اتنی پُراسراریت تھی کہ میں نے چونک کر پوچھا ''وہ کن معنوں میں اچھی عورت نہیں ہے؟''

''آسیہ جادو ٹونے کے چکروں میں پڑی رہتی ہے۔'' عابدہ نے بتایا۔

''پھر؟'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

وہ بولی ''آسیہ نے پچھلے کئی ماہ سے ہماری زندگی اجیرن بنا دی ہے۔ وہ جادو ٹونے کے مختلف ہتھکنڈوں سے ہمیں پریشان کر رہی ہے۔ میری جوان جہان بیٹی چارپائی سے لگ گئی ہے۔ آسیہ کی دشمنی کا اصل نشانہ تو میری بیٹی بتول ہی ہے۔ جادو کے اثرات نے اسے برے حال کو پہنچا دیا ہے۔ وہ ایک نامعلوم بیماری کا شکار ہو چکی ہے تھانے دار صاحب!'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا ''آسیہ کو آپ لوگوں سے کیا دشمنی ہے۔ وہ تمہاری بیٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئی ہے؟''

اگرچہ مجھے اس کی جادو ٹونے والی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا تاہم اسی تناظر میں بات کرنا ضروری تھا۔ اس نے تھوک نگلنے کے بعد جواب دیا۔

''تھانے دار صاحب! بات بہت چھوٹی سی تھی۔ آسیہ اپنے بیٹے صدیقا کی شادی بتول سے کرنا چاہتی تھی۔ اس شادی کے لیے بتول کا باپ منظور حسین بھی راضی ہو گیا تھا لیکن میں کسی طرح تیار نہ ہوئی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ میری بچی لاکھوں میں ایک ہے۔ صدیقا اس کا پاسکو (پاسنگ) بھی نہیں ہے۔ وہ کسی بھی طرح میری حسین و جمیل بیٹی کے جوڑ کا نہیں ہو سکتا۔ دوسری اور سب سے اہم بات یہ کہ میں آسیہ کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ بہت جھگڑالو اور کمینہ فطرت عورت ہے۔ ہر وقت الٹے سیدھے چکروں میں مصروف رہتی ہے۔ وہ میری نان (نند) ہے۔ مجھ سے زیاہ اسے کون جان سکتا ہے وہ تو میری بچی کا جینا عذاب کر دیتی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سانس درست کی اور بولی ''چنانچہ میں اپنی بات پر ڈٹی رہی۔ آخر کار میرا گھر والا بھی اس رشتے سے انکار پر تیار ہو گیا۔ جب آسیہ کی سیدھی کوشش ناکام یاب ہو گئی تو اس نے الٹا راستہ اختیار کر لیا اور جادو کا سہارا لے کر اس نے میری بتول کو چارپائی سے لگا دیا ہے۔''

اس کی طویل وضاحت کے جواب میں، میں نے استفسار کیا ''کیا آسیہ بیگم بھی اسی گاؤں میں رہتی ہے جہاں سے تم آئی ہو؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا ''ہاں جی، وہیں رہتی ہے۔''

میں نے پوچھا" تم نے بڑے دعوے سے بتایا ہے کہ تمہاری نند آسیہ جادوٹونے کے چکر میں لگی ہوئی ہے اور تمہاری بیٹی بتول کی بیماری کا سبب بھی جادوٹونا ہی ہے۔ کیا تمہارے پاس اپنے دعوے کا کوئی ثبوت بھی ہے؟"

"کس قسم کا ثبوت جی؟" وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا" جادوٹونے کا ثبوت؟"

"کئی ثبوت ہیں جی۔" وہ پُروثوق لہجے میں بولی۔

"مثلاً ؟"

اس نے میرے مثلاً کے جواب میں بتایا" تھانے دار صاحب! جب ہم نے بتول کے رشتے سے چٹا انکار کر دیا اور آسیہ مایوس ہو کر چلی گئی تو اس کے چند روز بعد ہی بتول کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس کی بھوک پیاس اور نیند کم ہونے لگی۔ علاج معالجے سے اسے کوئی فائدہ نہ ہوا تو میں سمجھ گئی کہ بتول کی بیماری میں کوئی غیبی ہاتھ شامل ہے پھر مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ ایک صبح ہم سو کر اٹھے تو گھر کے وہڑے (صحن) میں ایک چوہا مرا پڑا تھا۔"

عابدہ نے اتنا کہہ کر ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اس نے کوئی سربستہ راز منکشف کر دیا ہو۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"صحن میں کسی مرے ہوئے چوہے کا ملنا کس بات کا ثبوت ہے؟"

"کالا جادو۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے کہا" میں نے سنا ہے کہ اس قسم کے کاموں کے لیے کالی بلی یا اُلو وغیرہ کو استعمال کیا جاتا ہے۔"

"چوہا بھی بہت اہمیت رکھتا ہے تھانے دار صاحب!" وہ عالمانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ میری جانب وہ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے اسے میرے تھانے دار ہونے پر افسوس ہو رہا ہے۔ اس کی دانست میں اتنے بے خبر شخص کو اس اہم عہدے پر نہیں ہونا چاہیے تھا جسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ جادوٹونے کے عملیات میں چوہا کیا اہمیت رکھتا ہے۔

میں نے کہا" عابدہ! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ صدیقا نے کس بات پر تمہارے بیٹے کا سر پھاڑا ہے۔ تم جس سلسلے میں رپورٹ درج کروانے آئی ہو پہلے وہ کہانی تو مکمل کر لو!"

"میں اسی طرف آ رہی ہوں تھانے دار صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

بہ حالتِ مجبوری مجھے اس کی پوری بات سننا پڑی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگی" مردہ چوہے کو دیکھ کر میں یہ تو سمجھ گئی تھی کہ معاملہ کیا ہے۔ میرا شک فوراً آسیہ کی طرف گیا تھا کیوں کہ اس کے علاوہ ہمارا کوئی دشمن نہیں تھا۔ آئندہ چند روز بھی صبح وہڑے میں مردہ چوہا پڑا ملتا رہا پھر چند دنوں کے لیے یہ سلسلہ رک گیا۔ اس دوران میں بتول کی طبیعت ذرا سنبھل گئی تھی مگر اس بدقسمت کی مصیبت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ رکا ہوا سلسلہ پھر چل نکلا لیکن اس مرتبہ چوہے کی جگہ مرغی نے لے لی۔ آئے دن جب ہم صبح سو کر اٹھتیں تو وہڑے میں ایک مردہ مرغی پڑی ملے۔ ہم کئی مردہ مرغیاں اٹھا کر گھر سے باہر پھینک چکے ہیں۔ تین دن پہلے مردہ مرغیوں کی جگہ ایک کالی بلی مردہ حالت میں پڑی ملی ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیں یہ کالا جادو نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم نے ایک عامل کامل سیانے کو بھی دکھایا ہے۔ اس نے پورے وثوق سے کہا ہے کہ ہمارے گھر اور خصوصاً بتول پر سخت قسم کا سفلی عمل کیا گیا ہے۔"

میں نے پوچھا" جس عامل کامل نے کالے جادو کا انکشاف کیا ہے، اس کے پاس اس کا کوئی توڑ بھی ہوگا!"

"وہ کوشش کر رہا ہے۔" عابدہ نے بتایا" لیکن آسیہ نے بہت سخت قسم کا عمل کروا رکھا ہے اس لیے اس کے توڑ میں ذرا دقت پیش آ رہی ہے۔"

اس سارے قصے کو میں نے تجزیاتی طور پر یوں لیا۔ اس گھر میں یا آس پاس کوئی کالی بلی رہتی تھی جو چوہے اور مرغیاں وغیرہ کھاتی تھی جن کی "لاشیں" گاہے بگاہے عابدہ کے گھر کے صحن میں پائی جاتیں بالآخر ایک روز وہ کالی بلی بھی اپنی طبعی عمر پوری کر کے چل بسی۔ عابدہ توہم پرستی میں واقعات کو غلط رنگ دے رہی تھی۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا" عابدہ خانم! سمجھو تمہاری مصیبت ختم ہوگئی۔ اب تمہاری بیٹی بتول بھلی چنگی ہو جائے گی۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی" تھانے دار صاحب! یہ سفلی عمل اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے۔ عامل بابا کہہ رہا تھا آگے چل کر اور مشکلات کا سامنا ہوگا۔"

میں سمجھ گیا، وہ عامل کامل ان سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا دھندا چمکا رہا تھا۔ میں نے کہا" میں اس عامل سے ملوں گا۔ کیا نام ہے اس کا اور وہ رہتا کہاں ہے؟"

عابدہ نے بتایا" عامل بابا کا نام ملنگ کالیا ہے اور وہ ہمارے گاؤں ہی میں رہتا ہے۔ قبرستان

کے قریب اس کا آستانہ ہے۔ اس کے آستانہ کے نزدیک سے ریلوے لائن بھی گزرتی ہے؟''

میں نے ایسے ہی پوچھ لیا'' یہ بھی تو ہوسکتا ہے' آسیہ نے اسی کالیا ملنگ سے جادو ٹونا کروایا ہو؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی'' بالکل نہیں' میں نے پوری طرح پتا لگا لیا ہے۔ آسیہ کہیں اور سے سفلی کروا کر لائی ہے۔ اگر اس سلسلے میں ملنگ بابا کا ہاتھ ہوتا تو مجھے فوراً پتا چل جاتا۔ ملنگ بابا نے مجھے بتایا ہے کہ یہ اس سے بھی بڑے کسی عامل کامل کا کارنامہ ہے۔ جس کا توڑ کرتے ہوئے اس کی اپنی جان بھی جاسکتی ہے تاہم وہ اپنی سی پوری کوشش کررہا ہے۔''

مجھے عابدہ کی احمقانہ اور جاہلانہ سوچ پر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا لیکن میں نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے بجائے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''تم بار بار اس بات کو گول کر جاتی ہو جس کے سبب صدیقا نے تمہارے بیٹے کو زخمی کیا ہے اور تم رپورٹ لکھوانے یہاں آئی ہو؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی'' تھانے دار صاحب! آسیہ کے کالے کرتوتوں نے ہمارے گھر میں مصیبتیں نازل کردی ہیں۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ آج کل ہم ایک مسلسل اذیت سے گزر رہے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اس موضوع پر آگئی'' کل کہیں امتیاز نے آسیہ کے منہ پر سچی اور کھری بات کہہ دی تھی کہ وہ جادوگرنی ہے' اس نے کالے جادو کے زور پر ہمارے گھر کا سکون اور چین لوٹ لیا ہے۔ آسیہ نے گھر جا کر اپنے بیٹے صدیقا کو پتا نہیں کیا پھونکا وہ امتیاز کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور جیسے ہی امتیاز اس کے ہاتھ لگا' اس نے میرے بچے کو مارنا پیٹنا شروع کردیا۔ صدیقا طاقت ور اور عمر میں امتیاز سے بہت بڑا ہے۔ یہ بے چارہ مار کھاتا رہا اور سر پھڑوا کر گھر واپس آگیا۔''

اتنا کہہ کر وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے امتیاز حسین کی جانب بڑھی اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولی'' تھانے دار صاحب! میں آپ کو دکھاتی ہوں۔ اس ظالم صدیقا نے میرے بچے کے سر پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔''

پھر وہ جلدی سے امتیاز کی پٹی کھولنے لگی۔

جب پٹی پوری طرح کھل گئی تو اس نے بیٹے کو میری جانب دھیرے سے دھکیل دیا'' جا پتر ذرا تھانے دار صاحب کو اپنا سر تو دکھا۔''

میں نے امتیاز حسین کے سر کا بغور جائزہ لیا۔ واقعی اس کا سر ایک جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ زخم خاصا گہرا تھا تاہم اتنا بھی تشویش ناک نہیں تھا جتنی بڑی پٹی اس پر باندھی گئی تھی۔ شاید یہ واقعے میں شدت

پیدا کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

سر کا معائنہ کروانے کے بعد امتیاز اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ وہ پٹی والا کپڑا دوبارہ اس کے سر پر لپیٹتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

'' تھانے دار صاحب! اب تو آپ نے اپنی آنکھوں سے میرے بیٹے کا زخمی سر دیکھ لیا ہے نا۔ ہمارے ساتھ آپ کو انصاف کرنا ہی پڑے گا۔ ہم تو پہلے ہی مصیبت کا شکار ہیں' اوپر سے ہمارے ساتھ یہ سلوک بھی کیا جارہا ہے۔''

'' انصاف تو آپ لوگوں کو ضرور ملے گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا'' میں صدیقا کو تھانے بلوا کر بازپرس کروں گا۔ انشاءاللہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔''

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی'' آپ صدیقا کو بھی بلوائیں اور اس کی ماں کو بھی۔ یہ ساری آگ اسی تیرہ تالنی کی لگائی ہوئی ہے۔ اسے بھی تو پتا چلے' کالا جادو کروانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ تھانے دار صاحب! دونوں ماں بیٹے کو تھانے میں بند کر کے خوب چھترول کریں۔''

عابدہ کے لہجے میں' اپنی نند آسیہ کے لیے چھپی ہوئی نفرت کو میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی طریقے سے آسیہ کو ذلیل و رسوا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں نے اس کے جذبات کی طلب کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

'' دیکھو عابدہ! آسیہ کے بیٹے صدیق عرف صدیقا نے تمہارے بیٹے کے ساتھ مار پیٹ کی۔ میں صدیقا کو تھانے بلوا کر اس سلسلے میں پوچھ گچھ کروں گا لیکن جہاں تک آسیہ کو کسی قسم کی سزا دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں تمہیں مایوسی ہوگی۔''

وہ کیوں تھانے دار صاحب؟''

'' وہ اس لیے کہ مجھے وہ قصوروار نظر نہیں آتی۔''

'' سارے فساد کی جڑ تو وہی ہے تھانے دار صاحب۔'' عابدہ نے تیز لہجے میں کہا'' ایسی بدذات نے کالے جادو کے ذریعے میری بتول کو......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا'' جادو ٹونے والا معاملہ مار پیٹ سے الگ ہی رکھو تو بہتر ہے۔ اگر تم صدیقا والی مار پیٹ کے خلاف رپورٹ لکھوانا چاہتی ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

وہ قطعیت سے بولی ''تھانے دار صاحب! اس مار پیٹ کی نوبت بھی تو کسی وجہ ہی سے آئی ہے نا۔ آپ گندے عمل والے قصے کو نظر انداز کیوں کر رہے ہیں۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہئے' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا ''تم مجھے میرا کام سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔''

وہ مایوسی سے منہ لٹکا کر میری جانب دیکھنے لگی۔

میں چند لمحوں تک اس کے معاملات پر غور کرتا رہا پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا ''عابدہ خانم! اگر تم چاہتی ہو کہ میں صدیقا کو تھانے بلوا کر اس سے کچھ باز پرس کروں تو تم مجھے اس کے گھر کا پتا وغیرہ سمجھا دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ وہ انشاء اللہ آئندہ تمہارے بیٹے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔''

اس کے انداز سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ میری تجویز سے مطمئن نہیں ہوتی تھی' تاہم میرے حکم پر اس نے آسیہ بیگم کے گھر کا مکمل پتا مجھے نوٹ کروادیا۔ وہ مکان عابدہ کے مکان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ بس دونوں گھروں میں ایک گلی کا فاصلہ حائل تھا۔

وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں نے پوچھا ''عابدہ! تمہارا گھر والا تھانے کیوں نہیں آیا تمہارے ساتھ رپورٹ لکھوانے؟''

اس نے بُرا سا منہ بنایا اور جواب دیا ''اس کے تھانے نہ آنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک وجہ جھوٹی اور ایک سچی ہے بلکہ یوں سمجھیں کہ درحقیقت وجہ ایک ہی ہے۔ وہی جھوٹی بھی ہے وہی سچی بھی۔''

اس نے بڑے الجھاؤ والی بات کی تھی۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ''یہ جھوٹی اور سچی کا کیا قصہ ہے؟''

اس نے بتایا ''امتیاز کا باپ منظور حسین اپنے ہی گھر میں کریانہ کی دکان کرتا ہے۔ وہ اپنی کان داری چھوڑ کر تھانے نہیں آنا چاہتا تھا اس لیے مجھے بھیج دیا۔ یہ تو ہوئی جناب سچی وجہ...... اور یہی وجہ جھوٹی اس طرح ہے کہ دکان داری نہ چھوڑنے کی بات اس نے ایک بہانے' ایک آڑ کے طور پر کی ہے۔ دراصل وہ نہیں چاہتا کہ اپنے سگے بھانجے صدیق عرف صدیقا کے خلاف رپورٹ لکھوانے آتا۔ اب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے!''

پتا نہیں' وہ مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں تو صرف یہی سمجھ سکا تھا کہ وہ اپنی نند کے خلاف دل میں بہت غصہ رکھتی تھی اور ہر صورت میں اسے کوئی سزا دلوانے کی متمنی تھی۔ میں نے اس کا

دل رکھنے کی خاطر کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے' عابدہ خانم! میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں۔''

''مجھے امید ہے' پھر آپ میری مدد بھی کریں گے!'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔

میں نے کہا ''ضرور...... ضرور۔''

اس نے مطمئن انداز میں دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے کہا ''ذرا ٹھہر جاؤ عابدہ!''

وہ ٹھہر گئی اور مڑ کر میری طرف سوالیہ نظر سے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ''میں تمہارے ساتھ اپنے دو اہل کاروں کو بھی بھیج رہا ہوں جو صدیقا کو پکڑ کر میرے پاس لائیں گے۔ میں دیکھتا ہوں' وہ آخر ہے کیا چیز!''

میرے ان الفاظ نے عابدہ کچھ مزید مطمئن کر دیا۔ میں نے دو ہوشیار قسم کے کانسٹیبلز کو اپنے کمرے میں بلایا پھر ساری بات سمجھانے کے بعد انہیں عابدہ خانم کے ہمراہ روانہ کر دیا۔

☆☆☆

صدیق عرف صدیقا کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ عام سی شکل کا مالک تھا۔ صحت بھی نہ تو بہت اچھی اور نہ گئی گزری تھی۔ اس کے بارے میں مختصر الفاظ استعمال کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک عام سا انسان تھا۔ اس وقت صدیقا میرے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میرے بھیجے ہوئے کانسٹیبلز صرف ایک گھنٹے کے اندر اسے میرے پاس لئے آئے تھے۔ اس کے ساتھ اس کا باپ محمد علی بھی آیا تھا۔ محمد علی ایک چھوٹا زمیں دار تھا۔ صدیقا کاشت کاری میں باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔

میں نے مختصر ترین صورت میں محمد علی کو صدیقا کے خلاف درج شکایت سے آگاہ کیا۔ جواب میں اس نے ہر چیز کا قصور وار عابدہ خانم کو ٹھہرا دیا۔ اس کے خیال میں عابدہ ایک فتنہ پرور عورت تھی۔ جادو ٹونے والی بات کو اس نے خود پر شدید اور افسوس ناک الزام قرار دیا اور اس سلسلے میں بھی عابدہ کے رویے کی مذمت کی۔

اس صورتِ حال کے بعد میں براہِ راست صدیقا کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''صدیقا! سچ سچ بتاؤ' کل کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ تم نے کس بات پر امتیاز سے جھگڑا کیا اور اس کا سر پھاڑ ڈالا؟''

اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولا ''تھانے دار صاحب! ایک بات تو آپ یہ سمجھ لیں کہ امتیاز اور اس کی ماں اوّل درجے کے جھوٹے اور مکّار ہیں۔ میری ماں نے ان کا بال بھی بانکا نہیں کیا مگر مامی (ممانی) عابدہ خواہ مخواہ اس پر جادو ٹونے کا الزام لگاتی رہتی ہیں۔ کل صبح ماں کا، امتیاز اور عابدہ مامی سے آمنا سامنا ہوا تو امتیاز نے جادو وغیرہ کے حوالے سے ماں کو بہت سخت باتیں سنا دیں۔ اس موقع پر مامی عابدہ کو چاہیے تھا کہ وہ بیٹے کو سرزنش کرتی مگر اس نے منع کرنے کے بجائے امتیاز کی حوصلہ افزائی کی اور اس اخلاق سوز فعل میں وہ بیٹے کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔ وہاں ماں کی بہت سی جاننے والیاں بھی موجود تھیں چنانچہ ماں کو بہت خفت اٹھانا پڑی۔''

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''ماں نے یہ ساری روداد گھر آ کر سنائی۔ میں نے سنا تو مجھے بہت غصہ آیا۔ دنیا کا کوئی بھی بیٹا اپنی ماں کی بے عزتی یا رسوائی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ جیسے ہی امتیاز نظر آئے گا، میں اس سلسلے میں اس سے ضرور باز پرس کروں گا۔'' وہ اپنے بیان میں ذرا توقف کر کے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے وہ تصدیق کرنا چاہتا ہو کہ آیا میں اس کی بات کا یقین کر رہا ہوں یا نہیں۔

چند لمحات خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا ''تھانے دار صاحب! کل شام سے ذرا پہلے امتیاز مجھے دکھائی دیا تو میں نے اس سے صبح ہونے والے افسوس ناک واقعے کے بارے میں استفسار کیا۔ پہلے تو وہ صاف مکر گیا کہ اس نے ایسی کوئی خاص بات نہیں کی ہے مگر جب میں نے یہ کہا کہ میں ان عورتوں کو گواہی کے لیے اس کے سامنے لا سکتا ہوں جن کے سامنے اس نے میری ماں کو برا بھلا کہا تھا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گیا اور انتہائی ڈھٹائی سے بولا، ہاں میں نے وہ سب کہا تھا۔ تم جو بگاڑ سکتے ہو، بگاڑ لو۔ اس کی بدتمیزی اور دیدہ دلیری کو دیکھ کر میں غصے میں آ گیا اور اسے برا بھلا کہنے لگا۔ نتیجے میں وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ میرا ہاتھ اٹھ گیا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں یہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی تو میرا ایک دھکا لگنے سے وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے جا گرا اور اس کا سر ایک سخت شے سے جا ٹکرایا جس کے باعث اسے شدید چوٹ آئی......'' رک کر اس نے سانس درست کی اور سوالیہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اب آپ ہی بتائیں تھانے دار صاحب، اس صورت حال میں میرا قصور ہے؟ میری جگہ اور کوئی بھی ہوتا تو کم و بیش یہی کرتا۔ بے بنیاد اور جھوٹے الزامات......اور وہ بھی ماں جیسی ہستی کے خلاف سن کر تو کسی کا دماغ بھی گھوم سکتا ہے!''

صدیق عرف صدیقا کی بپتا سن کر میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس بیان کی روشنی میں عابدہ خانم کی دروغ گوئی جھلکتی تھی۔ عابدہ کی شکایت، صدیقا کی کہانی سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اس تناظر میں، میں نے صدیقا سے چند سوالات کیے۔

''تو کیا تم نے براہِ راست امتیاز حسین کا سر نہیں پھاڑا تھا؟''

عابدہ نے مجھے یہی بتایا تھا کہ صدیقا نے اس کے بیٹے کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ وہ میرے سوال کے جواب میں بولا ''نہیں جناب، میں نے اس پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک اتفاق کے تحت وہ نوک دار سخت چیز سے ٹکرایا تھا، یعنی اس کا سر ٹکر کے نتیجے میں زخمی ہوا تھا۔ خدانخواستہ، اس کو شدید زخمی کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

''اور یہ بھی بتاؤ کہ جب کل صبح امتیاز نے تمہاری ماں کے ساتھ بدکلامی کی تو اس وقت تمہاری ممانی عابدہ خانم بھی اس کے ساتھ تھی؟''

تھوڑی دیر پہلے صدیقا نے جو کہانی سنائی تھی اس سے واضح تھا کہ کل صبح امتیاز اور اس کی ماں ساتھ ساتھ تھے مگر میں پھر بھی اس کی تصدیق چاہتا تھا، کیوں کہ عابدہ نے اس سلسلے میں کھل کر بات نہیں کی تھی۔ اگر صدیقا راست گوئی سے کام لے رہا تھا تو پھر عابدہ قصوروار نظر آتی تھی کیوں کہ اس موقع پر عابدہ پر لازم تھا کہ وہ بیٹے کو بدگوئی اور بکواس سے روکتی۔

صدیقا نے حسب توقع جواب دیا۔ میں نے مزید چند سوالات کیے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ صدیقا اینڈ فیملی خاصے معقول لوگ تھے۔ صدیقا کے باپ محمد علی سے بھی تفصیلی بات ہوئی تاہم اس ساری گفتگو کے نتیجے میں، میں نے انہیں یہی ہدایت کی کہ وہ ہر قسم کے فساد سے دور رہیں اور خواہ مخواہ عابدہ خانم سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔

انہوں نے میرے مشوروں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو گئے۔

اس واقعے کے چند روز بعد عابدہ خانم ایک مرتبہ پھر میرے سامنے موجود تھی۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا اور پوچھا۔

''کیا ہوا عابدہ! کیا صدیقا نے پھر تمہارے بیٹے کی پٹائی کر دی؟''

''صدیقا کو گولی ماریں جی۔'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''میں تو اس کی ماں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ اس بدبخت نے ہمیں تباہ کرنے پر کمر کس لی ہے۔''

''ایسا کیا کر دیا آسیہ بیگم نے؟''

"وہی جادو کا چکر۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی "وہ تو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ میری بچی کی طبیعت بھی خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ پتا ہے آپ کو آج کیا ہوا!"

وہ بات کرتے ہوئے خود ہی اس طرف آ گئی جس طرف میں اسے لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے سوال کے جواب میں، میں نے پوچھ لیا "میں کچھ نہیں جانتا، تم بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا؟"

"ہاں، میں بتاتی ہوں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "آج صبح جب ہم سو کر اٹھے تو صحن میں چار مرغیوں کی کٹی ہوئی گردنیں یعنی سر پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے انہیں اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاروں کے چاروں سر کالی مرغیوں کے ہیں۔ میں نے منظور حسین سے کہا کہ وہ گھر کا خیال رکھے، میں تھانے آ کر آپ کو اطلاع دیتی ہوں۔"

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "اور تمہارا خیال ہے کہ مرغیوں کی وہ چار منڈیاں کسی جادو وغیرہ کے سلسلے کی کڑی ہیں جو آسیہ بیگم تمہاری بیٹی اور گھر پر کروا رہی ہے؟"

"یہ صرف میرا خیال نہیں بلکہ مجھے پکا یقین ہے تھانے دار صاحب۔" وہ پُر وثوق انداز میں بولی "یہ حرکت آسیہ کے سوا اور کسی کی ہو ہی نہیں سکتی۔"

میں نے پوچھا "تم نے اس بارے میں اپنے ملنگ کالیا کو تو بتایا ہوگا جو تمہاری بیٹی بتول کا علاج معالجہ بھی کر رہا ہے؟"

"ابھی ان سے بات نہیں ہوئی۔" وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولی "پہلے میں آپ کو اطلاع دینے آئی ہوں۔ یہاں سے سیدھی ملنگ کالیا کے آستانے پر جاؤں گی لیکن انہیں تو پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا۔ وہ بہت کرنی والے ہیں۔ انہوں نے مجھے اس بارے میں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔"

ملنگ کالیا کی پیش گوئی کے بارے میں سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "تمہارے اس ملنگ نے تمہیں کس سلسلے میں خبردار کیا تھا؟"

"انہوں نے کہا تھا۔" عابدہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "ایک مرغی کے بعد دو مرغیاں دو کے بعد چار مرغیاں......اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔"

"پھر اس سے تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟"

"یہی کہ آج کالی مرغیوں کے جو چار سر صحن میں پڑے پائے گئے ہیں وہ اسی جادوئی سلسلے کی کڑی ہیں جو آسیہ بیگم ہمارے خلاف کروا رہی ہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی "ملنگ کالیا بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کی باتوں میں پوشیدہ رمز تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔"

میں نے چڑ کر کہا "اگر وہ ملنگ کالیا کوئی اتنی ہی اونچی چیز ہے تو پھر وہ تمہارے مسائل کو حل کیوں نہیں کر دیتا۔ کیا اس کے پاس آسیہ کے کرائے ہوئے سفلی عمل کا کوئی توڑ نہیں ہے؟"

"وہ توڑ کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔" وہ اندھی عقیدت کے جذبات کو اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے بولی "بتول انہی کے علاج میں ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر ہم ان کی باتوں پر عمل کرتے رہے تو ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں اس قماش کے عاملین و کاملین سے خوب واقف تھا۔ وہ سادہ مزاج لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے ہیں۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ ملنگ کالیا بھی بتول کے علاج کے سلسلے میں اپنی جہالت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا اور اپنی روزی روٹی کے چکر میں کالے جادو کی کہانی گھڑ لی تھی۔ اس قسم کے جعل ساز مجبور اور مصیبت زدہ انسانوں کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے لیے "عیار نبّاض" کا ٹائٹل مناسب و موزوں لگتا ہے۔

ملنگ کالیا کو یقیناً یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ عابدہ خانم نے صدیقا کے رشتے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اسی بات کو بنیاد بنا کر انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہوگا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ ملنگ کالیا ہی نے عابدہ کے ذہن میں بٹھایا ہو کہ اس کی نند نے اس کی بیٹی بتول پر جادو ٹونا کروایا ہے۔

اس قصے کو ختم کرنے کے لیے میں نے عابدہ خانم سے پوچھا "اس سلسلے میں، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"جناب، سیدھی سی بات ہے۔ آپ اس فتنہ پھیلانے والی عورت کے خلاف سخت قسم کی کارروائی کریں۔ آسیہ بیگم نے سفلی عملیات کے ذریعے ہمارے گھر کا چین و سکون برباد کر ڈالا ہے۔ اس کے لیے کوئی دردناک سزا ہونا چاہیے۔"

بات ختم کر کے عابدہ پر توقع نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "دیکھو عابدہ! اگر تم یہ خیال کرتی ہو کہ جادو ٹونے کے حوالے سے میں تمہاری بات مانتے ہوئے آسیہ بیگم پر کوئی دباؤ ڈالوں گا تو اس خام خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو۔"

میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے اس کے چہرے پر اپنی بات کے ردِعمل کو تلاشا۔ وہاں مجھے ایسے اثرات نظر آئے جنہیں مایوس کن کہا جا سکتا تھا۔ میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے مزید کہا۔

"قانونی طور پر میں اس وقت تک کوئی سخت کارروائی نہیں کر سکتا جب تک مجھے دوسری پارٹی

کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہ ہو جائے۔ تم پہلے ایک دو مقامات پر غلط بیانی سے کام لے چکی ہو۔''
پھر میں نے اس دروغ گوئی کی نشان دہی کی اور کہا ''اس صورت حال میں، میں آسیہ بیگم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔''

وہ بولی ''ثبوت میں آپ کو فراہم کرتی ہوں۔ آپ ابھی میرے ساتھ گھر چلیں۔ چار کالی مرغیوں کی کٹی ہوئی وہ خون آلود گردنیں ابھی تک ہمارے گھر کے صحن میں پڑی ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے آسیہ کے کالے کرتوتوں کا ثبوت دیکھ لیں۔''

عابدہ کی پیش کش نے میرے ذہن میں ایک اہم نکتہ اجاگر کر دیا۔ میں نے سوچا، ممکن ہے، وہ ملنگ کالیا ہی اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہو...... یا کروا رہا ہو جس سے کالے جادو کا تاثر مضبوط تر ہوتا جا رہا تھا۔ کسی کے گھر کے صحن مین کوئی مرا ہوا چوہا یا مرغی کی کٹی ہوئی گردن پھینکنا ہرگز مشکل کام نہیں تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ عابدہ کا مکان کس لوکیشن اور پوزیشن میں تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں نے عابدہ سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

وہ خوش ہوگئی اور ممنونیت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے حوالدار جمعہ خان کو اپنے پاس بلا لیا اور اسے اپنے ساتھ عابدہ خانم کے گھر چلنے کو کہا۔ وہ فوراً تیار ہوگیا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہم تینوں تھانے سے نکل رہے تھے۔

عابدہ خانم کا گاؤں تھانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم دس پندرہ منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ عابدہ کا گھر گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا۔ وہ گاؤں سے الگ تھلگ تو نہیں تھا تاہم وہ گاؤں کا کنارہ تھا۔ اس کے بعد کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ چند کھیتوں کے بعد ریلوے لائن گزرتی تھی۔ یہ ریلوے لائن مین روٹ کی نہیں تھی اور بہت کم مصروف رہتی تھی۔ اسی لائن کے کنارے گاؤں کا قبرستان بھی آباد تھا۔

عابدہ خانم کا گھر ایسی جگہ پر واقع تھا کہ اس گھر کے صحن میں باہر سے کوئی بھی شے بہ آسانی پھینکی جا سکتی تھی۔ گھر کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی۔ صحن والے حصے کے دائیں بائیں والی دیواریں لگ بھگ پانچ فٹ بلند تھیں۔ وہ دس مرلے پر مشتمل ایک عام سا گھر تھا۔ عقبی حصے میں دو کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے جن کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا پھر صحن شروع ہو جاتا تھا۔ وہ خاصا کشادہ صحن تھا۔ گھر کے سامنے والے حصے میں بھی دو کمرے نظر آ رہے تھے۔ ایک قدرے چھوٹا اور دوسرا بڑا۔ بڑا کمرا بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جب کہ چھوٹے کمرے میں عابدہ کے شوہر منظور حسین نے

کریانے کی دکان کھول رکھی تھی۔ گھر کا داخلی دروازہ اسی دکان اور بیٹھک کے درمیان واقع تھا۔ جو لوگ مرلوں کا حساب نہیں جانتے وہ اس مکان کے رقبے کو لگ بھگ ڈھائی سو گز تصور کر لیں۔

گھر کے صحن کے عین وسط میں نیم کا ایک سایہ دار درخت استادہ تھا۔ صحن کی مشرقی دیوار کے ساتھ باورچی خانہ اور باتھ روم وغیرہ بنے ہوئے تھے جن کی چھتیں زیادہ اونچی نہیں تھیں تاہم وہ پانچ فٹی دیوار سے قدرے بلند تھیں۔

ہم گھر کے اندر پہنچ چکے تو عابدہ خانم ہمیں سیدھا اس مقام تک لے گئی جہاں اس کے بیان کے مطابق کٹی ہوئی سیاہ مرغیوں کے چار سر پڑے ہوئے تھے۔ یہ مقام نیم کے درخت سے تھوڑے سے فاصلے پر برآمدے کے نزدیک تھا۔ مذکورہ مقام کا مغربی دیوار سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں چونکہ پہلے سے شک موجود تھا اس لیے فوری طور پر یہی خیال آیا کہ مرغیوں کے کلغیوں والے وہ چار سر مغربی دیوار کے اوپر سے گھر کے صحن میں پھینکے گئے ہوں گے۔ اس دیوار سے آگے آبادی نہیں تھی اور لگ بھگ پانچ سو گز آگے جا کر گاؤں کا قبرستان شروع ہو جاتا تھا۔

عابدہ خانم ان چار سیاہ سروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہیجانی لہجے میں بولی ''دیکھ لیں تھانے دار صاحب! یہ سب جادوئی چکر نہیں تو اور کیا ہے؟''

عابدہ کا شوہر منظور حسین دکان چھوڑ کر گھر کے اندر آ گیا تھا۔ وہ مسکین صورت والا ایک عام سا شخص تھا۔ میں نے پہلی نظر ہی میں اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنی بیوی کا دبیل تھا۔ ایسے شوہر اپنی بیویوں کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ عرف عام میں اس قسم کے شوہروں کو زن مرید بھی کہا جاتا ہے۔

میں نے عابدہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے منظور حسین سے پوچھا ''منظور حسین تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟''

''کس سلسلے میں جی؟'' وہ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''منظور! تمہاری بیوی عابدہ کا دعویٰ ہے کہ تمہاری بہن آسیہ بیگم نے اس گھر پر کوئی سفلی عمل کروایا ہے۔ کبھی تمہارے صحن میں مردہ چوہے پڑے ملتے ہیں اور کبھی کٹی ہوئی مرغیاں؟''

''بس جی، کیا بتاؤں۔'' وہ بے وقوفانہ انداز میں بولا ''میں تو بہت پریشان ہوں۔ بتول کی حالت بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ بگڑتی جا رہی ہے حالانکہ اس کا باقاعدہ علاج بھی کروا رہے ہیں۔ پتا نہیں، کس بدبخت کی نظر ہمارے گھر کو کھا گئی ہے۔''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اپنا دکھڑا رو ڈالا تھا۔ میں نے سوچا' ممکن ہے وہ اپنی بہن آسیہ کے حوالے سے جادو ٹونے پر بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ میں نے اس معاملے میں اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور بتول کے حوالے سے سوال کیا۔

''تم اپنی بیمار بیٹی بتول کا علاج کس سے کروا رہے ہو؟''

عابدہ مجھے بتا چکی تھی کہ ملنگ کالیا ہی اس کی بیٹی کا علاج کر رہا تھا تاہم میں بتول کے باپ سے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ممکن تھا' اس گتھی کا کوئی سرا میرے ہاتھ آ جاتا۔

منظور حسین نے جواب دیا' ''بتول کا علاج ملنگ بابا کر رہے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے' ملنگ کالیا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا' ''یہ انکشاف یا تحقیق بھی ملنگ کالیا ہی کی ہے نا کہ اس گھر پر بہت سخت قسم کا جادو کیا گیا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا ''ملنگ صاحب کا دعویٰ ہے کہ جادو کروانے والی ہستی کوئی اور نہیں بلکہ آپ کی بہن آسیہ بیگم ہے؟''

وہ متامل لہجے میں بولا ''تھانے دار صاحب! میں کسی کو الزام دے کر اپنا ایمان خراب نہیں کرنا چاہتا مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارا گھر کسی مصیبت کی پکڑ میں ہے۔''

''تم کیوں نام لو گے اپنی بہن کا۔'' عابدہ چمک کر بولی۔ ''بھائی ہونے کے ناتے کچھ تو پردہ رکھو گے نا۔'' پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ''تھانے دار صاحب! میں آپ کو بتاتی ہوں' یہ سارا کھٹ راگ اسی نامراد نے پھیلایا ہے۔ آپ آسیہ کے خلاف کوئی مناسب کارروائی ضرور کریں۔''

''کروں گا......ضرور کروں گا۔'' میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا ''تم دیکھتی تو جاؤ' میں کس کے خلاف کیا کرتا ہوں۔ بس ذرا میں پہلے اپنی تسلی کر لوں پھر کوئی عملی قدم اٹھاتا ہوں۔''

اس کے بعد میں نے گھوم پھر کر اس گھر کا تفصیلی جائزہ لیا اور پھر منظور حسین کے ساتھ اس کی بیٹھک میں آ گیا۔ دراصل میں عابدہ کی غیر موجودگی میں اس سے چند سوال جواب کرنا چاہتا تھا۔ عابدہ اس دوران میں گھر کے اندر مصروف ہو گئی تھی۔

منظور حسین کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ اس کی تین اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی بتول لگ بھگ بیس سال کی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بیٹے تھے۔ امتیاز حسین پندرہ سال کا اور سب سے چھوٹا سرفراز حسین آٹھ سال کا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا پھر اصل موضوع کی طرف

آ گیا۔

''منظور حسین!'' میں نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا ''مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تمہاری بیٹی بتول کے لیے صدیقا کا رشتہ آیا تھا جو تم لوگوں نے مسترد کر دیا تھا۔''

''ہاں' کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری بیوی کا خیال ہے' اسی انکار کے بعد آسیہ بیگم نے دشمنی میں تمہاری بیٹی اور گھر پر جادو کروادیا ہے۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ''تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا' ''عابدہ کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سہمی ہوئی نظر سے بیٹھک کے دروازے کو دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں عابدہ اپنے بارے میں اس کے خیالات سے آگاہ نہ ہو جائے۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے کہا ''میں اس سلسلے میں بہن آسیہ کو قصور وار نہیں سمجھتا۔ وہ اس قسم کی نیچ حرکت نہیں کر سکتی۔ عابدہ ''نند بھابی'' کی روایتی کشیدگی کے باعث ایسا سوچتی ہے ورنہ آسیہ' بتول کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ ہاں' ایک بات میں ضرور کہوں گا۔'' اس نے ذرا توقف کر کے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''یہ تو میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے گھر پر کسی نے کوئی سفلی عمل ضرور کروایا ہے۔''

''تم یہ کس بنا پر محسوس کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا ''مردہ چوہے' کٹی ہوئی مرغیاں اور کالی بلی کی ''لاش'' کو دیکھ کر تم ایسا نہیں سوچ رہے؟''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا ''یہ بات بھی ہے اور اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔''

''اس کے علاوہ کیا ہے؟''

''بتول کی سمجھ میں نہ آنے والی بیماری۔'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''تم نے اپنی بیٹی کو کسی سیانے اور تجربہ کار معالج کو دکھایا ہوتا تو شاید اس کی بیماری سمجھ میں بھی آ جاتی۔''

وہ بولا ''ملنگ بابا کافی سیانے آدمی ہیں۔ ان کا علاج باقاعدگی سے جاری ہے۔ ہم بابا کی دی ہوئی دوا پابندی سے بتول کو پلا رہے ہیں۔''

مجھے اس کی سادگی آمیز جہالت پر غصہ تو بہت آیا تاہم میں نے ڈانٹ ڈپٹ کے بجائے قدرے سخت لہجے میں پوچھا ''تم نے اپنی بیٹی کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم سے کیوں نہیں کروایا؟''

''یہ عابدہ ہی کی ضد تھی۔'' وہ جھنجھلاہٹ آمیز انداز میں بولا ''اس کا خیال تھا کہ ملنگ بابا ہر قسم

کے علم کے ماہر ہیں۔ وہ جادو کا توڑ بھی کریں گے اور بتول کا علاج بھی کریں گے۔''

''مگر ملنگ کالیا کے علاج کا ابھی تک کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''اس کے باوجود بھی تم لوگ اسی پر تکیہ کیے بیٹھے ہو!''

وہ بڑے وثوق سے بولا ''انہوں نے یقین دلایا ہے کہ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے پوچھا ''ملنگ بابا کا ٹھکانا کس طرف ہے؟''

''قبرستان کے نزدیک۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں ملنگ کالیا سے بھی ملوں گا۔'' میں نے کہا ''ذرا معلوم تو ہو وہ کس مرض کا علاج کر رہا ہے۔ اس سے ملاقات کے بعد ہی حقیقتِ حال کا علم ہو سکے گا۔''

منظور حسین نے نہ تو اس ارادے کو سراہا اور نہ ہی مجھے اس خیال سے باز رہنے کو کہا۔ وہ ایک بے وقوف قسم کا مرد تھا۔ عابدہ نے اسے اس قدر دبا کر رکھا ہوا تھا کہ بعض اوقات تو وہ حواس باختہ دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا ''منظور! سچ سچ بتاؤ' تم لوگوں نے صدیقا کا رشتہ کیوں ٹھکرایا تھا۔ تمہاری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ صدیقا کسی بھی طور بتول کے جوڑ کا نہیں تھا اس لیے اس رشتے سے انکار کیا گیا تھا جب کہ میں صدیقا سے بھی ایک ملاقات کر چکا ہوں۔ وہ قبول صورت اور معقول لڑکا ہے۔''

''آپ کا خیال بالکل درست ہے تھانے دار صاحب!'' وہ تائیدی لہجے اور نیچی آواز میں بولا ''صدیقا بہت اچھا لڑکا ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرا بھانجا لگتا ہے بلکہ درحقیقت وہ معقول لڑکا ہے۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''اس کے باوجود بھی تم لوگوں نے اس کے رشتے سے انکار کر دیا؟''

''بس جی' کیا بتاؤں۔'' وہ اداسی سے بولا ''میری طرف سے تو انکار نہیں تھا لیکن عابدہ نہیں مانی۔''

''اور تم نے اپنی بیوی کے سامنے ہتھیار پھینک دیے!''

وہ شرمندہ سی صورت بنا کر بولا ''کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔''

میں نے اس کی بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے گفتگو کا زاویہ تھوڑا سا بدل دیا اور استفسار کیا

''عابدہ کے آمادہ نہ ہونے کی وجہ کہیں یہ تو نہیں تھی کہ وہ بتول کی شادی کہیں اور کرنا چاہتی ہے؟''

''ہاں' کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' وہ مبہم انداز میں بولا۔

''وہ اپنی بیٹی کو کہاں بیاہنے کی خواہاں ہے؟''

''اس نے کھل کر تو کچھ نہیں بتایا۔'' منظور نے جواب دیا ''لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنی بہن شکیلہ کے بیٹے طارق سے بتول کی شادی کرنا چاہتی ہے۔''

میرے ذہن میں ایک اور نکتہ روشن ہو گیا۔ بتول کے حوالے سے ایک اور فریق سامنے آیا تھا۔ جادوئی واقعات کے ذیل میں طارق اور اس کے گھر والوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے منظور حسین سے سوال کیا ''عابدہ کی بہن شکیلہ کی رہائش کہاں ہے؟''

''وہ بھی اسی پنڈ (گاؤں) میں رہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''طارق کام کیا کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے کپڑے کی دکان ہے۔''

''اسی گاؤں میں؟''

''نہیں'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا ''شروع شروع میں تو اس کی دکان یہیں پر تھی مگر اب وہ اپنے کاروبار کو قصبے کے بڑے بازار میں لے گیا ہے۔ وہاں اس کی دکان زیادہ چلنے لگی ہے اور ظاہر ہے' آمدنی بھی زیادہ ہو رہی ہے۔''

میں نے منظور حسین سے شکیلہ کے گھر کا پتا بھی سمجھ لیا اور قصبے کے مین بازار میں طارق کی دکان کے بارے میں بھی معلوم کر لیا۔ اسی کی زبانی پتا چلا کہ طارق روزانہ رات کو گھر آتا ہے اور صبح قصبے والی دکان پر جاتا ہے۔

مزید کچھ وقت وہاں گزارنے کے بعد میں اس گھر سے نکل آیا۔ میں نے رخصت ہونے سے پہلے انہیں تسلی دی تھی کہ جس حد تک بھی ممکن ہو سکا' میں ان کی مدد ضرور کروں گا۔ میرے کہنے پر انہوں نے مرغیوں کی وہ کٹی ہوئی چار گردنیں صحن سے اٹھا کر باہر پھینک دی تھیں۔

واپسی کے سفر میں حوالدار جمعہ خان نے پوچھا ''ملک صاحب! اب کس طرف چلنا ہے؟''

میں نے مزاح کے رنگ میں کہا ''تمہارے پاس کون کون سی 'طرفیں' ہیں؟''

وہ بولا ''فی الحال تو جناب تین طرفیں ہیں۔ آسیہ بیگم کا گھر' شکیلہ کا گھر اور ملنگ کالیا کا ٹھکانا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''مگر بات یہ ہے جمعہ خان

کہ ہم یہاں سے سیدھے تھانے جائیں گے۔ عابدہ خانم اور منظور حسین کو جس قسم کی صورتِ حال درپیش ہے اس کے پیچھے کوئی مکار اور عیار ذہن کام کر رہا ہے۔ مجھے تو اس میں کسی جادوٹونے کا ہاتھ نظر نہیں آتا۔ اگر ہم اس متذکرہ شخص کو کھوج لیں تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوسکتا ہے۔ پھر کسی بھی پارٹی سے ملاقات کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"اور وہ عیار اور مکار شخص کون ہوسکتا ہے؟" حوالدار نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا "ہم اس تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟"

اس کے سوالات بہت اہم تھے۔ میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "جمعہ خان! اب تک جو حالات میرے سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر اس سارے معاملے میں مجھے ملنگ کالیا کا غالب ہاتھ نظر آ رہا ہے لیکن اسے براہ راست چھیڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ ایسے پیشہ ور لوگ بعض اوقات بہت خطرناک بھی ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ ان کے مرید اور مریض ان پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ وہ ان کے خلاف کچھ سننے اور ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ اندھی عقیدت بسا اوقات بڑے مسائل کھڑے کر دیتی ہے۔"

"پھر تفتیش کی گاڑی کیسے آگے بڑھے گی ملک صاحب! حوالدار نے پوچھا۔

میں نے کہا "دیکھو جمعہ خان! اگر ہم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوجائیں کہ یہ مرغیاں کہاں سے آ رہی ہیں جو عابدہ کے صحن میں پائی جا رہی ہیں تو شاید کچھ مفید اور کارآمد معلومات حاصل ہو جائیں۔"

شہروں میں جس طرح مرغیوں کی دکانیں ہوتی ہیں جہاں مرغی کا گوشت یا زندہ مرغی فروخت ہوتی ہے اس طرح کی کوئی کہانی گاؤں دیہات میں نہیں ہوتی۔ وہاں تقریباً ہر گھر میں مرغیاں پالی جاتی ہیں تا کہ مرغی کا گوشت اور انڈے گھر کے ہوجائیں۔ جن اکاّ دکاّ گھروں میں مرغیاں نہیں بھی ہوتیں وہ لوگ اناج کے بدلے دوسروں سے مرغی اور انڈے حاصل کر لیتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات سن کر حیرت ہوگی کہ گاؤں دیہات میں ضروریات زندگی کی بہت سی اشیاء اناج کے بدلے حاصل ہوجاتی ہیں۔ روپیا پیسا ابھی وہ اہمیت حاصل نہیں کرسکا جو حال شہر میں دیکھنے میں آتا ہے۔

اس تناظر میں یہ سوچا جاسکتا تھا کہ اگر عابدہ خانم کے گھر کے صحن میں کٹی ہوئی مرغیاں دستیاب ہو رہی تھیں تو وہ کہیں نہ کہیں سے تو حاصل کی جا رہی تھیں اور ظاہر ہے...... وہ یا تو خریدی جا رہی ہوں گی یا پھر چوری کی جا رہی ہوں گی۔

جمعہ خان نے مجھ سے سوال کیا "ملک صاحب! ان مرغیوں کی "آمد" کے بارے میں جاننے کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے۔

"فی الحال تو کوئی آئیڈیا نہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "تھانے چل کر اس سلسلے میں کچھ سوچتے ہیں۔"

"اگر آپ یہ معاملہ میرے حوالے کردیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں' کوئی مثبت حل آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔" حوالدار جوشیلے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے جمعہ خان! میں تمہیں اپنی صلاحتیں آزمانے کا پورا موقع دوں گا۔ تم اپنے طور پر کوئی لائحہ عمل تیار کر کے اس منصوبے پر کام شروع کردو۔"

وہ خوش ہوگیا۔ اس کے دل کی مراد بر آئی تھی۔

آج کل تھانوں میں اچھا خاصا اسٹاف دیکھنے میں آتا ہے اور شہری حدود کے تھانوں میں تو خاصی بھاری نفری موجود ہوتی ہے مگر ہمارے زمانے میں تو یہ تعداد کافی کم ہوتی تھی اور وہ بھی گاؤں دیہات کے تھانوں میں! وہاں تو صورت حال کچھ زیادہ ہی خراب ہوتی تھی چنانچہ تھانے میں موجود ہر اہل کار ہر کام کرنے کے لیے ہروقت تیار رہتا تھا۔ یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ کون سا کام حوالدار کے کرنے کا ہے اور کون سا اے ایس آئی یا ایس آئی کے کرنے کا۔ عملے کا ہر فرد اپنا فرض سمجھ کر پوری ذمے داری سے تعاون کے لیے ہروقت تیار رہتا تھا۔

ہم جب تھانے پہنچے تو شام ہونے والی تھی۔

☆☆☆

عابدہ خانم ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چہرے سے خاصی پریشان اور حواس باختہ نظر آتی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا "اب نیا کیا ہوگا ہے؟"

"آپ نے اب تک میری کسی بات کا یقین نہیں کیا تھانے دار صاحب۔" وہ شکایت بھرے لہجے میں بولی "مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اگر آپ نے آسیہ بیگم کو نہ روکا تو سب کچھ تباہ ہو کر رہ جائے گا۔"

میں نے پوچھا "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا کوئی نئی صورت حال پیش آ گئی ہے؟"

"کچھ نہ پوچھیں جی۔" وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی "آج ہمارے گھر کے صحن میں نیم کے

درخت کے پس ایک مردہ کتا پڑا ہوا ملا ہے...... اور وہ بھی کالے رنگ کا۔ رات سے بتول کی طبیعت بھی بہت خراب ہے۔ آپ جلد از جلد آسیہ کی سرگرمیوں کو روکیں ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے۔''

وہ جو سلسلہ چل نکلا تھا اس کا تعلق جادو ٹونا سے ہو یا نہ ہو تاہم یہ بات تو یقینی تھی کہ عابدہ خانم ایک مشکل اور افسوس ناک صورت حال سے دوچار تھی۔ رہ رہ کر میرے ذہن میں ملنگ کالیا کا نام ابھر رہا تھا۔ مجھے نوے فیصد امید تھی کہ اس جادوئی چکر کے عقب میں ملنگ کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔

میں نے عابدہ کو تسلی دیتے ہوئے کہا ''تم یہ بات ذہن سے نکال دو کہ میں نے تمہارے مسائل کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ یقین کرو' میں نے اپنے عملے کے کچھ افراد کو اس سلسلے میں اہم فرائض سونپ رکھے ہیں۔ انشاء اللہ' بہت جلد ہی کوئی بہتر صورت حال سامنے آ جائے گی۔''

''کب؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا ''جب بتول اپنی جان سے ہار جائے گی؟''

اس کی آواز میں چھپی بے بسی کو میں بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ملنگ کالیا کے حوالے سے پوزیشن واضح کرنے کی خاطر پوچھا ''بتول تو ملنگ کالیا کے زیر علاج ہے۔ وہ عملیات و سفلیات وغیرہ کا بھی ماہر ہے۔ وہ بے چاری جان کیوں ہارے گی؟''

''میں تو اب ملنگ بابا کی طرف سے مایوس ہوتی جا رہی ہوں۔'' وہ درد بھرے لہجے میں بولی ''وہ علاج تو کر رہے ہیں مگر کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا۔ جادو ٹونے کا توڑ بھی خاطر خواہ نہیں ہو سکا۔ البتہ ملنگ جی کی پیش گوئیاں ضرور پوری ہو رہی ہیں۔''

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ''مثلاً کس قسم کی پیش گوئیاں؟''

''انہوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بہت سخت قسم کا گندا عمل کیا گیا ہے۔'' عابدہ نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''اس نوعیت کے سفلی عمل میں آغاز...... مردہ چوہے سے ہوتا ہے پھر مرغی' بلی اور کتے وغیرہ کی باری آتی ہے...... اور سب سے آخر میں انسان۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے اس کے ادھورے بیان کو مکمل کرتے ہوئے کہا ''یہ سلسلہ مردہ کتے تک تو پہنچ چکا ہے۔ اگلا مرحلہ مردہ انسان کا ہوگا!''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولی' خوف زدہ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دینے لگی۔ میں دل ہی دل میں ملنگ کالیا کی عیاری پر اَش اَش کر اٹھا۔ وہ خبیث انسان بڑی مہارت سے ان لوگوں کو الو بنا رہا تھا۔ اس کی پیش گوئیوں کا ذکر سن کر میرا یہ یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ ''اس کھیل'' میں ملنگ کالیا کا غالب ہاتھ تھا!

ایسا سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اہم سوال ابھرا۔ اگر ملنگ کالیا دیدہ و دانستہ یہ سب کچھ کر رہا تھا تو اس کے پس پردہ اس کا کون سا مفاد پوشیدہ تھا! یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ محض تفریحاً یہ کھیل کھیل رہا ہو۔ اس نکتے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے میں نے عابدہ سے پوچھا۔

''عابدہ! یہ بات تو صاف ظاہر ہے' ملنگ کالیا' تمہاری بیٹی بتول کا علاج مفت میں نہیں کر رہا ہوگا!''

وہ سنجیدگی سے بولی ''تھانے دار صاحب! مفت میں کون کسی کے کام آتا ہے۔''

میں نے پوچھا ''ملنگ کالیا علاج کے سلسلے میں اب تک تم لوگوں سے کتنی رقم وصول کر چکا ہے؟

''گاہے بہ گاہے وہ جتنے پیسے بھی مانگتا ہے' ہمیں دینا پڑتے ہیں۔'' عابدہ نے تامل کرتے ہوئے بتایا ''منظور کی دکان ٹھیک ٹھاک چلتی ہے اس لیے ہمیں زیادہ پریشانی نہیں اٹھانا پڑتی اگر آمدنی کا یہ سہارا نہ ہوتا تو خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا!''

''حشر تو تم لوگوں کا اب بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں ہو رہا'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ملنگ کالیا کچھ نہ کر کے بھی خوب کما رہا ہے اور...... تم لوگ اس کے ہاتھوں بے وقوف بن رہے ہو۔''

وہ بے بسی سے بولی ''کیا کریں جی' معاملہ ہی ایسا ہے۔ اس قسم کے گندے عمل کا توڑ کوئی عامل کامل ہی کر سکتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ملنگ کالیا کے سوا کوئی دوسرا سیانا ہے بھی تو نہیں!''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''دیکھو عابدہ خانم! تمہارے حالات سے آگاہ ہو کر میں اپنے دل میں تمہارے لیے ہمدردی محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم سنجیدگی سے میری بات ماننا چاہو تو میں اس سلسلے میں تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکتا ہوں۔''

وہ ہمہ تن گوش ہو کر امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ایک بات ذہن میں بٹھا لو کہ تم لوگوں کے ساتھ جو بھی واقعات پیش آ رہے ہیں ان کا جادو یا ٹونے وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ عین ممکن ہے' ان جادوئی واقعات کے پیچھے ملنگ کالیا ہی کا ذہن کارفرما ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ملنگ کالیا کے چنگل سے نکل کر بتول کا علاج کسی حکیم یا ڈاکٹر سے کرواؤ۔''

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں موجود تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری بات سنجیدگی سے نہیں لے رہی تھی اور اس کا ذہن اب بھی جادو ٹونے کے بارے میں ہی

سوچ رہا تھا۔ میں نے اسے متذبذب دیکھا تو واضح الفاظ میں کہا۔

''عابدہ! اگر تم اس طرح جاہلانہ سوچ کو ذہن میں بسائے بیٹھی رہیں تو کوئی بھی تمہارے یا تمہاری بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ ملنگ کالیا اسی طرح تمہیں بے وقوف بنا کر رقمیں اینٹھتا رہے گا۔ پولیس اس وقت تک کسی شخص پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی جب تک مذکورہ شخص کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اور میرے عملے کے تجربہ کار افراد یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مردہ چوہے، بلیاں اور مرغیاں، کتے کیوں اور کہاں سے تمہارے گھر کے صحن میں آ رہے ہیں انشاء اللہ بہت جلد اس گتھی کا کوئی سرا ہاتھ آ جائے گا البتہ ملنگ کالیا سے چھٹکارا پانے کے لیے جب تک تم میرے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہیں ہو گی، بات بن نہیں سکے گی۔ جب تک تم لوگ اسے سچا عامل کامل اور معالج سمجھتے رہو گے، میں اس کے خلاف کوئی سخت عملی قدم نہیں اٹھا سکوں گا۔''

وہ پوری بات سننے کے بعد بولی ''عملی قدم اٹھانے کی ضرورت تو آسیہ بیگم کے خلاف ہے۔ ہم پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اس کے پیچھے آسیہ کا ہاتھ ہے۔ ملنگ بابا تو بتول کا علاج کر رہے ہیں اور ان کی پوری کوشش ہے کہ وہ اس گھر یعنی ہمارے گھر کو جادوئی اثرات سے پاک کر دیں۔''

میں خیال ہی خیال میں سر پیٹ کر رہ گیا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے...... علم کی کوئی نہ کوئی حد ضرور ہوتی ہے مگر جہالت کی کوئی حد ہوتی ہے نہ ٹھکانا۔ کوئی بھی شخص بے حد و بے حساب، بے شمار و بے انداز جاہل ہو سکتا ہے۔ میرے سامنے بیٹھی عابدہ خانم اس کی ایک زندہ مثال تھی۔ اس کے ریکارڈ کی سوئی ایک مخصوص مقام پر اٹک گئی تھی۔ میں اس کی حالت پر افسوس کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا!

میں نے افسوس ناک انداز میں اسے دیکھا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ میں جلد از جلد تمہارے مسئلے کا کوئی حل نکالتا ہوں۔''

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے حوالدار جمعہ خان کو اپنے پاس بلایا اور اس کی کوششوں کی رپورٹ مانگی۔ وہ چہرے سے خاصا پُر جوش نظر آ رہا تھا پھر جب وہ بولا تو اس کے جوش کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ جمعہ خان نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''ملک صاحب! میں نے ایک نہایت اہم آدمی کا سراغ لگایا ہے۔''

''کون ہے وہ اہم آدمی؟''

''اس کا نام تو خوشی محمد ہے۔'' جمعہ خان نے بتایا ''مگر ''خوشیا'' مشہور ہے۔''

''یہ خوشیا اہم کس حوالے سے ہے؟''

''اس کی وجہ شہرت اس کا کُکڑی چوڑ ہونا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے، مرغی چور؟''

''بالکل یہی مطلب ہے ملک صاحب۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

''یہ شخص کہاں کا رہنے والا ہے۔'' میں نے پوچھا ''اور اس نے کس کس کی مرغیاں چرائی ہیں؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوری دلچسپی سے حوالدار کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس نے جواب دیا ''خوشیا نامی یہ کُکڑی چور اسی گاؤں میں رہتا ہے جہاں عابدہ خانم اور آسیہ بیگم کے گھر ہیں۔ اس نے اسی گاؤں کے مختلف گھروں سے مرغیاں پار کی ہیں یا یوں سمجھ لیں کہ گھر کے باہر سے وہ مرغیاں اڑائی ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں کافی لوگوں کو ٹٹولا ہے اور مجھے پتا چلا ہے کہ گاہے بہ گاہے ان کی مرغیاں غائب ہوتی رہی ہیں۔''

''کیا تم نے اس سلسلے میں خوشیا سے بات کی ہے؟''

''ابھی میں نے خوشیا کو ٹچ نہیں کیا ملک صاحب۔''

''پھر تمہیں کیسے یقین ہے کہ وہ مرغیاں خوشیا ہی نے چرائی ہوں گی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا ''میں نے اپنے طور پر کچھ تحقیق کی ہے۔ گاؤں میں خوشیا کی شہرت ایک چور کی سی ہے خصوصاً لوگوں کی مرغیاں چراتے ہوئے تو وہ کئی مرتبہ دیکھا گیا ہے جبھی تو وہ گاؤں میں کُکڑی چور مشہور ہو گیا ہے۔'' حوالدار نے چند لمحوں کا توقف کر کے میری جانب دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! اگر ہم خوشیا کو تھانے بلا کر تھوڑی سی سختی کریں تو وہ سب کچھ صاف صاف بک دے گا۔ ہمیں عابدہ خانم والے معاملے میں کسی اور شخص کی تلاش ہے جو اپنے پاس مفت کی بہت سی مرغیاں رکھتا ہو۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے!''

''میں تمہارا ہم خیال ہوں جمعہ خان۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''تم پہلی فرصت میں خوشیا کو پکڑ کر تھانے لے آؤ۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' جمعہ خان ولولہ انگیز لہجے میں بولا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''میں ایک گھنٹے کے اندر خوشی محمد عرف خوشیا کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

پھر اپنے وعدے کے مطابق جمعہ خان نے واقعی ایک گھنٹے کے اندر خوشیا کو میرے سامنے لا کر حاضر کیا۔ میں سمجھ رہا تھا' خوشیا پکی عمر کا کوئی شخص ہوگا مگر وہ میری توقع کے برخلاف ثابت ہوا۔ اس کی عمر چودہ پندرہ سال سے ہرگز زیادہ نہیں تھی۔ وہ نوجوان' دبلا پتلا اور دراز قامت تھا۔ حلیے کے اعتبار سے وہ آوارہ نظر آتا تھا۔ میں چند لمحوں تک تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیتا رہا پھر گرج دار آواز میں اس سے سوال کیا۔

''خوشیا! جانتے ہو' تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا'' جناب! اصلی بات تو آپ کو ہی معلوم ہوگی مگر میں محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے چوری وغیرہ کے سلسلے میں تھانے لایا گیا ہے۔''

''تمہارے احساسات بالکل درست ہیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا'' مجھے امید ہے' تم نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ تمہیں کس قسم کی چوری کے ضمن میں پکڑا گیا ہے؟''

''میرا خیال ہے' ککڑیاں چرانے کے سلسلے میں'' اس نے جواب دیا۔

''تم خاصے ذہین بندے ہو۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا'' اور میں توقع کر رہا ہوں' تم سے جو کچھ بھی پوچھا جائے گا تم اس کا درست اور سیدھا جواب دو گے!''

''جی ضرور...... تھانے دار صاحب!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

حوالدار نے اس موقع پر کہا'' اگر تم نے ہمیں چکر دینے کی کوشش کی یا کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا تو یاد رکھنا' ہمارے پاس ٹیڑھے لوگوں کو سیدھا کرنے کے ایک سو ایک گر ہیں۔ ہم نہیں چاہتے' تم اس کم عمری میں کسی اذیت ناک مرحلے سے گزرو لہٰذا تمہارے لیے یہی مناسب ہوگا کہ جو پوچھا جائے' سچ سچ بتا دو۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا'' میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ پوچھیں' جو پوچھنا چاہتے ہیں؟''

میں نے پوچھا'' خوشیا! پچھلے ایک دو ماہ میں گاؤں کے مختلف لوگوں کی مرغیاں چوری ہوئی ہیں خصوصاً کالی مرغیاں...... اور ہمیں شک ہے' یہ کارروائی تم نے ہی کی ہے۔ کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟''

وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا'' یہ کام تو میں کرتا ہی رہتا ہوں۔''

''تم یہ غلط کام کیوں کرتے ہو؟''

وہ سادگی سے بولا'' یہ میری روزی روٹی کا ذریعہ ہے۔ چوری شدہ مرغیاں میں دوسرے گاؤں

میں جا کر فروخت کر دیتا ہوں۔ اس طرح کچھ آمدن ہو جاتی ہے۔''

میں نے اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ چوری چکاری جیسا غلط کام کیوں کرتا ہے اس کے بجائے وہ کوئی ڈھنگ کا نیک اور صالح کام کیوں نہیں کرتا۔ یہ میرا مقصد بھی نہیں تھا اور نہ ہی حالات کا تقاضا۔ میں نہایت احتیاط کے ساتھ خوشیا کی زبان سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوانا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی ایسا سوال نہ کروں جس سے وہ بدک جائے۔

میں نے پوچھا'' کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چوری شدہ مرغیاں تم دوسرے گاؤں کے بجائے اپنے ہی گاؤں کے کسی فرد کے ہاتھ فروخت کر دو؟''

''عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔'' اس نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے' خاص طور پر ایسا ہو سکتا ہے؟''

''ج...... جی۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں اسے آہستہ آہستہ گھس رہا تھا۔ میں نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے خوشیا سے پوچھا'' کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تم کس طریقے سے مرغیاں پکڑتے ہو۔ مجھے یقین ہے' وہ کوئی عام سا طریقہ تو نہیں ہوگا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تصدیقی انداز میں بولا'' عام طریقے سے مرغی قابو کرنے میں یہ خطرہ بہرحال موجود ہوتا ہے کہ مرغی شدید مزاحمت کے طور پر کُڑکڑانا شروع کر دے۔ اس طرح دوسرے لوگ اس طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔''

اس کے بعد خوشیا نے مرغیاں پکڑنے کے دو کامیاب طریقے بیان کیے۔ پہلا طریقہ سادہ اور آسان تھا۔ کوئی گیلا تولیا اچانک مرغی پر ڈال دیا جائے اس طرح بوکھلاہٹ میں وقتی طور پر مرغی سانس لینا بھول جاتی ہے۔ متوحش حالت میں اس مرغی کو آسانی سے قابو کر لیا جاتا ہے۔

دوسرا طریقہ قدرے پیچیدہ اور مشکل تھا مگر یہ زیادہ فائدہ مند ہے۔ اس طریقے کے مطابق چھوٹے سائز کی ایک کوڑی میں دھاگا پھنسا کر اس کو پھندے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ کوڑی کو گندھے ہوئے آٹے میں لپیٹ لیا جاتا ہے اور جس مقام پر مختلف مرغیاں دانہ دُنکا چگ رہی ہوں وہاں کوڑی کو پھینک دیا جاتا ہے اور دھاگے کے دوسرے سرے کو مضبوطی سے تھام کر تھوڑے فاصلے پر کھڑے ہو کر نگرانی کی جاتی ہے۔ جب کوئی مرغی آٹا لپٹی ہوئی کوڑی چگ جاتی ہے تو دھاگے میں واضح تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی موقع کو غنیمت جان کر دھاگے کو ایک ہلکا جھٹکا دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ

کوڑی مرغی کے حلق میں پھنس جاتی ہے چنانچہ مرغی حلق میں سے کسی بھی قسم کی آواز نکالنے کے قابل نہیں رہتی اور بہ آسانی اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بعدازاں کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر اس کے حلق سے کوڑی نکال لی جاتی ہے۔

خوشیا کی تکنیکی وضاحت ختم ہوئی تو میں نے دریافت کیا ''تم ان میں سے کون سا طریقہ اپناتے ہو؟''

''کوڑی والا طریقہ جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے استفسار کیا ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''یہ زیادہ محفوظ اور یقینی طریقہ ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تولیے والے طریقے سے مرغی کا تعاقب کرنا پڑتا ہے جس کے نتیجے میں مرغی اپنی مخصوص زبان میں شور مچا کر لوگوں کو اس جانب متوجہ کر سکتی ہے جب کہ آٹے میں لپٹی ہوئی کوڑی والے طریقے میں شکار یعنی مرغی کے نزدیک جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔''

میں نے اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے سوال کیا ''خوشیا! پچھلے ایک دو ماہ سے جو مرغیاں تمہارے گاؤں سے غائب ہوتی ہیں ان میں زیادہ تعداد کالی مرغیوں کی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ''بس جی، ایک خاص آرڈر سامنے آ گیا تھا۔''

''کس قسم کا آرڈر خوشیا؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ نگاہ چراتے ہوئے ٹالنے والے انداز میں بولا ''بس جی، تھی ایک پارٹی۔''

''تم واضح طور پر کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''جس کا مطلب یہی ہے کہ اب تم جھوٹ کا سہارا لینے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔''

''اور اگر تم نے کسی غلط بیانی سے کام لیا تو اچھا نہیں ہوگا خوشیا۔'' حوالدار جمعہ خان نے قہرناک نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ سہم کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''خوشیا! اگر میں تمہارے ساتھ نرمی کا برتاؤ کر رہا ہوں تو اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے اور وہ یہ کہ تم نے ابھی تک بھرپور تعاون کیا ہے لیکن اگر تم نے حقائق کو چھپانے یا توڑ موڑ کرنے کی کوشش کی تو پھر تمہارا برا حشر کیا جائے گا۔ ہم مجرموں سے جس طرح پیش آتے ہیں، تم اس کا تصور کر کے بھی کانپ اٹھو گے۔''

وہ فوراً لائن پر آ گیا ''جناب! میں نے مرغیاں چراتے وقت کبھی اس بات کا خیال نہیں رکھا تھا کہ وہ کالی ہیں یا سفید، بھوری ہیں یا چت کبری۔ میں تو مرغی چور ہوں، مرغیاں چرانا میرا کام ہے چاہے وہ کسی بھی رنگ و نسل کی ہوں۔'' ایک لمحے کو وہ سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''کالی مرغیاں میں خاص طور پر ایک شخص کی فرمائش پر چوری کر رہا ہوں۔''

''میں اسی شخص کا نام جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

''جناب!'' وہ متامل دکھائی دینے لگا ''اگر اسے پتا چل گیا کہ میں نے آپ کو اس بارے میں بتا دیا ہے تو وہ مجھے شدید ترین نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ اس نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی ہے کہ کسی صورت میں اس کا نام سامنے نہیں آنا چاہیئے۔''

''کیا وہ کوئی بہت خطرناک شخص ہے؟''

''پتا نہیں وہ خطرناک ہے یا خوف ناک۔'' وہ مرعوبیت سے بولا ''لیکن وہ ایک طاقت ور انسان ہے۔ میں کسی بھی طرح اس کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ اس نے مجھے زبان بندی کی تلقین کی تھی۔''

میں نے کہا ''تم صرف اس شخص کا نام بتا دو، باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اس طُرّم خان کو دیکھ لوں گا، وہ کتنے پانی میں ہے۔ اس سلسلے میں تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تم اس طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ میں اپنے طور پر اس طرح کارروائی کروں گا کہ تمہاری طرف کسی کا شک نہیں جائے گا۔''

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا پھر اس نے اس شخص کا نام بتا دیا۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ نام میری توقع کے عین مطابق تھا۔ خوشیا کے توسط سے کالی مرغیاں چرانے والا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ملنگ کالیا تھا۔ مجھے شروع ہی سے ملنگ پر شبہ تھا۔ میں اس قسم کے جعلی عاملوں اور پیروں فقیروں کی رگ رگ سے واقف ہوں اور ان کے طریقۂ واردات سے بھی آگاہی رکھتا ہوں۔

اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا تھا۔ اگر ملنگ کالیا، عابدہ خانم کے گھر کو جادو زدہ ثابت کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے آزما رہا تھا تو اس میں اس کا کون سا مفاد پوشیدہ تھا؟ ایک بات تو سامنے کی تھی اور عابدہ بھی مجھے اس بارے میں بتا چکی تھی۔ ملنگ کالیا بتول کے علاج معالجے اور جادو ٹونے کے کھاتے میں ان سے گاہے بہ گاہے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا مگر ذہن اس سے بھی آگے سوچ رہا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے مقاصد کچھ اور بھی ہوں۔

میں نے خوشیا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''تم کالی مرغیاں چرا کر ملنگ کالیا کے حوالے کرتے تھے یا کسی اور شخص کو دیتے تھے؟''

''جناب! اس سلسلے میں ملنگ بابا کی مجھ سے براہ راست کبھی بات یا ملاقات نہیں ہوئی۔'' خوشیا نے بتایا ''ملنگ کے ڈیرے پر اس کا ایک خادم بھی ہوتا ہے۔ اس کا نام حنیف ہے اور وہ ایک آنکھ سے کانا بھی ہے۔ اسی شخص نے مجھ سے کہا تھا کہ ملنگ بابا کو کالی مرغیوں کی ضرورت ہے۔ میں جب بھی ملا' حنیف کانے ہی سے ملا تھا۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ملنگ کالیا ان مرغیوں کا کیا کرتا ہو گا؟''

''ملنگ جادو ٹونے اور عملیات کا ماہر ہے جناب۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا ''ممکن ہے' وہ کالی مرغی کے خون سے کوئی عمل کرتا ہو۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔ ملنگ کالیا حکمت وغیرہ کا کام بھی کرتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے' وہ کالی مرغی کو کسی کشتے یا نسخہ میں استعمال کرتا ہو۔'' ایک لمحے کا توقف دے کر وہ سادہ لہجے میں بولا ''مجھے میرے کام کا اچھا معاوضہ مل رہا تھا اس لیے میں نے اس سلسلے میں اپنا دماغ کھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ملنگ بابا مجھ سے حاصل شدہ کالی مرغیوں سے کیا کرتا ہو گا۔''

پہلے میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ ممکن ہے' ملنگ کالیا خوشیا ہی سے وہ مرغیاں وغیرہ عابدہ کے گھر کے صحن میں پھنکواتا ہو گا لیکن خوشیا کے بیان نے میرے خیال کی تردید کر دی تھی۔ ملنگ کالیا کے خدمت گار حنیف کانا کا نام سامنے آیا تو دھیان اس حوالے سے اس کی طرف چلا گیا۔ ملنگ اپنے کانے خادم سے یہ کام کروا سکتا تھا۔

میں نے خوشیا سے پوچھا ''تمہیں چوری کی مرغیوں کا معاوضہ کون دیتا تھا؟''

''ملنگ کا بندہ حنیف کانا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا تم عابدہ خانم یا منظور حسین کو جانتے ہو؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا ''جی' میں ان دونوں کو جانتا ہوں۔ یہ میاں بیوی ہیں۔ میرے ہی پنڈ میں رہتے ہیں۔ منظور چاچا کریانے کی دکان کرتا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سوال کیا ''کیوں' کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''عابدہ کی بیٹی سخت بیمار ہے۔'' میں نے کہا ''ملنگ کالیا اس کا علاج کر رہا ہے۔ سنا ہے' کوئی کالے جادو وغیرہ کا چکر ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ہاں جی' یہ تو میں نے بھی سنا ہے۔ پورے گاؤں میں یہ مشہور ہے کہ بتول کی پھوپھی آسیہ بیگم نے اس گھر' خاص طور پر بتول پر جادو ٹونا کروا دیا ہے۔ مگر تھانے دار صاحب! مجھے تو اس بات میں سچائی نظر نہیں آتی!''

''کس بات میں خوشیا؟ میں نے پوچھا۔

یہی کہ آسیہ بیگم نے جادو کروا دیا ہو گا۔''

''تو حقیقت کیا ہے؟''

''حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔'' وہ اوپر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''آسیہ بیگم اور اس کا گھر والا محمد علی تو بے چارے بہت شریف لوگ ہیں۔ وہ اس قسم کے گندے اعمال کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔''

میں نے اسے مزید کریدنا ضروری سمجھا اور کہا ''مجھے پتا چلا ہے' یہ سارا چکر رشتے سے انکار کے بعد شروع ہوا ہے۔ عابدہ نے آسیہ کے بیٹے صدیقا کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ جواب میں انتقام کے طور پر آسیہ نے اس گھر اور بتول پر سفلی عمل کروا دیا ہے۔''

وہ بولا ''رشتہ ٹھکرانے والی بات تو مجھے معلوم ہے اور اس انکار میں بھی عابدہ ہی کا ہاتھ تھا ورنہ منظور تو اپنے بھانجے کو کبھی مایوس نہ کرتا۔ وہ اس رشتے کی مخالفت میں نہیں تھا لیکن بے چارہ کیا کرے' بیوی سے بہت ڈرتا ہے' عابدہ کے سامنے اسے دم مارنے کی مجال نہیں۔''

اس کے بعد وہ تھوڑی دیر تک آسیہ بیگم اور عابدہ خانم کے بارے میں اپنی معلومات کا دریا بہاتا رہا جس کے مطابق آسیہ بیگم ایک سیدھی سادھی گھریلو عورت تھی جب کہ آسیہ کی بھابی عابدہ خاصی تیز طرار اور چنٹ قسم کی عورت تھی جس نے اپنے شوہر کے سر پر راستہ بنا رکھا تھا۔

خوشیا اپنا تفصیلی بیان ختم کر چکا تو میں نے پوچھا ''کیا تم نے کبھی ملنگ کالیا کو دیکھا ہے؟''

''کئی بار دیکھا ہے تھانے دار صاحب۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس سے کبھی ملے بھی ہو کسی کام کے سلسلے میں؟

''ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔'' اس نے بتایا ''بس دور دور ہی سے دیکھا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے' تم کبھی اس کے ڈیرے یا آستانے پر نہیں گئے؟''

''جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''ملنگ کالیا کا ڈیرا قبرستان کے نزدیک ہی ہے۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کئی مرتبہ اس ڈیرے

کے پاس سے گزرا ہوں مگر آستانے کے اندر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ملنگ کالیا کی جھلک میں کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں مگر رو بہ رو کبھی اس سے بات چیت یا ملاقات نہیں ہوئی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "خوشیا! تم نے جتنی باتیں مجھے بتائی ہیں، ان میں اگر ایک بھی غلط یا جھوٹی نکلی تو بس سمجھ لو میں تمہاری کھال کھینچ کر اسے کانٹوں والی بیری پر پھیلا دوں گا۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "تھانے دار صاحب! میں نے آپ سے ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا۔ خدا پاک کی قسم، میں نے آپ کو ساری باتیں سولہ آنے سچ بتائی ہیں۔ آگے آپ کی مرضی، جو بھی سمجھیں...... اور میرے ساتھ جس بھی قسم کا سلوک چاہے کریں!"

"اگر تم اپنے بیان میں سچے ہو تو میں تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کروں گا خوشیا۔" میں نے تشفی آمیز لہجے میں اس کا حوصلہ بڑھایا "تم اگر ملنگ کالیا کی طرف سے کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہو تو یہ ڈر اور اندیشہ اپنے ذہن سے نکال دو۔"

وہ بے یقینی کے تاثرات کے ساتھ مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کا مزید حوصلہ بڑھاتے ہوئے مضبوط انداز میں کہا "پہلی بات تو یہ کہ کسی بھی طرح ملنگ کالیا یا اس کے چیلے حنیف کانا کو یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ تم ہمیں کالی مرغیوں کے بارے میں بتا چکے ہو۔ اور اگر بالفرض وہ تمہارے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو میں تمہاری مکمل حفاظت کا یقین دلاتا ہوں۔ ان میں سے کوئی تمہارا بال بھی بانکا نہیں کر سکتا۔ تم کسی بھی مرحلے پر کسی بھی قسم کا ڈر یا خوف یا کوئی خطرہ محسوس کرو تو فوراً میرے پاس چلے آنا۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا اور تمہارے ہر مخالف سے شافی و کافی نمٹ لوں گا۔"

وہ مطمئن لہجے میں بولا "آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب۔"

"اب تم جا سکتے ہو۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جب وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے تاکیدی انداز میں کہا "خوشیا! تم اپنے کسی عمل یا حرکت یا بات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دو گے کہ تم ہمارے پاس تھانے آئے تھے اور میں نے تم سے ملنگ کالیا اور کالی مرغیوں کے حوالے سے گفت و شنید کی تھی۔ خاص طور پر ملنگ کالیا اور اس کے چیلے حنیف کانا کو اس ملاقات کی بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیے!"

وہ فرماں برداری سے بولا "آپ فکر نہ کریں جناب، میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔"

"اور یہ بات بھی یاد رکھنا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اب بھی اگر ملنگ کالیا یا حنیف کانا تم سے کسی قسم کی "خدمت" لینا چاہے تو تم انکار نہیں کرو گے لیکن کوئی بھی عملی قدم اٹھانے سے قبل تم مجھے اس کی اطلاع ضرور دو گے!"

"جی تھانے دار صاحب۔ میں یہ بات ذہن میں رکھوں گا۔" وہ سر جھکا کر بولا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں مطمئن ہو گیا "اب جو بھی ہوگا، میں بھگت لوں گا۔ تم عام سے انداز میں اپنا کام جاری رکھو۔"

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

دو روز بعد میرے دروازے پر دستک ہوئی۔

میں اس وقت اپنے سرکاری کوارٹر میں آرام کی غرض سے لیٹا ہوا تھا۔ مذکورہ کوارٹر تھانے کے پچھواڑے واقع تھا۔ ان دنوں میری رہائش سرکاری کوارٹر ہی میں تھی۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ مجھے اس دستک پر حیرت نہیں ہوئی کیوں کہ اکثر کسی ضروری یا ہنگامی کام کے سبب مجھے کوارٹر سے بلایا جاتا تھا۔ عام طور پر میں نو بجے رات تھانے سے اٹھ کر اپنے کوارٹر میں آ جاتا تھا۔

میں نے چارپائی چھوڑ دی اور دروازہ کھولنے کے لیے کوارٹر کے صحن میں آ گیا پھر جب میں نے کنڈی گرا کر دروازے کے پٹ کھولے تو اپنے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ تھانے کا کوئی کانسٹیبل نہیں بلکہ منظور حسین تھا۔ جی ہاں، وہی منظور حسین جو بتول کا باپ اور عابدہ خانم کا شوہر تھا اور اپنے گھر ہی میں کریانے کی دکان چلاتا تھا۔

رات کے دس بجے منظور حسین کو اکیلے اپنے کوارٹر کے سامنے کھڑا...... دیکھ کر مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ اس وقت اس کی صورت پر تیرہ بج رہے تھے۔ وہ دبو قسم کا شوہر تھا۔ رات کے اس پہر وہ اگر اکیلا میرے پاس آیا تھا تو اس کے دو مطالب ہو سکتے تھے۔ یا تو اس کی بیوی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور یا پھر وہ بیوی کے خلاف کچھ کہنے میرے پاس آیا تھا۔"

میں نے یہ سب کچھ بہت تیزی سے سوچا اور منظور حسین کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے منظور۔ تم اس وقت یہاں؟"

"پہلے مجھے اندر آنے دیں پھر بتاتا ہوں۔" وہ بوکھلاہٹ آمیز نظر سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے گھر کے اندر داخلے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

وہ کوارٹر کے صحن میں پہنچ چکا تو میں نے دروازے کی کنڈی چڑھاتے ہوئے سوال کیا ''ہاں' اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟''

''تھانے دار صاحب! آپ مجھے خاصے معقول اور سمجھ دار انسان لگے ہیں۔'' وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا ''اس لیے میں نے سوچا' اپنے دل کی بات آپ سے کہہ دوں۔ ممکن ہے آپ ہمیں اور ہمارے گھر کو بچا لیں۔ میں بہت چھپ چھپا کر راز داری سے یہاں آیا ہوں۔ میرے گھر والوں اور آپ کے تھانے والوں کو یہاں میری موجودگی کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ میں مزید کسی سوال یا جرح سے پہلے اسے کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں لے گیا۔ صحن میں رکھے مٹی کے مٹکے میں سے پانی نکال کر اسے پلایا۔ جب اس کی سانس اور حالت ذرا نارمل ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں منظور! اب بتاؤ' کیا معاملہ ہے؟''

''آپ عابدہ کو تو اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے نا!''

''تم اپنی بیوی سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''وہ جی' ہر معقول' اور شریف النفس شوہر اپنی بیوی سے ضرور ڈرتا ہے خاص طور پر بچوں کی ماں کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔ میں تین بچوں کا باپ ہوں۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ میں زیادہ کیا بتاؤں!''

میں نے اس حوالے سے زیادہ جرح مناسب نہ سمجھی اور فوراً مطلب کی بات پر آ گیا ''ٹھیک ہے' منظور حسین!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا ''میں تمہاری بیوی کو تمہاری یہاں آمد اور اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اب بولو' کون سا مسئلہ تمہیں یہاں کھینچ لایا ہے...... اور اس وقت؟''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا ''تھانے دار صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ آپ ہمیں اور ہمارے گھر کو بچا لیں۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آیا ہوں۔''

میں پوری توجہ سے اس کی بات سننے لگا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اپنا دکھڑا رونے لگا۔

''تھانے دار صاحب! چند روز پہلے جب آپ ہمارے گاؤں آئے تھے تو میرے گھر کی بیٹھک میں آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بتول کا علاج کسی حکیم یا ڈاکٹر سے کیوں نہیں کرواتا! اس وقت میں

نے آپ سے یہی کہا تھا کہ بتول سخت قسم کے جادو ٹونے کے اثر میں پکڑی ہوئی ہے اس لیے عامل کامل ملنگ کالیا ہے اس کا علاج کروایا جا رہا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ملنگ بابا سے علاج کروانے کی ضد عابدہ کی تھی...... اور ہے۔ اس کے خیال میں بتول جس سفلی عمل میں جکڑی ہوئی ہے اور اس کا توڑ صرف اور صرف ملنگ کالیا کے پاس ہی ہے۔ میں بھی اب تک یہی سمجھ رہا تھا اور سب کے سامنے عابدہ کی زبان بولتا رہا ہوں مگر اب پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے۔ اگر اب بھی میں آپ کے سامنے اپنے دل کا احوال بیان نہیں کروں گا تو ممکن ہے' میرا دماغ پھٹ جائے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور امید افزا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''اب ایسا کیا ہو گا ہے منظور کہ تم محسوس کر رہے ہو' پانی سر سے اونچا ہو رہا ہے؟'' میرے لہجے میں دوستانہ ہمدردی کی آمیزش تھی۔

وہ ہمت کرتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! اب تک تو ملنگ کالیا مختلف قسم کے بدرنگ اور بدذائقہ محلول پلا کر بتول کا علاج کر رہا تھا اور ہم سے ہر پھیرے میں ایک مخصوص رقم بھی بٹور کر چلا جاتا تھا۔ ہم جادوئی اثرات کے توڑ اور بتول کی صحت یابی کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے مگر کل رات عابدہ نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے کہ ملنگ کالیا مجھے سراسر فراڈ نظر آنے لگا ہے۔ وہ انتہائی لالچی اور کمینہ فطرت ثابت ہو رہا ہے۔ مجھے تو یقین ہو رہا ہے کہ بتول کی بیماری میں سب سے زیادہ ہاتھ اسی کا ہے۔ اس کی دی ہوئی دوائیں اور محلول ہی بتول کو بیمار ڈالنے کا سبب ہیں۔ وہ ایک خاص مکروہ مقصد کے تحت اپنی چالیں چل رہا تھا اور ہم بے خبری میں آہستہ آہستہ اس کے جال میں پھنستے چلے جا رہے تھے۔''

یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی۔ میں نے پوچھا ''کل رات عابدہ نے تم سے ایسی کیا بات کہہ دی جو ملنگ کالیا پر سے تمہارا یقین اور اعتقاد اٹھ گیا ہے؟''

''تھانے دار صاحب! عابدہ نے مجھے بتایا کہ منگ بابا ان تمام مسائل کا صرف ایک ہی حل بتا رہے ہیں۔ اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو پھر ہمیں تباہی اور بربادی سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔''

میں نے پوچھا ''ملنگ کالیا نے تمہارے مسائل کا کون سا حل بتایا...... اور وہ اپنی کون سی بات ماننے کو کہہ رہے ہیں؟''

منظور تھوڑی دیر تک تذبذب کے عالم میں رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا" جناب! ملنگ بابا نے کہا ہے کہ اگر ہم جادوئی اثرات سے نکلنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس گھر کو چھوڑنا ہوگا۔ بہتر یہی ہوگا کہ ہم اپنا گھر بیچ دیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں ایک خریدار پارٹی بھی تلاش کر لی ہے۔"

وہ خاموش ہو کر زخمی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی مجروح نگاہی سے سمجھ گیا کہ معاملہ یہاں پر ختم نہیں ہو جاتا جتنا وہ بیان کر چکا بلکہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ابھی باقی ہے۔ چنانچہ اپنے خیال کی تصدیق کے لیے میں نے اسے ٹٹولا۔

"منظور حسین! یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر تم ملنگ کالیا کو شک اور بے یقینی کی نظر سے دیکھنے لگو؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار جی۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا" سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ملنگ بابا بتول کا جو علاج بتا رہے ہیں وہ میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔"

میں نے کہا" تو کیا گھر کی جبری فروخت سے بتول کا بھلا نہیں ہوگا؟"

"گھر چھوڑنے یا فروخت کرنے سے تو گھر کی مصیبت دور ہوگی۔" منظور نے کالیا کی زبان سے بتایا" جب کہ بتول کو سحری اثرات سے نکالنے کے لیے ہمیں کالیا کے ایک ذاتی منصوبے پر سر جھکانا ہوگا۔ اگر ہم اس کی بات خاموشی سے مان لیں تو بتول بھلی چنگی ہو جائے گی۔"

میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا" اور ملنگ کالیا کا ذاتی منصوبہ کیا ہے۔ وہ تم لوگوں سے اپنی کون سی بات منوانا چاہتا ہے؟"

"وہ چاہتا ہے، ہم بتول کی شادی اس سے کر دیں۔" منظور نے شکستہ لہجے میں بتایا۔

"لاحول ولا قوۃ" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

منظور حسین رحم طلب نظر سے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی حالت پر بہت افسوس بھی ہوا اور میں نے اپنے دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی بھی محسوس کی۔ میں نے کھوجنے والے انداز میں اس سے دریافت کیا۔

"اور تمہاری بیوی عابدہ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ ملنگ کالیا سے بہت متاثر ہے۔" اس نے جواب دیا" وہ ملنگ کی بیہودہ باتوں پر یقین رکھتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ اگر ہم نے ملنگ بابا کی بات نہ مانی تو واقعی ہم تباہ و برباد ہو جائیں

گے۔ وہ مکان بیچنے کے ساتھ ساتھ بتول کو بھی اس کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہے۔"

"ایسا ہرگز ہرگز نہ ہونے دینا منظور حسین۔" میں نے قطعیت سے کہا۔

"میری تو یہی کوشش ہے کہ ایسا نہ ہو۔" وہ بے چارگی سے بولا" اسی لیے تو آپ کی مدد لینے رات کے اس وقت آپ کے پاس آیا ہوں۔ عابدہ کے سامنے میری تو پیش نہیں چلتی۔ وہ میری بات کو اہمیت دیتی ہے اور نہ ہی مجھے کسی کھاتے میں گردانتی ہے۔ اگر آپ کسی طرح اس معاملے میں میری مدد کریں تو بات بن سکتی ہے۔ ملنگ کالیا جادو ٹونے اور دیگر عملیات کے حوالے سے اچھی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اس سے مرعوب اور ڈرے سہمے رہتے ہیں پھر عابدہ خود اس کی ہم خیال ثابت ہو رہی ہے۔ وہ نادان ملنگ کے جھوٹے وعدوں پر بہل رہی ہے اور بیٹی کو جہنم رسید کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟"

اس کی کسمپرسی کو میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک ایسا زن مرید شوہر تھا جو اپنی بیٹی کے لیے دل میں بہت درد رکھتا تھا اور اس کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا مگر بے بس اتنا تھا کہ از خود کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ دوسری جانب ملنگ کالیا کے عزائم بھی اب کھل کر میرے سامنے آ گئے تھے۔ وہ خبیث خصلت شخص بتول جیسی نوعمر حسین و جمیل لڑکی پر رال ٹپکا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ گھر کی فروخت کے سلسلے میں بھی وہ کسی جعلی پارٹی کو سامنے لا کر منظور اور عابدہ کا مکان ان سے ہتھیانا چاہتا تھا۔ خوشیا مجھے بتا چکا تھا کہ وہ کالی مرغیاں چرا کر کالیا کے خدمت گار حنیف کانا تک پہنچاتا تھا۔ اب یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ عابدہ اور منظور کے گھر کے صحن میں پائی جانے والی مرغیاں، بلی، کتا اور چوہے وغیرہ کالیا ہی کے ارسال کردہ تھے۔ وہ ان "حرکتوں" سے باور کرانا چاہتا تھا کہ اس گھر پر کالے جادو کا اثر ہے۔ بتول کے سلسلے میں وہ بڑی "تن دہی" سے کوشاں تھا اور الٹے سیدھے محلول پلا کر اسے ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر ناکارہ کر چکا تھا کہ وہ مردہ نظر آتی تھی۔ وہ ہوس پرست شخص معصوم بتول پر دانت تیز کر رہا تھا اور اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے اسے "حاصل" کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق منظور حسین اینڈ فیملی تباہی کے دہانے پر کھڑے تھے۔

میں نے منظور کو دلاسا دیتے ہوئے کہا" تم اب اس سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں دیکھ لوں گا ملنگ کالیا اور اس کے عملیات کو۔ تم بس اپنی بیوی پر نگاہ رکھو! اور اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ وہ کالیا کو گھر میں داخل نہ ہونے دے۔"

"میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا" مگر عابدہ کو کسی بات

کے لیے قائل کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ ملنگ کالیا نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی ہے کہ اگر بتول کی شادی اس سے نہ کی گئی تو وہ جادوئی اثرات کے باعث جان ہار بیٹھے گی۔ بتول کو زندہ رکھنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ملنگ سے اس کی شادی کر دی جائے۔"

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "تمہیں تھوڑا بہت سخت تو ہونا پڑے گا۔ ملنگ کالیا زبردستی تمہاری بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں' تم اسے اپنے گھر میں داخل ہونے نہیں دینا۔ اگر وہ شیطان زبردستی تمہارے گھر میں داخل ہونا چاہے یا بتول سے ملنا چاہے تو تم فوراً مجھے اطلاع دینا۔ میں اس مردود سے خود ہی نمٹ لوں گا۔ بتول سے اس کا میل جول ٹھیک نہیں...... اور اس کی دی ہوئی تمام دوائیاں بھی فوراً بند کر دو۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے منظور کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا "میں بہت جلد ملنگ کالیا کے ڈیرے کا "دورہ" کرنے والا ہوں۔ تم فکر نہ کرو' اس موذی کا زہر میں نکال لوں گا۔ تم اپنے گھر اور گھر والوں کا خیال رکھو۔"

وہ قدرے اطمینان بخش حالات میں نظر آنے لگا۔ اس کے بعد میں نے اسے کالی مرغیوں کی چوری اور اس کے صحن میں اُن کی "آمد" کا احوالِ حقیقی مختصر الفاظ میں سنایا۔ میری باتیں سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ ممنونیت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "منظور حسین! میں تمہارے گھر کے مسائل اور ملنگ کالیا کی طرف سے بے خبر یا بے پروا نہیں ہوں۔ انشاء اللہ' بہت جلد میں تمہیں کامیابی کی اطلاع دوں گا۔ تم اپنے گھر کے معاملات پر گہری نظر رکھو' بیرونی مسائل سے میں خود نمٹ لوں گا۔"

میری حوصلہ افزا باتوں نے اس کی ہمت بندھائی اور وہ قدرے مضبوط لہجے میں بولا "تھانے دار صاحب! میری بچی اس شیطانی چکر سے نکل آئے گی نا؟"

"ضرور نکل آئے گی۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ میں نے واضح الفاظ میں اسے بتایا "منظور حسین! اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرنا' خصوصاً اپنی بیوی کو تو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دینا۔ میں خود بھی کسی دن تمہارے گھر آؤں گا اور تمہاری بیٹی بتول سے بھرپور ملاقات کروں گا۔ تم نے وہی کرنا ہے جو میں نے سمجھایا ہے۔ میں ذرا ملنگ کالیا کو ٹٹول لوں پھر آئندہ لائحہ عمل بتاؤں گا۔"

وہ میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کر کے میرے کوارٹر سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

سفلیات کے بہ زعم خود ماہر' ملنگ کالیا کا آستانہ قبرستان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ آستانے کے قریب ہی سے ریلوے لائن گزرتی تھی جو بہت کم مصروف رہتی تھی۔ آستانے تک پہنچنے کے لیے قبرستان کے اندر سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ ایک پگڈنڈی نما چھوٹا سا راستہ تھا جس نے قبرستان کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔

میں حوالدار جمعہ خان کے ہمراہ کالیا کے آستانے پر پہنچا تھا۔ اس وقت ہم سرکاری لباس میں تھے اور وہ دوپہر کا وقت تھا۔ ہم آستانے کے احاطے میں داخل ہوئے تو کالیا کے خدمت گار حنیف کانا سے سامنا ہو گیا۔ اس کے یک چشم چراغ گل کو دیکھ کر میں نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ حنیف ہی ہو گا۔ ہمیں وردی میں دیکھ کر وہ چونکا کیوں کہ آستانے پر پولیس کی آمد معمول کی بات نہیں تھی۔

وہ نرم لہجے میں بولا "مائی باپ! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیا ہوتا تو میں خود تھانے حاضر ہو جاتا۔"

"میں تم سے نہیں بلکہ تمہارے گرو کالیا سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے اکھڑے لہجے میں کہا۔

حنیف کانا سے بات کرتے ہوئے میں عقابی نظر سے آستانے کا جائزہ بھی لے رہا تھا حنیف نے میری بات کے جواب میں گڑبڑاتے ہوئے لہجے میں بتایا "ملنگ جی تو اس وقت ڈیرے پر نہیں ہیں۔"

حنیف کے لہجے کی گڑبڑاہٹ نے مجھے بتا دیا کہ وہ دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ ویسے بھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آستانے کے اندر کسی انسان کی ایک جھلک دیکھی تھی جو سیاہ لبادہ میں تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے حنیف سے بات کرتے دیکھ کر وہ سیاہ پوش کہیں چھپ گیا ہو اور ہماری گفتگو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ احساس مجھے لاشعور طور پر تھا اور اس کے ساتھ ہی لاشعور مجھے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ سیاہ پوش ملنگ کالیا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے بوکھلاہٹ میں مبتلا حنیف کانے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا "تمہارے گرو گھنٹال ڈیرے پر نہیں تو پھر کہاں گئے ہیں؟"

"وہ ساتھ والے گاؤں میں ایک مریضہ کا علاج کرنے گئے ہیں۔" وہ کن انکھیوں سے آستانے کے اندرونی حصے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "انہوں نے مریضاؤں کے علاج پر ہی کیوں کمر باندھ رکھی ہے۔ کیا انہیں آس پاس کوئی مرد مریض نظر نہیں آتا؟"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے حنیف کانے کی معطل آنکھ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مزید گڑبڑا گیا اور آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

میں نے آستانے کے اندر داخل ہونے کے لیے قدم بڑھائے تو حنیف کانا اس طرح میرے سامنے آ گیا جیسے میرا راستہ روک رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''سرکار! میں نے بتایا ہے نا' ملنگ جی یہاں نہیں ہیں۔ آپ اس ملاقات کو کل تک ٹال دیں۔ آج رات کو ملنگ جی آ جائیں گے۔ آپ کل صبح تشریف لائیں تو وہ مل جائیں گے۔''

میں نے اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا ''میں ملنگ کالیا کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ اس وقت ڈیرے پر موجود ہے۔ تم جھوٹ بول کر اپنے لیے مصیبت کو دعوت دے رہا ہو!''

اسی اثنا میں ایک سیاہ پوش پستہ قامت شخص ڈیرے کے اندرونی حصے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے لباس کی طرح اس کی رنگت بھی سیاہ ہی تھی۔ اس کے چہرے پر شیطانیت ناچ رہی تھی اور اپنے حلیے سے وہ ایک پیشہ ور عیار شخص نظر آتا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ملنگ کالیا کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر حنیف کانا اس مکروہ صورت پستہ قد شخص کو دیکھ کر جس طرح با ادب باملاحظہ ہوشیار ہو گیا تھا اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ وہ اس کا گرو گھنٹال کالیا ہی تھا۔

ملنگ کالیا نے ایک بے پرواسی نظر میرے اور جمعہ خان کے چہرے پر ڈالی پھر حنیف کانے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''حنیف' کیا معاملہ ہے۔ صاحب بہادر کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں؟''

ملنگ کالیا کی آواز میں ایک عجیب سی گونج اور دبدبہ تھا۔ حنیف نے گھگیاتے ہوئے انداز میں کہا ''مرشد' یہ آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''اور تم ہمیں دروازے سے ہی ٹہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تمہارے بیان کے مطابق تو ملنگ جی دوسرے گاؤں کسی مریضہ کا علاج کرنے گئے ہوئے تھے؟''

اس موقع پر ملنگ کالیا نے اپنے چیلے کا تحفظ کیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! حنیف نے آپ سے جو کچھ کہا وہ میری ہدایات کے مطابق تھا۔ اس میں اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں۔'' پھر وہ قدرے نرم اور دوستانہ انداز میں گویا ہوا ''آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں' یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ میرے غریب خانے کے اندر تشریف لائیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے

اندر جانے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

میں اور جمعہ خان آستانے کے اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ اس دوران میں حنیف کانا کالیا کا اشارہ پا کر نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ ملنگ کالیا کے آستانے یا ڈیرے پر نیچی چھتوں والے دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آیا جس کی آرائش اور ترتیب سے واضح تھا کہ وہ ملنگ کالیا کا حجرہ خاص تھا۔ کمرے میں فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرے کے مغربی کونے میں ملنگ کی نشست گاہ تھی جو ایک مخصوص قسم کی گدی پر مشتمل تھی۔ دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔

ملنگ کالیا اپنے لیے مخصوص نشست پر نیم دراز ہو گیا۔ میں اور جمعہ خان بھی گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ملنگ کا انداز دوستانہ بلکہ میزبانانہ تھا چنانچہ میں نے بھی کسی قسم کا سخت رویہ اپنانے کے بجائے معتدل انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''ملنگ جی! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے خدمت گار حنیف نے آپ ہی کی ہدایات پر ہمیں آپ کے بارے میں غلط معلومات دی تھیں۔ آپ نے ایسی ہدایات کیوں جاری کی تھیں کیا آپ ہم سے ملنا نہیں چاہتے تھے......اور کیوں؟''

وہ زیر لب مسکرایا اور بولا ''یہ ہدایات خاص طور پر آپ کے لیے نہیں تھیں بلکہ میں نے حنیف سے کہہ رکھا تھا کہ کوئی بھی مجھ سے ملنے آئے تو اسے یہی بتایا جائے کہ میں کسی دوسرے گاؤں گیا ہوا ہوں۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں'' اس نے مدبرانہ انداز میں گردن کو حرکت دی اور بتایا ''دراصل آج میں ایک خاص قسم کا چلّہ کھینچنا چاہتا تھا اس لیے کسی بھی قسم کی بیرونی مداخلت نہیں چاہتا تھا۔ ملنے والے جب کسی کام سے آتے ہیں تو پھر بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ خیر......''

اس نے ''خیر'' پر دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں اس کے ''خیر'' میں پوشیدہ ''شر'' سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ میری مردم شناس آنکھوں نے پہلی ہی نظر میں ملنگ کالیا کا اندرونی اور بیرونی ایکسرے لے ڈالا تھا۔ وہ لالچی طبیعت' حریص فطرت' ہوس زدہ ذہنیت اور کمینہ خصلت رکھنے والا ایک عیّار و مکّار پیشہ ور نقلی عامل و کامل تھا۔ ایسے دھوکا باز اور چال ساز نام نہاد پہنچے ہوئے افراد ہر ملک' ہر شہر ہر گاؤں قصبے میں پائے جاتے ہیں۔ انسان اگر ذرا سی سمجھ بوجھ اور شعور رکھتا ہو تو ان نقاب پوش چہروں کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔

میں نے ملنگ کالیا کے نرم رویے کا جواب اسی انداز میں دیا اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''ملنگ جی! ہماری آمد سے آپ کی چلہ کشی میں رخنہ پڑ گیا مگر کیا کریں' ہمیں آپ کی اس مخصوص مصروفیت کا علم نہیں تھا ورنہ کسی اور وقت آ جاتے۔''

''اب آ ہی گئے ہیں تو پچھتانے یا افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' وہ رعونت سے بولا ''میں اپنے چلے کو ایک دن کے لیے آگے بڑھا دیتا ہوں۔'' پھر وہ براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''ملک صفدر حیات صاحب! میں آپ کو کافی عرصہ سے جانتا ہوں مگر ہماری ملاقات آج پہلی مرتبہ ہوئی ہے۔ خیر فرمائیں۔ آپ کو اس زحمت کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

اس نے مجھ سے آشنائی کا جو دعویٰ کیا تھا وہ یک طرفہ تھا اور اس میں کسی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ کسی بھی قسم اور نوعیت کے جرم میں ملوث افراد اپنے علاقے کے تھانے دار کو بہ خوبی پہچانتے ہیں۔ اس حوالے سے ملنگ کالیا کا انکشاف میرے لیے چونکا دینے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ملنگ جی! میں بتول کے سلسلے میں آپ سے بات کرنے آیا ہوں۔''

''بتول!'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ''کون بتول؟''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ''وہی بتول جو منظور حسین کریانہ والے کی بیٹی ہے اور دو چار ماہ سے آپ جس کا علاج فرما رہے ہیں۔''

وہ میرے لہجے میں پوشیدہ ترشی کو محسوس کرتے ہوئے تھوڑا محتاط ہو گیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا ''اچھا اچھا' وہ بتول۔ ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ وہ لڑکی بے چاری بہت مصیبت زدہ ہے۔ اس پر نہایت ہی سخت قسم کا گندا عمل کیا گیا ہے۔ یہ رشتے داریاں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں خلا میں گھورتے ہوئے بولا ''ذرا ذرا سی بات پر لوگ دشمنی پر اتر آئے ہیں۔ اب آپ آسیہ کو ہی لیں۔ عابدہ نے بتول کے رشتے سے کیا انکار کر دیا وہ جادو ٹونے پر اتر آئی اور معصوم بتول کی زندگی اس نے تباہ کر کے رکھ دی ہے۔''

میں ملنگ کالیا کی اداکاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا مگر یہ داد میں نے دل ہی دل میں دی تھی۔ وہ چہرے کے تاثرات میں کمال رکھتا تھا مگر میں یہاں مکالمہ بازی کے لیے نہیں آیا تھا۔ میں نے الفاظ کو طنز کی چادر میں لپیٹتے ہوئے ملنگ کالیا کی جانب بڑھا دیا۔

''ملنگ جی' مجھے پتا چلا ہے' آپ تباہ حال بتول کو آباد کرنے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں؟''

میں نے لفظ ''آباد'' اور ''چکر'' پر خصوصی زور دیا تھا۔ وہ تلملا کر رہ گیا تاہم اس کے چہرے سے کوئی خاص ناگواری ظاہر نہیں ہوئی۔ وہ حتی الامکان سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میں تو یہاں بیٹھا ہی اسی لیے ہوں۔ جو بھی ضرورت مند اور مصیبت زدہ میرے پاس آتا ہے اس کی مدد ضرور کرتا ہوں۔ بتول بھی میرے زیر علاج ہے۔ انشاءاللہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔''

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ''بتول کو بیماری کیا ہے؟''

''اس پر سخت قسم کا سفلی کیا گیا ہے۔''

''اور اس کے گھر پر؟''

''وہ گھر بھی نادیدہ حصار سے باندھ دیا گیا ہے۔''

''ان حرکات'' کا ذمہ دار کون ہے؟''

''بتول کی پھوپی...... آسیہ بیگم' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے پوچھا ''آپ کو یہ بات کیوں کر معلوم ہوئی ملنگ جی؟''

''حساب کتاب سے۔'' وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

''آپ حساب کتاب کے اتنے ہی ماہر ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ بتول کب تک ٹھیک ہو جائے گی...... اور اس گھر کی مصیبتیں کب ٹلیں گی؟''

اس نے میرے لہجے میں پوشیدہ تندی کو محسوس کر لیا اور میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! آپ کی باتوں اور انداز سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ آپ کو میری ذات پر کسی قسم کا شک ہو گیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

میں نے اس کے سوال کا گول مول سا جواب دیا اور کہا ''ہماری تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول ہی سے چلتی ہے ملنگ جی!''

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا ''بہر حال' میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ بتول کا معاملہ بہت اہم اور پیچیدہ ہے۔ وہ کوئی عام قسم کے جادو کے اثرات میں نہیں ہے۔ میں نے روزمرہ اور معمول کی تمام کوششیں کر کے دیکھ لی ہیں مگر بات نہیں بن سکی......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''گویا اب غیر معمولی قسم کی کوشش کا ارادہ رکھتے ہیں!''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور کہا ''آپ بہت گہری باتیں کرتے ہیں ملک صاحب!''

''آپ بھی تو بہت گہری چالیں چلتے ہیں ملنگ جی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔

وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا تاہم سنبھلتے ہوئے لہجے میں گویا ہوا ''ملک صفدر حیات صاحب! آپ بھی کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔ صاف صاف کہیں جو بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ہم سے کیا پردہ۔ میں آپ سے کوئی باہر تھوڑا ہی ہوں!''

اس نے یہ جملے بڑے اعتماد سے ادا کیے تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا ''صاف صاف کہا ہوا سننے کا حوصلہ ہے آپ میں ملنگ جی؟''

وہ مخصوص انداز میں مسکرایا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ہے حوصلہ، مجھ میں بہت حوصلہ ہے۔ آپ سے پہلے اس تھانے کے جو انچارج صاحب تھے ان سے میری اچھی سلام دعا تھی مگر آپ سے آج پہلی مرتبہ ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ جو بھی کہیں گے، میں پوری توجہ سے سنوں گا اور آپ کے ساتھ پورا تعاون بھی کروں گا۔''

''ہوں'' میں نے معنی خیز نظر سے اس کا جائزہ لیا اور کہا ''ملنگ جی! آپ خاصے یار باش ثابت ہو رہے ہو۔ لگتا ہے، ہماری خوب نبھے گی۔''

یہ جملے میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کیے تھے۔ میں خود کو اسی کے مزاج کا ظاہر کر کے اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھ سے پہلے والے تھانے دار سے شناسائی کا دعویٰ کر کے ملنگ کالیا نے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچا دی تھی کہ وہ ایک بدقماش شخص تھا کیوں کہ یہ بات مجھے معلوم ہو چکی تھی کہ سابق تھانے دار ایک رشوت خور اور مجرموں کے ہاتھ مضبوط کرنے والا تھانہ انچارج تھا اور یہ تو آپ نے سن رکھا ہوگا...... کند ہم جنس، با ہم جنس پرواز......

ملنگ کالیا نے کہا ''اللہ کرے، ہماری خوب نبھے۔ میری تو یہ خواہش بھی ہے۔''

اسی دوران میں ملنگ کا چیلا حنیف کانا ہماری خاطر تواضع کے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان لے آیا۔ برتنوں کو ہمارے درمیان چھوڑ کر وہ واپس چلا گیا۔ ملنگ کے اصرار پر ہم نے تھوڑا تھوڑا لیا۔ کچھ دیر بعد میں نے حوالدار جمعہ خان کے کان میں کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جائے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ ملنگ کالیا بات چیت کے دوران کئی بار مخصوص انداز میں جمعہ خان کو دیکھ چکا تھا جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ تخلیے میں مجھ سے کچھ ''راز و نیاز'' کرنا چاہتا تھا۔

''یہ آپ نے عقل مندی کا کام کیا ہے۔'' حوالدار کے جاتے ہی کالیا نے میری طرف دیکھ

ہوئے سراہنے والے انداز میں کہا ''اب ہم زیادہ کھل کر بات چیت کر سکتے ہیں۔''

میں نے ذو معنی انداز میں کہا ''اب آپ بھی عقل مندی کا مظاہرہ کریں ملنگ جی۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ ادھر تھانے میں آج کل بہت مصروفیت چل رہی ہے۔''

''ہاں جی، حکم کریں۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ''ملنگ جی! یہ بتول کا کیا چکر ہے؟''

''بہت مظلوم لڑکی ہے تھانے دار صاحب'' وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولا ''بے چاری پر اس کی پھوپی نے بڑا ڈھیٹ قسم کا گندا عمل کروایا ہے۔''

''یہ بات تو سبھی جانتے ہیں۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''اور اس بات کو پھیلانے میں آپ کا ہاتھ ہے۔ آپ ہی نے یہ تشخیص کی ہے اور پیش گوئی بھی کی تھی کہ ان کے گھر کے صحن میں مردہ چوہے، بلیاں، کتے اور مرغیاں وغیرہ پڑی ملیں گی...... اور ایسا ہی ہوا بھی۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''پھر آپ کا علاج شروع ہوا اور بتول بد سے بدترین حالت کو پہنچ گی۔ آپ اس جادو کا توڑ کرنے میں ناکامیاب رہے اور بالآخر اس مصیبت سے مکمل نجات کے لیے آپ نے بتول کی والدہ کو جو حل بتایا، وہ بتول کے لیے ہو نہ ہو مگر آپ کے لیے بہت پرکشش اور سود مند ہے۔ بتول بہرحال ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہے جو اگرچہ چند روز تک آپ کے دیے ہوئے محلول استعمال کرنا چھوڑ دے تو اس کی رعنائی اور شادابی واپس آ سکتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ تو سراسر مجھ پر شک کر رہے ہیں۔'' وہ چیں بہ جبیں ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ''میں تو حقائق کا ذکر کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو تردید یا تصدیق کر سکتے ہیں۔''

وہ چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر متحمل لہجے میں گویا ہوا ''دیکھیں ملک صاحب! آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں، میں نا تو مکمل طور پر اس کی تردید کروں گا اور نہ ہی تصدیق۔''

''یہ تو دوغلا پن ہوگا!'' میں نے کہا۔

''میرے نزدیک یہ دوغلا پن نہیں بلکہ حقیقت ہوگی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے پوچھا ''وہ کس طرح ملنگ جی؟''

''وہ اس طرح ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''یہ بات بالکل سچ ہے کہ بتول ایک گندے عمل کے زیر اثر ہے اور میرے حساب کتاب کے مطابق یہ سفلی عمل اس کی کسی

قریبی رشتے دار عورت نے کروایا ہے۔ غالب امکان آسیہ بیگم کا ہے' یہی میں نے عابدہ بیگم کو بتایا تھا یہ حقیقت ہے کہ جادوٹونا بہت سخت اور پائے دار ہے۔ میں کوشش کے باوجود بھی اس کا توڑ نہیں کر چنانچہ......''

وہ یہاں تک پہنچ کر رک گیا۔ میں نے اس کی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا'' چنانچہ آپ نے اس لڑکی کی شافی جھاڑ پھونک کے لیے اسے اپنے عقد میں لینے کی تجویز رکھی ہے؟''

بات ختم کرتے کرتے میرا لہجہ خاصا تلخ ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا' تھوڑی دیر ک لیے اس کا چہرہ متغیر ہوا پھر سنبھلتے ہوئے بولا'' آپ کو یہ بات یقیناً عابدہ یا منظور نے بتائی ہوگی!''

'' مجھے یہ بات کہیں سے بھی پتا چلی ہو' تمہیں اس سے غرض نہیں ہونا چاہیے۔'' میں غیر اراد طور پر '' آپ'' سے '' تم'' پر اتر آیا تھا۔ ملنگ کے لیے میرے دل میں غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں قدرے سخت لہجے میں کہا'' تم صرف یہ بتاؤ کہ میں سچ کہہ رہا ہوں یا نہیں؟''

وہ میرے بدلے ہوئے تیور بھانپ گیا اور جواباً خشک لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا'' دیکھو ملک جی! اگر سچی بات سننا چاہتے ہو تو پھر جان لو کہ اس لڑکی پر واقعی میرا دل آ گیا ہے۔ میں اسے دل و جا سے پسند کرنے لگا ہوں اور جائز طریقے سے اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر ا نے میرے چہرے کے اثرات کا جائزہ لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا'' اور جہاں تک اس جادوئی اثرات کا تعلق ہے تو یہ بات اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے۔ بتول واقعی گندے عمل کے زیر ا ہے۔''

وہ بڑی صفائی سے اپنے علم اور عمل کی عزت بھی بچانا چاہتا تھا تاکہ اس کی شخصیت کا بھرم قا رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بتول کی پسندیدگی اور اس سے جائز شادی کا ذکر کر کے خود کو راست شخص بھی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی عیاری اور چال بازی کا ایک عمدہ عملی مظاہرہ تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' کسی کو پسند کرنا اور اس سے شادی کی خواہش کرنا کو جرم نہیں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ فریق ثانی کی مرضی اور اس کے لواحقین کی رضامندی بھ شامل ہو۔''

'' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور مضبوط لہجے میں بو '' آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس سلسلے میں بتول میرا ساتھ دینے کے لیے پوری طرح تی رہے۔ وہ مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہے البتہ اس کے والدین کو منانا پڑے گا۔''

میرے لیے واقعی یہ ایک حیرت انگیز اطلاع تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بتول جیسی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی ملنگ کالیا جیسے کالے بھجنگ کم رو پستہ قد شخص سے شادی کی خواہاں ہوگی۔ میں نے ابھی تک بتول کو روبرو نہیں دیکھا تھا اس کے بارے میں تاہم جتنا سنا تھا اس کے مطابق وہ گاؤں کی خوب رو ترین لڑکی تھی اور دوسری کوئی لڑکی اس کی مثال نہیں تھی۔ پھر عابدہ یا منظور کی زبانی مجھے جو حالات پتا چلے تھے ان کے مطابق بھی بتول' ملنگ کالیا میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ کالیا نے جو انکشاف کیا تھا اس سے یہی بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ صدفی جھوٹ کا سہارا لے رہا ہے۔

لوہا' لوہے کو کاٹتا ہے۔ جھوٹ کا مقابلہ جھوٹ اور مکاری ہی سے کرنا چاہیے۔ اور جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچا کر آنا چاہیے۔ ملنگ کالیا ایک دروغ گو اور عیار شخص تھا میں نے اس کی چال اسی پر لوٹانے کا فیصلہ کر لیا اور آہستہ آہستہ اسے گھیرنے لگا۔

'' تم ٹھیک کہہ رہے ہو ملنگ جی۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا'' جب لڑکا لڑکی راضی تو پھر کیا کرے گا قاضی۔ بس تم ذرا بتول کے والدین کو بھی راضی کر لو تو پھر اچھی بات ہوگی۔''

وہ سمجھا' میں اس کے چکر میں آ گیا ہوں۔ سنجیدگی سے بولا'' آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب! میں تو خود بھی زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ ہر کام طریقے سلیقے سے کرنا چاہتا ہوں۔ میری پوری کوشش ہوگی کہ عابدہ اور منظور اس رشتے کے لیے تیار ہو جائیں۔''

میں سوچنے لگا' عابدہ تو صدیقا سے بیٹی بیاہنے کو تیار نہیں ہوئی تھی' کالیا جیسے بدہیئت شخص کے لیے وہ کس طرح آمادہ ہوگی۔ بہرحال' یہ تو ملنگ کالیا کے خیالات تھے جو وہ مجھے متاثر کرنے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ میں ان جان بنا رہا' فی الحال یہی مناسب تھا۔

'' بالکل...... بالکل'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا'' سب کچھ میری پیش گوئی کے مطابق پیش آ رہا ہے۔''

'' تمہیں یہ سب کچھ قبل از وقت کیسے معلوم ہو گیا تھا؟''

'' میں نے جب پہلی مرتبہ بتول کو دیکھا تھا تو معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔'' وہ گھمبیر لہجے میں گویا ہوا'' میں گزشتہ پندرہ سال سے عملیات کی دنیا میں ہوں۔ ایک نظر کسی سحر زدہ شخص کو دیکھ کر اس کے بارے میں بہت دور تک تفصیل سے بتا سکتا ہوں۔''

میں نے اس کی تعلی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا'' ملنگ جی! مردہ کتے تک تو آپ کی '' پیش گوئی'' سچی ثابت ہو گئی ہے۔ اب حضرت انسان کی باری ہے۔''

"بہ جا فرمایا ملک صاحب۔" وہ متفکرانہ انداز میں خلا میں گھورتے ہوئے بولا "اگر بتول کے والدین نے سمجھ داری کا مظاہرہ نہیں کیا اور بتول کی شادی کے سلسلے میں کوئی اڑنگا لگانے کی کوشش کی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

الفاظ "کچھ بھی" پر اس نے اچھا خاصا زور ڈالا تھا اور اس میں ایک خوفناک دھمکی بھی پوشیدہ تھی جس کا عیاں مطلب یہی تھا کہ اگر عابدہ اینڈ کمپنی نے ملنگ سے بتول کی شادی نہ کی تو ان کے گھر کے صحن میں کوئی مردہ انسان بھی پایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد بتول کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ملنگ کالیا کا طریقہ واردات خاصا خطرناک اور موثر تھا۔ کوئی بھی ایسا شخص جو "اندھوں میں کانا راجا" کی حیثیت رکھتا ہو اور سب لوگ اس سے مرعوب اور خوف زدہ ہوں، وہ اگر کسی نوجوان لڑکی کے بارے میں اس قسم کی تہلکہ خیز پیش گوئی کر دے تو اس لڑکی کے والدین لامحالہ اس کی بات ماننے پر تیار ہو جائیں گے۔ ملنگ کالیا جیسے عامل کامل انسانوں، خصوصاً مجبور انسانوں کی نفسیات سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہیں اور معاشرے کی دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھ کر اپنی مرضی اور منشا کے مطابق بھی نکال لیتے ہیں۔

ملنگ کالیا کے عزائم اور منصوبہ بندی کی تہ تک میں پہنچ چکا تھا۔ وہ بتول پر ہاتھ صاف کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو گھر سے بے دخل بھی کرنا چاہتا تھا۔ منظور حسین نے مجھے بتایا تھا کہ مکان کے خریدار کی حیثیت سے ملنگ نے ایک پارٹی کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ مجھے نہیں امید تھی کہ ایسا کوئی خریدار وجود بھی رکھتا ہوگا۔ یقیناً یہ ملنگ کالیا کی کوئی گہری چال ہو سکتی تھی تاہم اس سلسلے میں، میں نے ملنگ کو ٹٹولنا بھی ضروری جانا۔

"ملنگ جی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ عابدہ اور منظور کا مکان خریدنے کے لیے کوئی گاہک بھی لگ گیا ہے؟" میں نے سادہ لہجے میں دریافت کیا "اور وہ شخص تمہارا ہی کوئی جاننے والا ہے!"

وہ تصدیق کرتے ہوئے بولا "آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میرا ایک جاننے والا اس مکان کو خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اگر منظور حسین راضی ہو گیا تو میں ان کے درمیان سودا کروا دوں گا۔"

"تمہارے اس جاننے والا کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا "اور وہ کہاں رہتا ہے؟"

ملنگ کالیا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا "اس کا نام فیروز علی ہے اور وہ ایک نزدیکی گاؤں میں رہتا ہے۔"

"کیا تم نے فیروز کو بتا دیا ہے کہ وہ مکان آسیب زدہ ہے؟"

"نہیں" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"وہ کیوں بھئی؟" میں چونک اٹھا "یہ تو کھلی بے ایمانی ہوگی۔ اس سے حقیقت چھپا کر تم دھوکا دہی کے مرتکب ہو گے۔"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "ایسی کوئی بات نہیں۔ فیروز کو میں یہ مکان بہت کم پیسوں میں دلوا دوں گا۔ وہ خوش ہو جائے گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

میں اس کی خود غرضی اور شقی القلبی پر کھول کر رہ گیا تاہم میں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے بجائے پوچھا۔ "اور اگر بعد میں وہ آسیب زدہ مکان فیروز علی کے لیے مصیبت کا باعث بن گیا تو پھر وہ بے چارہ تمہیں بددعائیں دے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ مکان فیروز کے لیے مصیبت نہیں بنے گا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اس مکان کے حوالے سے آسیب وغیرہ کی بات بالکل غلط کی ہے" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "عابدہ کے مکان پر جادو ٹونے اور گندے عمل کا کوئی اثر نہیں ہے۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "ملک جی! آپ معاملات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے اسی لیے الجھن کا شکار ہو رہے ہیں۔"

"میں سمجھ نہیں سکا تو تم آسان الفاظ میں سمجھاؤ۔" میں اپنے چہرے پر انجان تاثرات سجاتے ہوئے بولا۔ حالانکہ میں یہ بہ خوبی جان گیا تھا کہ وہ مجھے کوئی نیا چکر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ دھیمی آواز میں گویا ہوا "ملک جی! بات دراصل یہ ہے کہ وہ مکان صرف منظور حسین اور اس کے گھر والوں کے لیے جادوئی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے تمام برے اثرات صرف اور صرف بتول اور اس کے لواحقین کے لیے ہیں۔ وہاں کوئی بھی نیا مکین آئے گا تو وہ ان سفلی اثرات سے متاثر نہیں ہوگا۔ اس قسم کے گندے عمل "نام مع والدہ" کے مخصوص افراد کے خلاف ہی کیے جاتے ہیں، دوسرے لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں۔"

وہ اپنی چرب زبانی اور عیاری سے خود کو بڑی خوب صورتی سے بچا لے گیا تھا۔ اس نے ایک ٹیکنیکل توجیہ پیش کی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں زیادہ جرح نہیں کی۔ میں چاہتا تو ملنگ کالیا کے ساتھ

سخت قسم کا رویّہ بھی اختیار کرسکتا تھا لیکن میں اس شاطر کو اسی کی بساط پر شہ مات دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ بہت سنبھل کر تحمل مزاجی سے اس کھیل کو کھیلا جائے اور میں یہی کر بھی رہا تھا۔ خوشیا مرغی چور کے حوالے سے بھی میرے پاس ملنگ کے خلاف اچھا خاصا مواد موجود تھا۔ میں اسے کسی خاص موقع پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

میں تھوڑی دیر مزید ملنگ کالیا کے ڈیرے پر رکا پھر حوالدار جمعہ خان کے ساتھ واپس آ گیا۔ اس ملاقات میں، میں نے ملنگ پر یہی تاثر چھوڑا تھا کہ مجھے اس پر تھوڑا شک تھا جو اب جاتا رہا تھا اور میں اس کی طرف سے مطمئن ہوکر وہاں سے جا رہا تھا۔ اس پر یہ تاثر قائم کرنا ضروری تھا تاکہ آئندہ جو بھی کرنا تھا وہ اپنے پروگرام کے مطابق کرتا چلا جائے اور میں رنگے ہاتھوں اسے چھاپنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ ایسے عیار اور چال باز لوگوں کو بہت گھیر کر مارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اس کی طرف سے آنکھ بند کر کے بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے چند سادہ پوش اہل کاروں کو ملنگ کالیا اور اس کے ڈیرے کی نگرانی پر مامور کردوں گا تاکہ اگر وہ غیر معمولی بات نوٹ کریں تو فوراً مجھے اطلاع دیں تاکہ کوئی فی الفور عملی قدم اٹھایا جاسکے۔

اس کے علاوہ میں پہلی فرصت میں بتول سے بھی ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا تھا اس سے ملنگ کالیا کے دعوے کی تصدیق یا تردید بھی ہو جاتی کہ بتول بھی اسے پسند کرتی تھی۔ علاوہ ازیں بتول سے مل کر میں یہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ کالیا ان کے گھر میں پہنچ کر کس قسم کے ہتھکنڈے آزما رہا ہے۔ ہر حوالے سے بتول سے میرا ملنا بہت اہم اور ضروری تھا۔

ہم ملنگ کے ڈیرے سے تھانے کی جانب روانہ ہوئے تو حوالدار جمعہ خان نے مجھ سے سوال کیا ”ملک صاحب! یہ ملنگ کسی بھی طور اعتماد کے قابل نہیں۔ اس کی کارستانیاں بہت واضح ہیں مگر پھر بھی آپ اسے شرافت سے چھوڑ آئے ہیں۔ اس کے خلاف کسی قسم کا کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟“

”ہاں، بہت ہی خاص الخاص وجہ ہے جمعہ خان!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”پہلی بات تو یہ ہے کہ ملنگ کی چال بازی اور مکاری کو پکڑنے کے لیے موجودہ حالات ابھی زیادہ سازگار نہیں ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ بھی ہمیں حاصل ہے اس کی بنا پر کوئی جان دار کیس نہیں بن سکتا۔ میں ملنگ کو بڑی مضبوط پکڑ میں لانا چاہتا ہوں، اس کے لیے اس کا رنگے ہاتھوں پکڑا جانا ضروری ہے۔ جس کے لیے میں نے لائحہ عمل سوچ لیا ہے۔ انشاء اللہ وہ بہت جلد ہماری گرفت میں ہوگا۔ میں کوئی عملی قدم

اٹھانے سے قبل ایک ملاقات بتول سے کرنا چاہتا ہوں اور ملنگ کالیا کی اس دوران میں کڑی نگرانی بھی بہت ضروری ہے۔“ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ جمعہ خان نے کہا ”ملنگ کالیا پر ہمیں کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔“

میں نے کہا ”کچھ بھی ہو، کالیا اس گاؤں میں ایک طاقت ور شخصیت کا حامل ہے اور یہاں کے وسنیک اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ ممکن ہے، کسی نازک موقع پر عابدہ اور منظور بھی اسی کی طرف داری پر اتر آئیں۔ ایسی صورت میں ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔ کوئی بھی قانونی کارروائی کرنے کے لیے مدعی کا تعاون بہت ضروری ہوتا ہے۔ میں بتول سے تفصیلی ملاقات کر کے حالات کی صحیح صورتِ حال کا اندازہ لگالوں پھر کوئی عملی قدم اٹھائیں گے۔“

ہم اسی نوعیت کی باتیں کرتے ہوئے تھانے آ گئے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دو ہوشیار قسم کے کانسٹیبلز کو اپنے پاس بلا کر انہیں ملنگ کالیا اور اس کے ڈیرے کی کڑی نگرانی کا فرض سونپ دیا۔ ان دونوں نے سادہ لباس میں رہتے ہوئے اپنی ڈیوٹی نبھانا تھی اور جیسے ہی کوئی غیر معمولی بات محسوس کرتے، ان میں سے ایک فوراً مجھے اطلاع دینے کے لیے تھانے آ جاتا۔ میں نے انہیں کسی بھی قسم کی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کی کھلی اجازت بھی دے دی تھی۔

یہ بندوبست کر کے میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے اپنے تمام مہرے اہم مقامات پر استادہ کر دیئے تھے اور ہر قسم کی چال چلنے کے لیے ذہنی طور پر چاق و چوبند تھا۔

☆☆☆

میں اس وقت اے ایس آئی شوکت مرزا کے ساتھ عابدہ خانم کے گھر کے صحن میں کھڑا تھا۔ ہمیں ہنگامی طور پر یہاں آنا پڑا تھا۔ حوالدار جمعہ خان طبیعت کی خرابی کے باعث اس روز چھٹی پر تھا لہٰذا میری ہمراہی کے فرائض اے ایس آئی شوکت مرزا کو ادا کرنا پڑ رہے تھے۔ ملنگ کالیا سے ملاقات کیے دو روز گزر چکے تھے۔ لیکن میں ابھی تک بتول سے ملنے نہیں جاسکا تھا اور اب ایک اطلاع پر ہمیں وہاں آنا پڑ گیا تھا۔

اس روز بھی میں تھانے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ منظور حسین روتا دھوتا میرے پاس پہنچ گیا تھا اور اس نے وحشت ناک اطلاع دی تھی وہ ہمیں اس کے گھر فوراً پہنچنے کا سبب بن گئی تھی۔ مذکورہ روز جب اس گھر کے مکین سو کر اٹھے تو گھر کے صحن میں ایک انسانی بازو پڑا ہوا تھا۔ اس بازو کو انسانی جسم کے شانے سے کاٹا گیا تھا اور اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کسی خوبصورت عورت کا

بازو تھا۔ مذکورہ نسوانی بازو صحن کے عین وسط میں نیم کے درخت کے پاس پڑا ہوا تھا۔

اس اطلاع پر جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں لگ بھگ ایک درجن مرد وزن اکٹھا ہو چکے تھے اور ان میں مختلف نوعیت کی چہ میگوئیاں جاری تھیں۔ عابدہ کا خیال تھا کہ وہ بازو ملنگ بابا کی پیش گوئی کی ایک کڑی تھی اور اب......اس کے بعد خدانخواستہ بتول کی باری تھی۔ غم واندوہ سے اس کا برا حال تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس وقت کالیا وہاں موجود ہوتا تو وہ بیٹی کی جان بچانے کے لیے کالیا کی مرضی اور خواہش کے مطابق فوراً بیٹی کا نکاح اس سے پڑھوا دیتی۔ اسی سے ملتی جلتی کیفیت منظور حسین کی بھی تھی۔ ایک شیطان صفت انسان نے ہنستے بستے گھر کو ماتم کدہ بند دیا تھا۔ وہ اپنی ہوس اور حرص پوری کرنے کے لیے اس گھر کے مکینوں کو اذیت اور کرب کے پل صراط سے گزار رہا تھا۔ اس لمحے میرے دل میں ملنگ کالیا کے لیے نفرت کی ایک لہر بلند ہوئی اور پلک جھپکتے میں وہ کڑوی کسیلی لہر ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کو چھو کر آسمان کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے دانتوں کو سختی سے بھینچتے ہوئے حتمی فیصلہ کیا کہ اب میں اس فراڈ عامل کامل کو ایک لمحے کی مہلت یا ڈھیل نہیں دوں گا۔

عابدہ کے گھر کے صحن میں موجود افراد میں سے ایک عورت نے انکشاف کیا ''یہ کٹا ہوا بازو تو زاہدہ کا ہے!''

میں نے چونک کر اس عورت کی طرف دیکھا پھر اس کی جانب جا کر استفسار کیا ''کون زاہدہ؟''

وہ بولی ''میں زاہدہ پروین کی بات کر رہی ہوں۔ ابھی کل ہی تو اسے دفنایا گیا ہے۔''

عورت کے انکشاف نے وہاں موجود لوگوں کو حیرت نما وحشت میں مبتلا کر دیا اور بازو کو بغور دیکھنے کے بعد انہوں نے اس عورت کے بیان کی تصدیق کر دی۔ تصدیق کرنے والوں میں عابدہ اور اس کا شوہر بھی شامل تھے۔ میں انکشاف کرنے والی عورت کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا لیکن میں یہاں اس کا نام لے کر ہی اس سے ہونے والی گفتگو کا احوال رقم کروں گا۔

''نصیب بی بی! تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ بازو زاہدہ پروین کا ہے جسے کل دفن کیا گیا تھا؟''

''میں نے اس کی چیچی (چھنگلی) سے پہچانا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

اس کی بات سن کر میں نے بازو کے ہاتھ کو دیکھا اور ہاتھ کی چھنگلی کو آدھا کٹا ہوا پایا۔ اس کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے نصیب بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار صاحب! دو سال پہلے زاہدہ کی چیچی (چھنگلی) پٹھے (چارا) کترنیوالے ٹوکے میں آ گئی تھی جس کی وجہ سے آدھی کٹ گئی تھی۔ پورے گاؤں میں کسی اور عورت کے ہاتھ کی کوئی انگلی اس

طرح کٹی ہوئی نہیں ملے گی۔ میں نے اسی نشانی سے زاہدہ کو پہچانا ہے۔''

مزید دس پندرہ منٹ میں مجھے جو حالات معلوم ہوئے ان کے مطابق زاہدہ پروین نامی وہ عورت دو روز پہلے ہیضے کے مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی اور گزشتہ روز اسے گاؤں کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا تھا۔ زاہدہ کا کٹا ہوا بازو عابدہ کے صحن میں پائے جانے کا ایک ہی واضح مطلب تھا اور وہ یہ کہ مرحومہ کی قبر کو کھول کر اس کی لاش کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ اس کے مردہ تن سے ایک بازو جدا کر لیا گیا تھا جسے ازاں بعد رات کے پچھلے پہر یا علی الصباح عابدہ کے گھر کے صحن میں پھینک دیا گیا تھا۔

میری فوری اور حتمی سوچ کے مطابق یہ کام ملنگ کالیا کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے یہ کام یا تو خود کیا تھا یا پھر اپنے چیلے حنیف کانا سے کروایا تھا۔ کالیا کا ڈیرا قبرستان سے لگا ہوا تھا۔ اس لیے یہ کام زیادہ مشکل نہیں تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ اسے اپنی قبیح پیش گوئی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا تاکہ وہ اپنی ہوس کو پورا کرنے کے لیے بتول کو حاصل کر سکے۔ نفسانی خواہشات کے غلام اس شخص کا منصوبہ دھیرے دھیرے اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا۔ بہر حال، کسی قبر کو کھول کر اس میں دفن کسی مردے کی بے حرمتی کرنا قابل دخل اندازی پولیس تھا اور میں اس مذموم حرکت پر ملنگ کالیا کے ساتھ کسی قسم کی رو رعایت کے حق میں نہیں تھا۔

میں نے موقع پر موجود افراد کو تسلی تشفی دی اور کہا ''آپ لوگ فکر نہ کریں، میں بہت جلد اس واقعے کے ذمے دار شخص کو عبرت ناک سزا دلواؤں گا۔''

مجھ سے سوال کیا گیا ''تھانے دار صاحب! اب اس بازو کا کیا کرنا ہے؟''

میں نے چند لمحات سوچنے کے بعد جواب دیا ''اس بازو کو دوبارہ زاہدہ پروین کی قبر میں دفن کیا جائے گا اور میں یہ کام اپنی نگرانی میں کرواؤں گا۔ اس کے لیے آپ لوگوں کو تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔ میں بتول سے مل کر کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں پھر ہم سب قبرستان کی طرف چلیں گے۔''

وہاں موجود افراد نے میری تجویز کو سراہا۔ اسی اثنا میں مجھے معلوم ہوا کہ چند لمحے پہلے جس شخص نے مجھ سے بازو کے بارے میں سوال کیا تھا وہ مرحومہ زاہدہ پروین کا شوہر محمد طفیل تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی موقع پر پہنچا تھا۔

میں آج تمام معاملات کو بہ خیر و خوبی نمٹا لینا چاہتا تھا، بتول سے ملاقات کے بعد مجھے سیدھا قبرستان جانا تھا تاکہ دیگر امور کے ساتھ ساتھ ملنگ کالیا کی ''مزاج پرسی'' بھی کر سکوں تاہم اس سلسلے میں میرا ذہن الجھن کا شکار تھا۔ میں نے دو روز پہلے دو سادہ لباس کانسٹیبلز کو قبرستان کے گرد و نواح میں

تعینات کیا تھا جنہیں ملنگ کالیا اور اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا تھی لیکن ابھی تک ان کی طرف سے کوئی مفید اطلاع نہیں ملی تھی۔ زاہدہ پروین کی قبر کھول کر اگر اس کا بازو کاٹ کر نکال لیا گیا تھا تو یہ بات میرے آدمیوں سے پوشیدہ نہیں رہنا چاہیے تھی۔ قدیر اور نصیر نامی وہ دونوں کانسٹیبلز میرے آزمائے ہوئے اور بھروسے کے آدمی تھے۔ میرا ذہن اس بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔

میں نے عابدہ خانم سے کہا ”میں فوری طور پر بتول سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کس کمرے میں ہے؟“

اس گھر کے پچھلے حصے میں دو کمرے پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ عابدہ نے مغربی جانب والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”بتول اس کمرے میں ہے۔“

میں نے اے ایس آئی شوکت مرزا کو وہیں صحن میں رکنے کو کہا اور مذکورہ کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ عابدہ بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ میں نے واضح الفاظ میں اسے باور کرایا کہ بتول سے تنہائی میں گفتگو کروں گا۔ اسے مجھے وہاں پہنچا کر واپس آنا ہوگا۔

وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”ضرور، ضرور“ پھر اس نے غم انگیز انداز میں دریافت کیا ”تھانے دار صاحب! میری بتول بچ جائے گی نا؟“

”اسے کچھ نہیں ہوگا“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”ملنگ جی کی پیش گوئی کا آخری مرحلہ بھی اب تو گزر گیا ہے۔“ وہ پُرسوز لہجے میں گویا ہوئی ”اس کے بعد تو......“

اس نے شکستہ احساس کے ساتھ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں رک گیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پُر وثوق انداز میں کہا ”عابدہ! آج تمہاری بیٹی کی مصیبت کا آخری دن ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ آج کے بعد اس کی بیماری باقی رہے گی اور نہ ہی اس گھر پر کسی قسم کے جادوئی اثرات کا کوئی ثبوت ملے گا۔“

”آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟“ یہ سوال منظور حسین نے کیا تھا۔ وہ ہمارے عقب میں دبے قدموں چلتے ہوئے برآمدے تک آ پہنچا تھا۔

میں نے منظور کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا ”آج میں ملنگ کالیا کا قلع قمع کر دوں گا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“ وہ حماقت آمیز سادگی سے مستفسر ہوا۔

میں نے کہا ”وہ ہوتا ہے......ستیاناس......بلکہ سوا ستیاناس۔“

”یقیناً آپ کو ملنگ جی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مل گیا ہے؟“

”ہاں“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”ملنگ کے سیاہ کرتوتوں کے خلاف میرے پاس کچھ شہادتیں جمع ہوئی ہیں اور باقی حتمی ثبوت بتول سے بات چیت کے بعد مجھے حاصل ہو جائیں گے۔ آپ لوگ دیکھتے جائیں، آگے آگے کیا ہوتا ہے۔“

وہ میرے عزائم اور لہجے کی قطعیت کو دیکھتے ہوئے وہیں رک گئے اور عابدہ نے مطمئن لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے تھانے دار صاحب! آپ بتول سے جو پوچھنا چاہتے ہیں وہ پوچھ لیں۔“

میں نے کہا ”عابدہ تم مجھے بتول کے پاس پہنچا کر واپس آ جانا۔“

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور میں چند ساعتوں کے بعد بتول کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ بتول ایک رنگ دار چارپائی پر دراز تھی۔ میری آمد کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور عابدہ نے اسے سرہانے کی طرف سے ٹیک لگا کر بیٹھنے میں مدد دی تھی۔ عابدہ نے بتول کو میرے بارے میں دو چار جملوں میں بتایا اور کمرے سے نکل گئی۔

وہ دن کا آغاز تھا اس لیے کمرے میں اچھا خاصا اجالا ہو رہا تھا۔ میں نے تنقیدی اور تجزیاتی نظر سے بہ غور بتول کا جائزہ لیا۔ جیسا کہ مجھے معلوم تھا، وہ بیس سال کی ایک حسین و جمیل دوشیزہ تھی مگر اس وقت اس کا حسن و جمال اور شگفتگی و تازگی تو نچڑ چکی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آتی تھی۔ میں نے اس کی موجودہ حالت کا باریک بینی سے مشاہدہ کر کے یہ بہ خوبی اندازہ لگا لیا کہ چند ماہ پہلے شادابی و رعنائی کا شاہکار رہی ہوگی مگر شیطان خصلت ہوس پرست ملنگ کالیا نے اپنا دھندا چکانے اور اس کو ”حاصل“ کرنے کے لیے اپنے مکروہ منصوبے کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ علاج و معالجے کے نام پر کالیا نے بتول کو جو ادویہ اور محلولات استعمال کروائے تھے یہ سب اسی کے بداثرات کا نتیجہ تھا۔

حالات حاضرہ کی چند باتیں کرنے کے بعد میں نے براہ راست بتول سے نہایت ہی اہم سوال کر ڈالا۔ میں نے پوچھا ”بیٹی! کالیا نے مجھے بتایا ہے کہ تم بھی اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو۔ اس بات میں کس حد تک حقیقت ہے؟“

اس کی کھنڈر کی طرح ویران آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ میرے سوال کے جواب میں یہ ردعمل فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اس حوالے سے اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور رونے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرح میں اس کے اندر کے درد کو آنسوؤں کے ذریعے اس کے وجود سے خارج کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کا قلبی و ذہنی دباؤ ختم نہیں تو کم ضرور ہو جاتا اور وہ

میرے سوالات کے زیادہ معقول جواب دے سکتی۔

چند لمحات تک آنسو بہانے کے بعد وہ نارمل ہوگئی تھی تو میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا ''بتول بیٹی! تم نے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''تھانے دار صاحب! آپ نے مجھے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا تو میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی ''اگر آپ مجھے واقعی بیٹی کی طرح سمجھتے ہیں تو کسی طرح اس شیطان کالیا سے ہماری جان چھڑا دیں۔ ہم آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔''

میں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا ''میں نے تمہیں بیٹی کہا ہے تو سمجھو تم میری بیٹی ہی ہو اور اسی لمحے سے تم کالیا کی طرف سے قطعی بے فکر ہو جاؤ۔ بس سمجھ لو آج کے بعد سے تم سب کی مصیبتیں ٹل گئیں۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''اب تم میرے سوال کا جواب دو؟''

''آپ نے جو کچھ پوچھا ہے اس میں رتی بھر بھی حقیقت نہیں۔'' وہ قدرے حوصلہ مندانہ انداز میں بولی۔

میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے' ملنگ کالیا نے تمہارے حوالے سے جھوٹ بولا ہے!''

''وہ ایک نمبر کا جھوٹا اور دھوکے باز ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی ''مجھ سے وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میں نے اس سے شادی کے لیے رضامندی ظاہر نہیں کی تو وہ اپنے جادو اور عملیات کے ذریعے میرے ماں باپ اور چھوٹے بھائیوں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر دے گا۔ دوسری جانب وہ میری اماں اور ابا کو یہ کہہ کر سہاتا اور لرزاتا رہتا ہے کہ اگر انہوں نے شرافت سے میری شادی اس سے نہیں کی تو میں خون تھوکتی ہوئی ان کی نظروں کے سامنے جان دے دوں گی۔ مزے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ یہ دھمکیاں ہمیں براہ راست نہیں دیتا بلکہ وہ سب کچھ کالے جادو اور گندے عمل کی آڑ میں کہتا ہے۔ اس کے مطابق پھوپھی آسیہ نے مجھ پر اور اس گھر پر بہت سخت قسم کا سفلی عمل کروایا ہوا ہے جس سے نجات کی واحد راہ کالیا کی باتیں ماننے کی صورت میں نکلتی ہے۔ اب تو آپ تمام صورتِ حال سمجھ گئے ہوں گے!''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''بالکل' میں سب سمجھ گیا ہوں مگر ایک بات تو بتاؤ بیٹی!''

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ''تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تم شروع ہی سے ملنگ کالیا کے فراڈ کو سمجھ رہی ہو۔ اس کے باوجود بھی تم اس سے علاج کرواتی رہی ہو؟''

''یہ کڑوے کسیلے محلول اور الٹی سیدھی پھنکیاں استعمال کرنے میں میری مرضی شامل نہیں۔'' وہ اپنے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات سجاتے ہوئے بولی ''یہ سب کچھ اماں کے حکم پر مجھے کرنا پڑتا ہے۔ وہ ملنگ کالیا کی بہت معتقد ہے۔''

''اسی اندھے اعتماد اور اعتقاد نے تو تمہارا بیڑا غرق کیا ہے۔'' میں نے قدرے تلخی سے کہا ''لیکن فکر نہ کرو' اب عابدہ کی آنکھیں بھی کھل چکی ہیں۔ وہ بھی کالیا کی حقیقت کو بڑی حد تک سمجھ چکی ہے۔''

وہ بولی ''آج صبح ہی سے ہمارے گھر میں قیامت آئی ہوئی ہے۔ کسی عورت کا ایک بازو ہمارے صحن میں پڑا پایا گیا ہے۔ اس مردود نے کچھ اس قسم کی پیش گوئی کی تھی۔''

میں نے بتول کو بتایا کہ وہ بازو دو روز قبل وفات پانے والی زاہدہ پروین کا ہے جسے خوف و ہراس پیدا کرنے کے لیے ملنگ کالیا نے اس کی لاش سے جدا کر کے اس کے گھر کے صحن میں پھینکا یا پھنکوایا ہے۔ بازو کی شناخت والی بات ابھی اس تک نہیں پہنچی تھی۔ میری زبان سے زاہدہ پروین کا نام سنتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر اشک بار ہوگئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ زاہدہ سے بتول کی اچھی خاصی دوستی رہی تھی۔

میں مزید تھوڑی دیر وہاں رک کر بتول سے مختلف قسم کے سوالات کرتا رہا۔ ان سوالات کے اس نے حسبِ توقع اور مناسب جواب دیے۔ کالیا جب بھی بتول کی جھاڑ پھونک کے لیے آتا تھا تو ہوس زدہ نظر سے اس کے وجود کا ایکس رے کرتا رہتا تھا۔ اس کی آواز شہوت زدہ اور خیالات انتہائی بیہودہ ہوتے تھے۔ بتول کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی بھوکا بھیڑیا ہو جو نظر کے نکیلے دانتوں سے اسے کچا چبا رہا ہو۔

میں بتول والے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ اس دوران میں زاہدہ پروین کے بازو کو ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر ایک چارپائی پر رکھ دیا گیا تھا اور سب میرے آئندہ احکامات کے منتظر تھے۔ میرا اشارہ پا کر وہ بازو کے ساتھ قبرستان کی طرف چل پڑے۔ کپڑے میں لپٹا ہوا بازو زاہدہ کے شوہر طفیل نے اپنے بازوؤں پر اٹھا رکھا تھا۔

ہم عابدہ کے گھر سے نکل کر قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر آئے ہی تھے کہ میری نظر نصیر پر پڑی۔ نصیر ان دو کانسٹیبلز میں سے ایک تھا جنہیں میں نے ملنگ کالیا کی نگرانی پر مامور کیا تھا۔ نصیر تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس کا بوکھلاہٹ آمیز انداز دیکھ کر میرا ماتھا

ٹھنکا۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ نصیر کوئی نہایت ہی اہم اور سنسنی خیز خبر لے کر آ رہا ہے۔

میں نے سب کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور نصیر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ہم دونوں کا ملاپ باقی افراد سے لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر ہوا۔ نصیر نے مجھے سلیوٹ کیا اور ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میں ابھی تھانے سے آ رہا تھا۔''

''تم تھانے کیا لینے پہنچ گئے تھے۔ میں نے تمہیں کالیا کی نگرانی......؟''

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ''میں آپ کو ایک اہم اطلاع پہنچانے تھانے گیا تھا مگر وہاں سے پتا چلا کہ آپ اسی گاؤں آئے ہوئے ہیں تو پھر میں سیدھا ادھر ہی آ گیا ہوں۔''

''وہ اہم اطلاع کیا ہے؟'' میں فوراً مطلب کی بات پر آ گیا۔

وہ دور کھڑے افراد پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔

''ملک صاحب! وہ اہم اطلاع ملنگ کالیا سے متعلق ہے۔ وہ ہماری توقع سے کہیں زیا خطرناک شخص ہے۔''

''تم نے اس کی کون سی خطرناکی دیکھ لی؟''

''گزشتہ رات ہم نے قبرستان میں ایک ہولناک منظر مشاہدہ کیا ہے۔'' نصیر نے جھرجھری لیتے ہوئے بتایا ''ملنگ کالیا اور اس کے چیلے حنیف کانا نے ایک تازہ قبر کو کھول کر اس میں سے کچھ نکالا تھا۔ ہم دن میں یہ دیکھ چکے تھے کہ اس قبر میں کسی عورت کو دفنایا گیا تھا۔''

''کالیا اینڈ کمپنی نے اس قبر سے کیا نکالا تھا؟'' میں نے ان جان بنتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو معلوم نہیں ہو سکا۔'' وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا ''تاہم انہوں نے وہاں سے جو کچھ حاصل کیا تھا اسے ایک تھیلے میں ڈال کر وہ ڈیرے کے اندرونی حصے میں لے گئے تھے۔ میں اور ق اس واقعے پر تبادلہ خیالات کر ہی رہے تھے کہ حنیف کانا ڈیرے سے نکلتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ وہی تھیلا تھا جو کچھ دیر پہلے قبرستان سے وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ صبح کاذب کا وقت تھا۔ قدیر درختوں کے جھنڈ میں چھپا ڈیرے کی نگرانی کرتا رہا اور میں مناسب فاصلہ رکھ کر حنیف کانے کا تعا کرنے لگا۔''

نصیر سانس لینے کی خاطر چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''یہ تعاقب عا خانم کے گھر کے قریب پہنچ کر ختم ہوا۔ میں ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر حنیف کانے کی کارر

دیکھنے لگا۔ حنیف کانے نے محتاط نظر سے چاروں طرف دیکھ کر اپنی تسلی کی پھر اس نے کپڑے کے تھیلے سے کوئی چیز نکال کر بہ آہستگی عابدہ کے گھر کے صحن کی طرف اچھال دی۔ اندھیرے کے باعث میں اس ''چیز'' کو شناخت نہ کر سکا تاہم مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی لکڑی وغیرہ ہو۔ پھر اس سے قبل حنیف واپسی کا سفر اختیار کرتا' میں راستہ بدل کر اس جانب بڑھ گیا جدھر قدیر موجود تھا۔

''میں نے قدیر کو ساری کتھا کہہ سنائی اور ہم نے باہمی مشاورت سے یہ فیصلہ کیا کہ فی الفور آپ کو اس واقعے کی اطلاع دی جائے۔ اس وقت تک سورج نکل آیا تھا میں اجالا ہوتے ہی آپ کی طرف روانہ ہو گیا مگر جب میں تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ آپ اسی طرف آئے ہوئے ہیں۔''

کانسٹیبل نصیر کا بیان میرے شک کی تصدیق کر رہا تھا۔ ملنگ کالیا کی پول پٹی بالکل کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ اب اسے چھاپنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ جمع ہو چکا تھا میں نے نصیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور کچھ۔ کوئی اور اہم بات؟''

وہ چونک کر بولا ''ہاں'' ایک بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔'' اس کا انداز ایسا تھا جیسے یہ بات اسے ابھی یاد آئی ہو۔ وہ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ''اس ڈیرے پر ملنگ کالیا اور حنیف کانا کے علاوہ بھی ایک اور شخص موجود ہے۔ ہم نے دو تین مرتبہ اس پراسرار شخص کی جھلک دیکھی ہے۔''

نصیر نے انکشاف عام سے انداز میں کیا تھا تاہم میرے لیے یہ کسی سنسنی خیز خبر سے کم نہیں تھا۔ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''وہ کون شخص ہے بھئی...... اور تم نے اس کے لیے پراسرار کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے؟''

نصیر بولا ''میں اس شخص کو جانتا ہوں' نہ ہی اس کا نام مجھے معلوم ہے اور...... پراسرار میں نے اسے اس حوالے سے کہا ہے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چھپ کر وہاں رہ رہا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات سے لگتا ہے جیسے وہ وہاں اپنی موجودگی کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اس کا حلیہ بھی عجیب سا ہے۔ بے ترتیب سی داڑھی مونچھیں' سرخ سرخ آنکھیں اور قدرے خستہ لباس۔ مجھے تو وہ کوئی جرائم پیشہ شخص لگتا ہے۔''

کانسٹیبل نصیر کی کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ یہ باتیں وہاں موجود کسی غیر متعلق شخص سے نہ کرے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا پھر میں نے

اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا اور ہمارا قافلہ قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔

اے ایس آئی شوکت مرزا میرے نزدیک آ گیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولا ”ملک صاحب! خیر تو ہے۔ مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے!“

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا ”ہمیں فوری طور پر ملنگ کالیا کے آستانے پر ریڈ کر کے وہاں موجود ہر شخص کو اپنی حراست میں لینا ہے۔“

”جو حکم ملک صاحب۔“ وہ چوکس نظر سے چاروں جانب دیکھتے ہوئے بولا ”سادہ پوش نگرار کانسٹیبلوں کے پاس گرفتاری کے لیے مناسب سامان موجود ہے، ہم بھی ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح لیس ہیں۔ آپ احکامات صادر کریں۔“

میں نے کہا ”مجھے امید ہے، ہم کسی خون خرابے کے بغیر ملنگ کالیا اور اس کے ساتھیوں پر قابو پالیں گے۔ اس کے لیے ہمیں صابرانہ حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔“

”آپ حکمت عملی وضاحت کریں!“

میں نے کہا ”میں نصیر کو واپس اس کی ”ڈیوٹی“ کے مقام پر بھیج رہا ہوں، اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ دونوں ملنگ کالیا اور اس کے ڈیرے پر موجود ہر شخص کو اپنی نظروں میں رکھیں۔ ہم گاؤں والوں کے ساتھ سیدھا قبرستان جائیں گے اور نہایت ہی عام اور فطری انداز میں زاہدہ پروین کے بازو کو سپردِ قبر کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد ہم دونوں ملنگ کالیا کے آستانے کا رخ کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اے ایس آئی نے تائیدی انداز میں کہا ”اور اگر قبرستان والی مصروفیت کے دوران میں ملنگ یا اس کے چیلے حنیف کانے سے ٹاکرا ہو گیا تو ہماری پالیسی کیا ہونا چاہیے؟“

میں نے بتایا ”ہماری پالیسی یہ ہوگی کہ ہمیں کالیا یا اس کے کسی آدمی پر کسی قسم کا شک نہیں۔ ہمارے عمل سے ”کالیا دشمنی“ کی ایک جھلک بھی ظاہر نہیں ہوگی اور اس طرح ہم بہ آسانی اس کے ڈیرے میں گھس کر اس کا شکار کر سکیں گے۔“

”بالکل سمجھ گیا۔“ اے ایس آئی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”اب آپ نصیر کو خصوصی ہدایت کے ساتھ روانہ کر دیں۔“

میں نے نصیر کو سمجھا کر رخصت کر دیا۔ وہ ایک دوسرے راستے سے قدیر کے پاس جانے کے لیے ہم سے جدا ہو گیا۔

میری حکمت عملی بڑا مثبت رنگ لائی تھی۔ زاہدہ پروین کے بازو کو اس کے مدفن میں اتارا ہی جا رہا تھا کہ حنیف کانا وہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے کریدنے والے انداز میں سوال کرنے لگا تو میں سمجھ گیا کہ کالیا نے باہر کی صورت حال جاننے کے لیے اسے وہاں بھیجا ہوگا۔ میں نے حنیف کانا کو کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے وہ کسی قسم کی تشویش میں مبتلا ہو جاتا۔ وہ مطمئن ہو کر جانے لگا تو میں نے اس کے گرو کی خیر خیریت بھی پوچھ لی۔ اس نے میری توقع کے مطابق جواب دیا۔

”ملنگ جی دو دن کے لیے جھنگ گئے ہوئے ہیں۔“

مجھے بھی امید تھی کہ وہ کالیا کی غیر موجودگی کا بہانہ کرے گا۔ میں نے مایوس کن لہجے میں کہا ”پھر تو آج اس سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ میں نے سوچا تھا، جب یہاں تک آ ہی گیا ہوں تو ملنگ سے ملتا چلوں۔“

”وہ تو جھنگ سے پرسوں آئیں گے۔“ حنیف نے اپنی یک چشم میں عیاری کی چمک پیدا کرتے ہوئے کہا ”ویسے میں ملنگ جی کو آپ کا سلام کہہ دوں گا۔“

”ضرور ضرور۔“ میں نے خوش دلی سے کہا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں چھپ کر ہمیں ضرور واچ کر رہا ہوگا۔ قبرستان والی کارروائی کے حوالے سے میں نے اسے بتایا کہ کسی بدبخت نے زاہدہ پروین کا بازو کاٹ کر باہر کھیتوں میں پھینک دیا تھا جسے دوبارہ دفن کرنے کے لیے گاؤں والوں نے پولیس کو بلا لیا تھا جس کی وجہ سے مجھے آنا پڑا۔

میری وضاحت پر حنیف کانا نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا تھا ”ملک صاحب! یہ کسی بدبخت جانور کی کارستانی ہو سکتی ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دل ہی دل میں کہا...... تم سے زیادہ بدبخت جانور اور کون ہو سکتا ہے۔ بہرحال وہ بہ ظاہر مطمئن ہو کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

میں اور اے ایس آئی بھی دیگر افراد کے ساتھ قبرستان سے نکل کر گاؤں کی جانب بڑھ گئے۔ میں کالیا اور حنیف کانا کو یہی تاثر دینا چاہتا تھا کہ کسی بھی طور ہمارا دھیان ان کی طرف نہیں لگا ہوا۔

آدھے گھنٹے کے بعد میں اور اے ایس آئی شوکت مرزا کئی راستے بدل کر ایک مرتبہ پھر ملنگ کالیا کے آستانے پر کھڑے تھے۔ ڈیرے کا داخلی دروازہ کھلا تھا۔ ہم نے دستک وغیرہ کا تکلف کیے بغیر اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور اگلے ہی لمحے میں ہم دونوں ڈیرے کے احاطے میں تھے۔

نیچی چھتوں والے دو کمروں میں سے ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں ملنگ

نے اپنا حجرہ بنا رکھا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے والے کمرے میں وہ شخص موجود تھا جس کے بارے میں نصیر نے مجھے بتایا تھا۔ وہ وضع قطع اور حلیے سے واقعی جرم پیشہ دکھائی دیتا تھا۔

ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ اس کے چونکنے کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ ہم اس وقت سرکاری لباس میں تھے۔ اس مشکوک شخص کا ہمیں دیکھ کر بوکھلا جانا نصیر کے اندازے کی تصدیق بھی کرتا تھا کہ وہ شخص کوئی مجرم ہو سکتا تھا۔

میرے اشارے پر شوکت مرزا نے چیتے کے مانند جست بھری اور آن واحد میں متذکرہ شخص کو بے بس کر کے ہتھکڑی پہنا دی۔

اسی وقت دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہاں دو چہرے ہمارے دیدار کے لیے ابھرے۔ ان میں ایک ملنگ کالیا اور دوسرا حنیف کانا کا چہرہ تھا اور ان چہروں پر بے انداز حیرت آمیز وحشت برس رہی تھی۔ ان کی آنکھیں ساکت اور زبانیں گنگ ہو کر رہ گئیں تھیں۔

میں نے ملنگ کالیا کی طرف دیکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا ''قبلہ! آپ تو جھنگ گئے ہوئے تھے۔ آپ کی تشریف آوری کب ہوئی؟''

اس نے میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے چیلے حنیف کانا کی اکلوتی آنکھ میں دیکھا پھر الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔

اسی وقت میں نے یک چشم خبیث صورت حنیف کانے کو اپنی اکلوتی آنکھ سے اپنے عقب میں تکتے ہوئے دیکھا۔ بے اختیار میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور میرے سینے سے اطمینان کی ایک طویل اور گہری سانس خارج ہوئی۔ وہاں کھلے ہوئے دروازے میں نصیر اور قدیر ریڈ الرٹ کھڑے میرے حکم کے منتظر تھے۔

میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر انہیں حکم دیا کہ وہ ملنگ اور اس کے تلنگ کو فوراً گرفتار کر لیں۔

قدیر اور نصیر لپک کر ان دونوں کی طرف بڑھے۔ کالیا اور کانا نے فرار ہونے کی کوشش کی مگر میں ان کے راستے کی دیوار بن گیا اور ان دونوں کو لات گھونسے پر رکھ لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ''پیر و مرید'' کی کلائیاں سند یافتہ آہنی زیور سے آراستہ ہو چکی تھیں۔

ان تینوں زیر حراست شیطانوں کو تھپڑ اور ٹھڈے مارتے ہوئے ہم تھانے لے آئے۔ اس روز میرے پیشہ ورانہ ریکارڈ میں ایک اور کامیابی کا اضافہ ہو چکا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میری

اس کامیابی میں تھانے کے دیگر عملے کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔

☆☆☆

جب کوئی مجرم ٹھوس ثبوت کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان کھلوانا چنداں مشکل نہیں رہتا۔ ہمارے ہتھے تو ایک نہیں تین تین مجرم لگے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ اچھل کود ملنگ کالیا ہی مچا رہا تھا۔ پہلے وہ مجھے دوستانہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ میں کسی غلط فہمی میں انہیں پکڑ لایا ہوں لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ میں انہیں پہلی فرصت میں جانے کی اجازت دے دوں۔

اس کے نہایت ہی واہیات مشورے کے جواب میں' میں نے اس کے سیاہ کرتوتوں کی تفصیل اس کے سامنے رکھ دی۔ جس میں ٹکٹکڑی چور خوشی محمد عرف خوشیا کا ذکر بھی آیا اور بتول کے تاثرات بھی زیر بحث آئے۔ ازیں علاوہ میرے کانسٹیبل نصیر کا آنکھوں دیکھا احوال' حنیف کانا سے متعلق بھی سامنے آیا جس نے حنیف کو کٹا ہوا بازو عابدہ کے گھر میں پھینکتے ہوئے دیکھا تھا پھر نصیر اور قدیر نے ان گرو چیلے کو زاہدہ کی قبر کھولتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

میں نے زہرخند لہجے میں کہا ''ملنگ کالیا! میں ان چار افراد کو تمہارے خلاف بہ طور گواہ عدالت میں پیش کروں گا۔ جب تم قانون کی گرفت میں نظر آؤ گے تو گاؤں کے دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ملے گا اور ممکن ہے' تمہارے متعلق کچھ مزید شرم ناک انکشافات ہوں!''

میں نے اس سیاہ کار کو آئینہ دکھایا تو وہ بپھر گیا اور مجھے اپنے عملیات وغیرہ کی طاقت سے ڈرانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''ملنگ کالیا! تم تو ایک جھوٹے عامل کامل اور بے بس و لاچار افراد کی نفسیاتی کمزوریوں سے کھیل کر اپنا دھندا چمکا رہے ہو۔ تمہارے عملیات کی قوت میرا کیا بگاڑ لے گی۔ تم نے ابھی تک ہماری تفتیش کی قوت کا مزہ نہیں چکھا۔ آج میں تمہیں تھانے کے ''عملیات'' کا نظارہ کراؤں گا جسے دیکھ کر تمہاری کمینی نگاہ پتھرا جائے گی' تمہارا حریص ذہن جامد ہو جائے گا اور تمہارا ذلیل دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ ہمیں بھی بہت سے جادوئی کمالات دکھانا آتے ہیں۔ تم ہماری تحویل میں ''بہت کچھ'' سیکھو گے۔''

وہ میرے تپتے ہوئے لہجے اور ہتک آمیز انداز سے سلگ اٹھا اور خالی خولی دھمکیوں کے بجائے مغلظات پر اتر آیا۔ میں نے اس کی اوقات کے مطابق اس سے سلوک کرتے ہوئے اسے حوالدار

جمعہ خان کے حوالے کردیا اور کہا۔

’’جمعہ خان! ملنگ کالیا اور اس کے دونوں ساتھی میں تمہاری تحویل میں دے رہا ہوں۔تم کتنی دیر میں انہیں ’’راہ راست‘‘ پر لا سکتے ہو؟‘‘

’’اگر مجھے میری ’’صلاحیتیں‘‘ آزمانے کی کھلی اجازت ہے تو میں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں ان کی زبانوں کو ٹیپ ریکارڈ کا اسپیکر بنادوں گا۔‘‘ جمعہ خان سینہ پھلاتے ہوئے بولا اور ایسی نظر سے ان تینوں کو دیکھنے لگا جیسے قصاب بکری کو دیکھتا ہے۔

’’مجھے نتائج چاہیے...... حتمی نتائج۔.......... میں نے قطعیت سے کہا ’’تم چاہے جو کچھ بھی آزماؤ‘‘

حوالدار جمعہ خان ان تینوں کو ہانک کر کشاں کشاں ٹرائل روم میں لے گیا۔ اس نے اپنی معاونت کے لیے دو ہٹے کٹے سپاہیوں کو بھی بلا لیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تفتیشی کمرے‘ المعروف بہ ڈرائنگ روم (ٹرائل روم) کی جانب سے تین انسانوں کے‘ ذبح کیے ہوئے بکروں کے مانند ڈکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔

حسب وعدہ ایک گھنٹے کے اندر جمعہ خان نے اپنے کمال مہارت سے تین زبانوں پر لگے تالوں کو کھٹاک سے کھول ڈالا تھا۔ ان تینوں نابکاروں نے جو بیان دیا وہ مجموعی طور پر ایک ہی جیسا تھا اور انہیں سنگین نوعیت کے مجرم ثابت کرتا تھا۔ اس میں سب سے اہم اور چونکا دینے والی حیثیت اس تیسرے شخص کی تھی جس نے ملنگ کالیا کے ڈیرے میں پناہ لے رکھی تھی۔

اس شخص کا نام بخت احمد عرف بختا تھا۔ اس کی اصلیت بہت چونکا دینے والی تھی۔ بختا اور اس کے ساتھی سکندر نے دس بارہ سال پہلے کسی گاؤں کے چوہدری کی حویلی میں ایک کامیاب ڈکیتی کی تھی جس میں کرنسی نوٹوں کے علاوہ طلائی زیورات‘ قیمتی پتھر اور سونے چاندی کی اینٹیں (بسکٹ) ان کے ہاتھ لگے تھے۔ وہ مسروقہ مال کے ساتھ گاؤں گاؤں ہوتے ہوئے عابدہ والے گاؤں میں پہنچے اور ایک گھر میں قیام کیا جہاں آج کل عابدہ اور منظور حسین کی رہائش تھی۔ دس بارہ سال پہلے وہ گھر ایک چار دیواری اور اکلوتے کچے کمرے پر مشتمل تھا۔ بختا اور سکندر نے اس غیر آباد گھر کے کمرے کا فرش کھود کر ایک گہرا گڑھا بنایا اور مسروقہ کو بہ حفاظت موم جامہ کر کے گڑھے میں دبا کر اوپر سے مٹی برابر کر دی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جب وہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو مناسب موقع دیکھ کر وہ اس غیر آباد گھر سے اپنی ’’امانت‘‘ نکال لے جائیں گے۔ اس زمانے میں اس گھر میں کسی کی بھی رہائش نہیں تھی۔

یہ ضروری نہیں کہ انسان جو سوچتا ہے وہ عملی طور پر ہو بھی جائے۔ ان دونوں کے ساتھ بھی عجیب واقعات پیش آئے۔ مسروقہ مال کو زمین اندوز کیے ابھی دس روز بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک جنگل میں سفر کے دوران میں سکندر کو ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا اور وہ موقع پر ہی جان ہار بیٹھا۔ بختا اس کی لاش کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ وہ دل میں خوش بھی تھا کہ اب وہ مال مسروقہ کا واحد مالک تھا۔ بیش بہا خزانے کی ملکیت کسی بھی شخص کو شاداں کر سکتی ہے۔

اس کی یہ خوشی زیادہ پائیدار ثابت نہ ہو سکی اور ایک قصبے سے دوسرے قصبے سفر کرتے ہوئے وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس کی شناخت ہو گئی تو اسے جان چھڑانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس موقع پر اس نے شاطرانہ ذہن نے ایک چال چلی اور پولیس کی تحویل میں اس نے بیان دیا کہ اس کا ساتھی سکندر اسے بھی دھوکا دے کر مال مسروقہ کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا تھا۔

ایک مجرم پولیس کے ہتھے چڑھا تھا‘ اس نے مناسب کارروائی کے بعد اسے عدالت کے حوالے کر دیا۔ جس چوہدری کی حویلی میں ڈکیتی ہوئی تھی اس نے اپنا زور استعمال کر کے بختا کو عدالت سے ایک طویل سزا دلوادی۔ جیل میں قید کے دوران میں بھی جیل کا عملہ اس سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا رہا مگر بختا نے کسی مرحلے پر اپنا بیان نہیں بدلا اور اپنی قید کے دن گن گن کر گزارنے لگا۔ وہ اس امید پر مصائب جھیلتا رہا کہ ایک نہ ایک دن وہ رہا ہو جائے گا پھر ’’مدفن خزانے‘‘ تک پہنچنے سے اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔

الغرض جب بختا رہا ہو کہ باہر آیا تو دنیا میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ وہ چند روز بعد اپنے ’’ٹارگٹ‘‘ پر پہنچا تو وہ ویران اور غیر آباد مکان اب مختلف شکل میں اس کے سامنے تھا۔ اس دوران میں لگ بھگ پانچ سال قبل منظور نے وہ مکان خرید کر اس میں اچھی خاصی تعمیر کروا ڈالی تھی۔ اب وہ کچے کمرے والا چار دیواری پر مشتمل کوئی غیر آباد مکان نہیں رہا تھا بلکہ دو پختہ کمروں‘ ایک برآمدے‘ ایک بیٹھک اور کریانے کی ایک دکان کا اس میں اضافہ ہو چکا تھا۔

بختا کو اس صورت حال نے پریشان کر دیا۔ وہ بہ ہر طور اس مکان میں گڑا ہوا مال مسروقہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس مقصد کو پانے کے لیے پورے گاؤں کا دورہ کیا اور بالآخر اسے اپنے مطلب کا ایک آدمی مل گیا۔ مذکورہ شخص ملنگ کالیا تھا۔

دو جرائم پیشہ افراد کے ذہن مل کر کام کرنے لگے تو مدفون خزانے کو حاصل کرنے کی ترکیب سمجھ میں آ گئی۔ بختا کو ملنگ کے ڈیرے پر پناہ مل گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان طے یہ پایا تھا کہ عابدہ

کے مکان کو خالی کروانے کی کوشش ملنگ کالیا کرے گا لیکن مدفون خزانہ وہ دونوں آپس میں برابر تقسیم کریں گے۔ اس موقع پر بختا نے ایک عیاری سے کام لیا تھا اور ملنگ کو صرف ایک بھاری رقم کے بارے میں ہی بتایا تھا۔ زیورات، قیمتی پتھر اور سونے کی اینٹوں کا تذکرہ وہ گول کر گیا تھا۔ ملنگ کالیا کی نظر ایک تگڑی رقم کے ساتھ ساتھ بتول پر بھی جمی ہوئی تھی چنانچہ اس کمینہ خصلت شیطان ابن شیطان نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جو کوشش کی وہ آپ گزشتہ بتیس تینتیس صفحات میں پڑھتے آ رہے ہیں۔

تینوں کے اقبالی بیان کے بعد میرے لیے بہت آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے ان پر مختلف دفعات لگا کر چالان تیار کیا اور آئندہ روز انہیں عدالت کے حوالے کر دیا۔

اس واقعے کے ایک ماہ بعد منظور حسین اپنی زوجہ عابدہ خانم کے ساتھ مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے احوال دریافت کرنے کے بعد بتول کی صحت کے بارے میں پوچھا "اب آپ کی بیٹی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ آپ کی دعاؤں سے ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔" منظور حسین نے بتایا "ہم اسی سلسلے میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"اب اس کا کیا سلسلہ نکل آیا منظور؟"

میں بتاتا ہوں جناب۔" منظور میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا "دراصل ہم جلد از جلد بتول کی شادی کر دینا چاہتے ہیں مگر وہ یہ ضد ہے کہ آپ کی مرضی اور مشورے ہی سے شادی کرے گی۔ آپ نے اسے ایک جہنم میں گرنے سے بچایا ہے اس لیے اس کے روشن مستقبل کا فیصلہ بھی آپ ہی کریں گے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ایک منہ بولی بیٹی نے ایک منہ بولے باپ کے کندھوں پر بہت بڑی ذمے داری ڈال دی تھی۔ میں خود کو بہت ذمے دار انسان سمجھتا ہوں اس لیے بہت سوچ سمجھ کر مجھے کوئی قدم اٹھانا تھا۔

میں نے عابدہ سے پوچھا "تم بتول کی اس خواہش کے بارے میں کیا کہتی ہو؟"

"میں کیا کہوں جی۔" وہ شکست خوردہ انداز میں بولی۔ "اب تو بتول ہی کی بات ماننا پڑے گی۔ اس نے آپ کو بڑا ابنایا ہے۔ جو فیصلہ آپ کریں گے وہی ماننا ہوگا۔

میں نے یہ سوال منظور کے بجائے عابدہ سے اس لیے کیا تھا کہ گھر میں عابدہ ہی کی حکم رانی

ہے۔ جب میں نے بتول سے تفصیلی ملاقات کی تھی اس وقت اس سے میں نے یہ بھی پوچھ لیا تھا کہ وہ کسی خاص لڑکے کو پسند کرتی ہے یا نہیں! اس نے اس سلسلے میں کسی پسند یا ناپسند کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں نے منظور حسین سے سوال کیا "آپ لوگوں کی نظر میں کوئی بہتر رشتہ ہے؟"

وہ بولا "صدیقا کا رشتہ عابدہ ٹھکرا چکی ہے۔ اور کوئی ڈھنگ کا لڑکا میری نظر میں فی الحال نہیں ہے۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ان دونوں کو بہ یک وقت مخاطب کرتے ہوئے کہا "اگر بتول کا یہ خیال ہے کہ میں نے اسے جہنم میں گرنے سے بچایا ہے تو پھر میں اسے جنت میں داخل ہونے کا مفید مشورہ ضرور دوں گا...... اور آپ دونوں کو بھی میرے مشورے سے اتفاق کرنا ہوگا۔ میں بتول کے لیے جس لڑکے کا انتخاب کروں گا، آپ دونوں کو اسے اپنا داماد بنانا ہوگا۔"

"منظور ہے۔" وہ دونوں بہ یک آواز ہو کر بولے۔

میں نے ان کے سامنے آسیہ بیگم کے بیٹے محمد صدیق عرف صدیقا کا نام رکھ دیا۔ میں اس لڑکے سے مل چکا ہوں اور میرے حساب سے وہ بتول کے لیے نہایت ہی مناسب اور موزوں تھا۔

ان دونوں نے میری تجویز اور انتخاب پر صاد کیا اور ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ میں اس سے زیادہ بتول کے لیے کیا کر سکتا تھا۔ وہ ایک سیاہ کار کے پنجۂ ستم سے نکل آئی تھی۔ میں نے ملنگ کالیا کو ایسا فٹ کیا تھا کہ اسے زندگی کا بیش تر حصہ اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارنا تھا۔

ملنگ کالیا جیسے لعنتی کردار ہر علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ اللہ سب کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین!

چلتے چلتے یہ بھی سن لیں کہ عابدہ کے گھر سے جو "مدفون خزانہ" برآمد ہوا تھا، مختلف سرکاری مراحل سے گزرنے کے بعد اسے اس کے مالک چوہدری امانت علی کے حوالے کر دیا گیا تھا جو اُس وقت قریب المرگ تھا۔ چوہدری نے خوشی کے اس موقع پر سونے کے دو سیٹ بتول کی شادی میں تحفے کے طور پر دے دیے تھے۔

ہم چشم :

اکثر افراد پولیس والوں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اس کے لیے انہیں قصور وار بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ ہمارا میڈیا ان کے ذہن میں پولیس والوں کا بڑا شرم ناک تصور اجاگر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ہاتھ ہمارے ٹی وی ڈراموں اور فلموں کا ہے جہاں پولیس والوں کو انتہائی ظالم' جابر اور رشوت خور دکھایا جاتا ہے۔ وہ بے گناہ شہریوں کو اٹھا کر تھانے میں بند کر دیتے ہیں۔ ان پر گرجتے برستے ہیں' انہیں ڈراتے دھمکاتے ہیں اور ان کی جان بخشی کے عوض لمبی چوڑی رقم طلب کرتے ہیں۔ اگر کوئی بے قصور شخص ان کا مطالبہ پورا نہ کرے یا نہ کر سکے تو اس کو نہ صرف بے دردی سے پھینٹی لگائی جاتی ہے بلکہ اس پر بے دریغ تشدد بھی کیا جاتا ہے۔ بعد ازاں انہیں جعلی مقدمات میں الجھا کر جیل بھیج دیا جاتا ہے۔

کسی بھی محکمے میں کالی بھیڑوں کے وجود سے انکار تو ممکن نہیں ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پولیس والے بھی آپ ہی کی طرح کے انسان ہوتے ہیں۔ ہماری پولیس ٹی وی اور فلم والوں کی پولیس سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے تھانوں میں شرفا کا احترام کیا جاتا ہے۔ انہیں عزت سے کرسی پر بٹھایا جاتا ہے۔ ان کے مسائل پوری توجہ سے سنے جاتے ہیں اور ممکن حد تک ان کی مدد بھی کی جاتی ہے۔ البتہ مجرموں کے ساتھ پولیس سختی کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ وہ آسانی سے زبان کھولنے پر تیار نہیں ہوتے اور جھوٹ بول کر خود کو سزا سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا سچ اگلوانے کے لیے پولیس کو ان کی ''خاطر مدارات'' کرنا پڑتی ہے۔

آج میں آپ کی خدمت میں ایک عبرت اثر واقعہ پیش کرتا ہوں۔

وہ موسم گرما کی ایک خوش گوار صبح تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں مکلف وردی میں ملبوس

تھانے پہنچا تو پتا چلا کہ گنے کے کھیتوں میں سے ایک نوجوان شخص کی لاش ملی ہے۔ لاش کی اطلاع دینے والا ایک غریب صورت مزارع تھا۔ ان دنوں گنے کی فصل کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ مذکورہ مزارع کا نام چراغ دین تھا۔

چراغ دین نے مجھے بتایا کہ وہ حسب معمول گنے کی کٹائی میں مصروف تھا۔ جب وہ ایک کھیت کے اندرونی حصے میں پہنچا تو وہاں ایک نوجوان کو اوندھے منہ پڑے دیکھ کر چونک اٹھا۔ قریب جا کر جب چراغ دین نے اس کا جائزہ لیا تو اسے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ وہ شخص اب زندہ نہیں تھا۔ چراغ دین نے اپنی درانتی وغیرہ کو کھیت ہی میں چھوڑا اور فی الفور اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے چلا آیا تھا۔

میں نے پوری بات سننے کے بعد چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور موقع پر پہنچ گیا۔ اس وقت ساڑھے نو بج چکے تھے۔ جائے وقوعہ پر اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ میں نے سب کو پیچھے ہٹایا اور نوجوان کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ مذکورہ نوجوان زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا ہے۔ یہ بات بھی یقینی تھی کہ اسے قتل کیا گیا ہے۔

مقتول کی عمر کا اندازہ میں نے چوبیس پچیس سال کے درمیان لگایا۔ اس نے دو گھوڑا مارکہ بوسکی کی شیروانی کالر قمیض پہن رکھی تھی۔ اس وقت کے رواج کے مطابق بوسکی کی قمیض کے ساتھ کورے لٹھے کی شلوار بھی اس کے جسم پر نظر آ رہی تھی۔ مقتول کے پاؤں میں کوہاٹی چپل تھی۔ اپنی شکل وصورت اور وضع قطع سے وہ ایک نفیس اور آسودہ حال شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کا لباس نیا اور بے داغ تھا۔ وہ اس وقت اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ اس کی پوزیشن سے اندازہ ہوتا تھا کہ جیسے وہ اکڑوں بیٹھے ہوئے اچانک منہ کے بل گر پڑا ہو۔

مقتول کے سر کے پچھلے حصے میں چوٹ کا نمایاں نشان نظر آ رہا تھا۔ چوٹ اس قدر شدت سے لگائی گئی تھی کہ کھوپڑی چٹخ گئی تھی اور بہنے والے خون نے بوسکی کی قمیض کو رنگین کر دیا تھا۔ سر کے دوسرے حصوں پر بھی چوٹوں کے کچھ نشانات پائے گئے تھے تاہم وہ اتنے مہلک نہیں تھے۔ سب سے کاری ضرب سر کے پچھلے حصے میں لگائی تھی اور میرے خیال کے مطابق یہی ضرب اس کی موت کا سبب بنی تھی۔ ایک بات واضح تھی کہ مقتول کے عقب سے اس پر حملہ کیا گیا تھا۔ میں نے چوٹوں سے فوری طور پر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ حملہ' لاٹھی یا لاٹھیوں سے کیا گیا تھا۔ حملہ آور ایک شخص بھی ہو سکتا تھا اور ایک سے زیادہ اشخاص بھی۔ مجھے بتایا گیا کہ مقتول کا نام عارف علی تھا اور وہ اسی گاؤں کا رہنے والا

تھا۔

میں نے مقتول کی لاش کو پلٹ کر دیکھا تو چونک اٹھا۔ اس کی شلوار کا کمر بند کھلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ پوری صورت حال مجھ پر واضح ہو گی۔ یہ بات یقینی تھی کہ جب مقتول کے عقب سے حملہ آور نے اس کے سر کو نشانہ بنایا' اس وقت مقتول پیشاب کرنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے پوری طرح لاش کا جائزہ لینے کے بعد مقتول کی تلاشی لی۔ مقتول کی سامنے والی جیب میں سے ایک عدد ہاتھ کا کڑھا ہوا ریشمی رومال' المونیم کی چھوٹی کنگھی اور کچھ کاغذات برآمد ہوئے۔ قمیض کی سائڈ والی جیب میں سے ایک چھوٹی ڈبیا ملی۔ یہ سونے کے زیورات رکھنے والی ڈبیا تھی۔ اس کے سائز اور بناوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انگوٹھی کے لیے بنائی گئی تھی لیکن اس وقت وہ ڈبیا خالی تھی انگوٹھی اس میں موجود نہیں تھی۔

میں نے مقتول کی جیب میں سے برآمد ہونے والے کاغذات کو دیکھنا شروع کیا تو کاغذات کے اندر سے کچھ رقم نکلی۔ وہ ایک سو ساٹھ روپے مالیت کے چھوٹے بڑے نوٹ تھے۔ ان ہی کاغذات میں سونے کی انگوٹھی کی ایک رسید بھی برآمد ہوئی۔ یہ رسید ''محبوب جیولرز'' کی تھی اور پتا صرافہ بازار لاہور کا تھا۔ رسید پر ایک ماہ پہلے کی تاریخ درج تھی۔ اس رسید کے مطابق پانچ ماشہ وزن کی ایک طلائی انگوٹھی مبلغ پینتالیس روپے میں خریدی گئی تھی۔ خریدار کا نام عارف علی تھا۔

میں نے مقتول کی جامہ تلاشی سے برآمد ہونے والی تمام اشیا کو اپنے قبضے میں کیا اور گھوم پھر کر جائے واردات کا جائزہ لینے لگا۔ جس کھیت میں سے مقتول کی لاش ملی تھی اس کے قریب ہی ایک ٹیوب ویل تھا۔ میں وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا کہ پتا چلا' مقتول عارف علی کا بڑا بھائی نذر علی اس سانحے کی اطلاع پا کر موقع واردات پر آن پہنچا ہے۔ نذر علی سیدھا میرے پاس آیا۔ میں اس وقت لاش کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی لاش کو دیکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! یہ کیا ہو گیا۔ میرے بھائی کو کس نے قتل کیا ہے؟''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں کہا ''نذر علی' میں اسی بات کا پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے بھائی کا قاتل کون ہے اور اس قتل کا محرک کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے تمہارے بھرپور تعاون کی ضرورت ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ''تمہارے خیال میں عارف علی کو کس نے قتل کیا ہو گا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا جناب۔'' وہ دکھی لہجے میں گویا ہوا ''عارف علی رات کو بھلا چنگا چھت پر سونے کے لیے گیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اب اس کی لاش دیکھنے کو ملے گی۔''

''تمہیں کسی پر شک ہے؟''

''نہیں جناب۔''

میں نے پوچھا ''عارف علی کی کسی سے دشمنی وغیرہ تھی؟''

''ایسی کوئی بات نہیں تھی جناب.....'' نذر علی نے بتایا ''وہ تو سب کا دوست تھا۔ کوئی شخص اس سے دشمنی کر ہی نہیں سکتا تھا۔''

میں نے کہا ''نذر علی' کوئی کسی کو بلاوجہ قتل نہیں کرتا۔ ایسا کام کوئی دوست نہیں بلکہ دشمن ہی کر سکتا ہے اور تم کہتے ہو' اس کا کوئی دشمن نہیں تھا؟''

''آپ پورے پنڈ سے پوچھ لیں جناب' عارف کی کسی سے لڑائی نہیں تھی۔ آج تک کسی سے اس کا معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ سب اس کی تعریف کرتے تھے۔''

''نذر علی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''جہاں انسان کے سو دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن بھی ہوتا ہے اور بعض دشمن تو دوست نما ہوتے ہیں۔ لگتا ہے' یہ بھی کسی ایسے ہی دوست نما دشمن کا کام ہے۔''

وہ رو دینے والے انداز میں بولا ''میری تو مت ماری گئی ہے' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے گبرو بھائی کو کس کی نظر لگ گئی ہے۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بھائی کی لاش کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

میں نے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد عارف علی کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ضلع اسپتال بھجوا دی اور موقع پر موجود افراد کے بیانات قلم بند کرنے لگا۔ تاہم کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جو عارف علی کے قتل پر روشنی ڈال سکتی۔ مجموعی طور پر مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں اس کا خلاصہ یہ تھا کہ عارف علی ایک مہذب' پڑھا لکھا اور صلح جو انسان تھا۔ وہ گریجویٹ تھا اور ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے لاہور کے ایک کالج سے گریجویشن کیا تھا۔ وہ کچھ عرصہ لاہور ہی میں ملازمت بھی کرتا رہا تھا اور کم و بیش ایک ماہ قبل گاؤں آیا تھا۔ اب اس کا ارادہ مستقل طور پر یہیں رہنے کا تھا۔

عارف علی کو کبھی بھی کھیتی باڑی سے دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن حیرت انگیز طور پر اس مرتبہ جب وہ

گاؤں آیا تو یہ ارادہ کر کے آیا تھا کہ اب وہ کاشت کاری کے معاملات میں بڑے بھائی کا ہاتھ بٹائے گا۔ وہ باپ دادا کے پیشے کو اپنانے کا مصمم فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہ زیادہ بہتر طور پر زمین کے معاملات کو دیکھ سکے گا۔

مقتول کے بارے میں اکثریت کا تاثر بہت اچھا تھا۔ عام رپورٹ یہی تھی کہ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا اور گاؤں کا ہر شخص عارف علی جیسے بے ضرر اور خاموش طبع انسان کے وحشیانہ قتل پر حیرت زدہ تھا لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ میرے ذہن میں شک کے کئی دروازے کھل چکے تھے۔ میں اپنے ان خیالات کا اظہار آگے چل کر مناسب موقعے پر کروں گا۔

جائے واردات سے فارغ ہو کر میں نذر علی کے ساتھ اس کے گھر چلا آیا۔ اس کا گھر ایک چھوٹی حویلی سے مشابہ تھا۔ نذر علی کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی اور وہ شادی شدہ تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ گزشتہ شب حسب معمول عارف علی رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چھت پر چلا گیا تھا۔ موسم گرما میں چھت پر سونا اسے پسند تھا۔ گھر کے باقی افراد کشادہ صحن میں سوتے تھے۔

میں نے پوچھا ”نذر علی، تمہارا بھائی کتنے بجے سونے کے لیے چھت پر گیا تھا؟“

”ٹھیک وقت کا تو مجھے اندازہ نہیں جناب۔“ نذر علی نے بتایا ”ویسے میرا خیال ہے، وہ دس بجے کے بعد ہی چھت پر گیا تھا۔“

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”اس وقت ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ تم آدھا گھنٹا پہلے جائے واردات پر پہنچے تھے۔ کیا تمہیں اس سے پہلے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے بھائی کو کسی نے قتل کر دیا تھا؟“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”تھانے دار صاحب! میں منہ اندھیرے اپنی زمین کی طرف نکل جاتا ہوں۔ عارف علی ذرا دیر سے اٹھنے کا عادی ہے۔ میں حسب معمول گھر سے نکل گیا تھا۔ واپسی پر مجھے معلوم ہوا کہ عارف علی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ پھر میں بھاگا بھاگا کھیتوں میں جا پہنچا۔“

”نذر علی، آج صبح حسب معمول جب تم گھر سے نکلے تو کیا اس وقت عارف علی گھر میں موجود تھا۔ میرا مطلب ہے، کیا وہ اس وقت چھت پر سو رہا تھا؟“

”ظاہر ہے، وہ چھت پر ہی ہو گا۔“

”کیا تم نے چھت پر جا کر دیکھا تھا؟“

”نہیں جناب، میں نے دیکھا تو نہیں تھا۔“ نذر علی نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ”نذر علی، جب تم گھر سے نکلے تھے اس وقت تمہارے گھر کا اندرونی دروازہ بند تھا یا کھلا ہوا تھا؟“

”بند تھا جناب۔“

”یعنی جیسے رات سونے سے پہلے تم نے اسے بند کیا تھا وہ تمہارے جانے تک ویسے ہی بند تھا؟“

نذر علی نے اثبات میں جواب دیا، میں نے پوچھا ”کیا گھر سے باہر جانے کا کوئی اور دروازہ بھی موجود ہے؟“

”نہیں جناب، ایسا کوئی دروازہ موجود نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”نذر علی، میں تمہارے گھر کی چھت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ اس نے کہا اور سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

میں نذر علی کی راہ نمائی میں چھت پر پہنچ گیا۔ نذر علی نے مجھے بتایا کہ مقتول عارف علی رات کو کس چار پائی پر سویا تھا۔ میں نے اس چار پائی کا بغور جائزہ لیا۔

وہ رنگ داری پایوں والی ایک خوب صورت چار پائی تھی جس پر سفید رنگ کا ایک بے داغ کھیس بچھا ہوا تھا۔ کھیس پر کوئی شکن نظر نہیں آ رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ عارف علی رات کو اس بستر پر سویا ہی نہیں تھا۔

گھر کے پچھواڑے میں ایک باڑا نظر آ رہا تھا جس میں نصف درجن کے قریب مویشی بندھے ہوئے تھے جن میں بیل، بھینس اور بکریاں شامل تھیں۔ گھر کی چھت سے لکڑی کی ایک سیڑھی باڑے کے اندر چلی گئی تھی۔

میں نے نذر علی سے پوچھا ”یہ باڑا کس کا ہے؟“

”میرا ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے لکڑی کی اس سیڑھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا ”نذر علی، کیا یہ سیڑھی مستقل یہیں لگی رہتی ہے؟“

”جی ہاں جناب۔“

”میں تمہارا باڑا دیکھنا چاہتا ہوں۔“

"آ جائیں۔" اس نے سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

ابھی تک میں یہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ مقتول عارف علی گنے کے کھیتوں میں کیوں کر پہنچا تھا۔ اسے کوئی بلا کر لے گیا تھا یا وہ خود کسی سے ملنے وہاں گیا تھا۔ نذر علی نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ رات چھت پر جانے کے بعد عارف علی پھر نیچے نہیں اترا تھا۔ اگر وہ گھر کے بیرونی دروازے سے باہر جاتا تو صبح نذر علی کو وہ دروازہ کھلا ہوا ملتا لیکن نذر علی نے اس کی تردید کی تھی۔ اب باڑے میں لگی ہوئی اس سیڑھی کو دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا' ممکن ہے عارف علی اس سیڑھی کے ذریعے باڑے میں اترا ہو اور پھر وہیں سے باہر نکل گیا ہو۔

ہم دونوں آگے پیچھے باڑے میں اتر آئے۔ باڑے کے ایک کونے میں کٹے ہوئے چارے کا ڈھیر لگا ہوا تھا' دوسری طرف جلانے والی لکڑیاں اور اپلے رکھے ہوئے تھے۔ ایک بغیر دروازے کے کمرے میں ہل اور پنجالیاں پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ ناکارہ مشینی پرزے بھی رکھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ باڑے کا بیرونی دروازہ ایسا تھا جسے اندر اور باہر' دونوں جانب سے کھولا جا سکتا تھا۔ میں نے گھوم پھر کر ہر امکان کا جائزہ لیا پھر نذر علی سے پوچھا۔

"لگتا ہے' تمہارا بھائی باڑے کے راستے باہر گیا تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر جما دی۔

"شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" نذر علی نے جواب دیا "یہی ایک راستہ ہے جہاں سے وہ میرے علم میں آئے بغیر باہر جا سکتا تھا۔"

"ہوں!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "وہ تمہارے علم میں لائے بغیر گھر سے باہر کیوں گیا تھا؟"

"یہی بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

میں نے کہا "نذر علی' اگر تم نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ اگر ایسی ویسی کوئی بات ہے تو تم ابھی مجھے بتا دو ورنہ بعد میں تمہیں پچھتانا پڑے گا۔"

"مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ آپ کو بتا چکا ہوں جناب۔" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

میں نے پوچھا "نذر علی' تمہارے بھائی کی لاش جن کھیتوں سے ملی ہے وہ تمہارے گھر سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ مجھے بتاؤ' عارف علی کو ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی کہ وہ تمہارے علم میں لائے بغیر وہاں پہنچ گیا تھا؟"

اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا' میں نے پوچھا "نذر علی' سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے بھائی کا کسی لڑکی سے کوئی چکر تو نہیں چل رہا تھا؟"

اس نے جواب دینے میں تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا اظہار کیا پھر بولا "نہیں جناب' ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔"

میں نے کہا "سوچ لو نذر علی' اگر بعد میں کوئی ایسی بات نکل آئی تو میں تمہارے ساتھ سختی سے پیش آؤں گا۔"

"آپ میری بات کا یقین کریں تھانے دار صاحب۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولا "میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ نذر علی مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے تاہم میں نے اس وقت زیادہ اصرار نہیں کیا اور اس کے ساتھ واپس گھر میں آ گیا۔ ہم دوبارہ بیٹھک میں آ کر بیٹھے تو میں نے سوال کیا۔

"نذر علی' کیا عارف علی کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا؟"

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا "تھانے دار صاحب' میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔"

میں نے کہا "عارف علی تعلیم یافتہ اور صحت مند نوجوان تھا۔ اس عمر میں اس کی شادی ہو جانا چاہیے تھی۔ کیا تم نے کہیں اس کے رشتے کی بات چلائی تھی؟"

"ابھی ایک ماہ پہلے تو وہ لاہور سے آیا تھا۔" نذر علی نے جواب دیا "جب وہ لاہور میں ملازمت کر رہا تھا تو میں نے کئی بار شادی کے موضوع پر اس سے بات کرنا چاہی تھی لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔ کہتا تھا' پہلے وہ اپنی ایک حیثیت بنائے گا پھر شادی کے بارے میں سوچے گا۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ ہم باحیثیت لوگ ہیں۔ ہماری اچھی خاصی زمین ہے۔ اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر لاہور شہر میں کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بھی زیادہ زور نہیں دیا پھر اچانک ہی اس کے خیالات بدل گئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

نذر علی نے بتایا "پہلی مرتبہ جب وہ یہاں آیا تھا تو واپس جاتے ہوئے ہوا کچھ اداس نظر آ رہا تھا جب کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ گاؤں سے شہر جاتے ہوئے ہمیشہ خوش نظر آیا تھا۔"

”تم نے اس کے افسردہ ہونے کی وجہ پوچھی تھی؟“

”ہاں، میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا۔“ نذر علی نے جواب دیا ”میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا تھا کہ اب اس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ گاؤں سے جائے۔“

میں نے پوچھا ”اس نے دل کے نہ چاہنے کا سبب بھی بتایا ہوگا؟“

”سبب تو نہیں بتایا تھا البتہ یہ کہا تھا کہ ممکن ہے وہ آخری بار لاہور جا رہا ہو۔“ نذر علی نے کہا ”اور شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کیونکہ اس مرتبہ وہ یہی فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اب وہ مستقل گاؤں میں ہی رہے گا لیکن گاؤں میں ایک ماہ سے زیادہ رہنا اسے نصیب نہ ہوا۔“ نذر علی کی آواز بھرا گئی ”کسی ظالم نے اس کی زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا۔“

میں نے ہمدردی سے کہا ”نذر علی، مجھے تمہارے بھائی کی ناگہانی موت کا دکھ ہے۔ تم فکر نہ کرو میں اس کے قاتل کو بہت جلد ڈھونڈ نکالوں گا۔ بس مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”آپ حکم کریں تھانے دار صاحب۔“ وہ آنسو خشک کرتے ہوئے بولا ”میں جو کچھ کر سکا ضرور کروں گا۔“

میں نے کہا ”نذر علی! تم نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ پچھلی مرتبہ جب عارف گاؤں آیا تھا تو کسی وجہ سے اس کا واپس جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ تمہارے پوچھنے کے باوجود بھی اس نے اس کا سبب نہیں بتایا تھا۔ کیا تم نے اس کے جانے کے بعد اپنے طور پر کوئی سن گن لینے کی کوشش نہیں کی کہ اچانک اسے گاؤں میں ایسا کیا نظر آ گیا تھا کہ یہاں سے جاتے ہوئے وہ افسردہ ہو رہا تھا؟“

وہ ایک سرد آہ بھرتے ہوئے گویا ہوا ”تھانے دار صاحب، مجھے خود عارف کی کیفیت سے حیرت ہوئی تھی اور جیسا آپ اس وقت سوچ رہے ہیں ایسا ہی اس وقت میں نے بھی سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید گاؤں کی کوئی لڑکی اس کے پاؤں کی زنجیر بن رہی ہے۔ میں نے اپنے تئیں معلوم کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔“

میں نے پوچھا ”نذر علی، ذرا سوچ کر بتاؤ۔ عارف علی عام طور پر کتنے عرصے بعد گاؤں آتا تھا؟“

”سال میں ایک مرتبہ جناب۔“

”یہاں گاؤں میں وہ کتنے دن ٹھہرتا تھا؟“

”وہ دس بارہ دن سے زیادہ نہیں رکتا تھا۔“

میں نے پوچھا ”کیا اس مرتبہ بھی وہ پورے سال کے بعد ہی واپس آیا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ نذر علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ”اس بار تو وہ دو ماہ بعد ہی واپس لوٹ آیا تھا۔“

”اور یہ فیصلہ کر کے آیا تھا کہ اب وہ کبھی گاؤں سے نہیں جائے گا؟“

”جی ہاں۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ گاؤں میں کسی چیز سے اس کا دل لگ گیا تھا۔“ میں نے پرسوچ انداز میں کہا ”ایک جوان اور خوب صورت شخص کا دل کسی لڑکی ہی میں لگ سکتا ہے نذر علی!“

”ہو سکتا ہے، ایسا ہی ہوا ہو۔“ نذر علی نے کہا ”لیکن میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

وقوعہ پر میں نے کچھ افراد کے بیانات نوٹ کیے تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں کئی مشکوک سوالات نے سر ابھارا تھا۔ ان ہی سوالات میں ایک نذر علی کے بارے میں بھی تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ مقتول عارف علی کو کاشتکاری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور زمین و زمینداری کے سارے معاملات نذر علی کے ہاتھ میں تھے۔ چھوٹے بھائی نے نہ تو کبھی بڑے بھائی کے کام میں مداخلت کی تھی اور نہ ہی کبھی کسی حساب کتاب کے بارے میں کوئی سوال کیا تھا۔ اب وہ اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گاؤں آ گیا تھا اور اپنا آبائی پیشہ اپنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ان حالات و واقعات کی روشنی میں اس بات کا امکان بہر حال موجود تھا کہ مقتول عارف علی کے اس اچانک فیصلے سے نذر علی کو تشویش ہوئی ہو۔ اس نے سوچا ہو کہ آگے چل کر چھوٹا بھائی کہیں زمین کے بٹوارے کا ٹنٹا کھڑا نہ کر دے یا آج تک کا حساب نہ طلب کر لے۔ زن، زر اور زمین کے معاملے میں کوئی بھی بات خالی از امکان نہیں ہوتی۔ ممکن ہے، نذر علی نے خود ہی بھائی کو راستے سے ہٹا دیا ہو؟ اس سوال کی روشنی میں، میں نے نذر علی سے پوچھا۔

”نذر علی! میں نے سنا ہے، تمہارا بھائی اب کھیتی باڑی کا ارادہ رکھتا تھا؟“

”آپ نے ٹھیک سنا ہے جناب۔“ اس نے جواب دیا ”حالانکہ اس سے پہلے وہ اس کام سے کتراتا رہا تھا۔ میں اس کے کاشتکاری کے فیصلے سے بہت حیران ہوا تھا۔“

”اب تو تمہاری حیرت دور ہو گئی ہو گی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ جز بز ہو کر بولا ”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا جناب!“

میں نے کہا ”میرا مطلب ہے کہ اب تو تم مطمئن ہو گئے ہو گے۔ عارف علی زمینداری کرنے

کے لیے زندہ نہیں رہا۔تم اسی طرح اپنا کلام چلاتے رہو گے جیسا اب تک کرتے آئے ہو؟''

وہ میرے سوال کا مقصد سمجھ گیا' جلدی سے بولا'' آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں جناب۔ آ
خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ میں اپنے بھائی کی جان لینے کا تو کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

میں نے کہا'' نذر علی! اس میں کوئی شک نہیں کہ عارف علی تمہارا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ تمہارا با
تھا۔ اس کی موت کا جتنا دکھ تمہیں ہو سکتا ہے اتنا کسی اور کو ہو ہی نہیں سکتا لیکن میں اپنے فرائض سے مج
ہوں۔ میں قاتل کا سراغ لگانے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تمہار
اطلاع کے لیے بتا دوں کہ تمہاری ذات پوری طرح شک سے پاک نہیں ہے۔ خاص طور پر ا
حالات کے پس منظر میں کہ مقتول پورے جوش و خروش کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔''

وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا'' تھانے دار صاحب' میں آپ کی سوچ پر کوئی پابندی لگا سکتا
ہوں اور نہ ہی آپ کی تفتیش کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی کر سکتا ہوں۔ دلوں کے حال اللہ جا
ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ مجھے صدفی صد یقین ہے کہ میرا اللہ میری عزت ضرو
رکھے گا۔''

میں نے پوچھا'' نذر علی' تم ایک طویل عرصے سے زمینوں کا انتظام سنبھالے ہوئے ہو۔ مانا ک
مقتول کو زمین و جائداد کے معاملات سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن ایسا تو ہو سکتا ہے کہ اس کی خواہش
اس کے حصے کی زمین اسے مل جائے؟''

نذر علی نے کہا'' عارف علی نے کبھی ایسی کوئی خواہش ظاہر نہیں کی۔ اگر وہ زمین میں سے اپ
حصہ مانگتا تو میں بخوشی اس کے حوالے کر دیتا۔''

'' کیا اس نے کبھی زمین کی آمدنی کا حساب بھی مانگا تھا؟''

'' نہیں جناب' اس نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔''

نذر علی کے لہجے میں کوئی ایسی بات موجود تھی جو اس کی سچائی پر دلالت کرتی تھی لیکن جب تک
اصل قاتل کا سراغ نہ ملتا' میں نذر علی کی ذات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے مشکوک افراد کی
لسٹ میں رکھ لیا۔

پھر میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے کہا'' نذر علی! تمہارے بھائی کی لاش گنے کے
کھیتوں میں سے ملی ہے۔ تم خود وہ جگہ دیکھ چکے ہو۔''

'' جی ہاں' وہ گنے کا کھیت ہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا'' وہ زمین کس کی ملکیت ہے؟''

'' گرداور ارشاد حسین کی۔'' محکمہ مال کا ایک عہدہ جو پٹواری سے ایک درجہ اوپر ہوتا ہے۔'' گرد
اور'' کو'' قانون گو'' بھی کہا جاتا ہے۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ارشاد حسین گرداور سرکاری ملازم تھا اور اس گاؤں میں اس کی اچھی خاصی
زمین تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نے سوا ایکڑ کے قریب زمین کس طرح حاصل کی تھی البتہ ایک بات
تھی کہ عام لوگوں میں ارشاد حسین گرداور کا تاثر بہت اچھا تھا۔ لوگ اس کا احترام کرتے تھے اور اس
احترام میں ڈر و خوف سے زیادہ محبت اور عقیدت پائی جاتی تھی۔

میں نے گرداور ارشاد حسین کا نام اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ فرصت ملتے ہی
میں اس سے بھی اس سلسلے میں پوچھ گچھ ضرور کروں گا۔ پھر میں دوبارہ نذر علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

'' نذر علی!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا'' اس مرتبہ تمہارا بھائی لاہور سے سونے کی
کوئی انگوٹھی بھی لایا تھا؟''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا'' نہیں جناب۔ آپ کس قسم کی انگوٹھی کا ذکر کر رہے ہیں؟''

میں نے اپنی جیب میں سے انگوٹھی والی خالی ڈبیا نکال کر نذر علی کو دکھائی اور کہا'' یہ ڈبیا مجھے
مقتول کی جامہ تلاشی سے ملی تھی۔'' پھر میں نے اسے'' محبوب جیولرز'' کی رسید دکھاتے ہوئے اپنی بات
کی وضاحت کی'' نذر علی! عارف علی نے ایک ماہ قبل محبوب جیولرز سے سونے کی ایک انگوٹھی خریدی
تھی۔ ایک ماہ قبل کا مطلب یہ ہوا کہ جب وہ لاہور سے گاؤں آیا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کس ہستی
کے لیے شہر سے طلائی انگوٹھی خرید کر لا سکتا ہے؟''

'' یہ تو سارا قصہ ہی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' وہ ہونقوں کی طرح انگوٹھی والی ڈبیا کو دیکھتے
ہوئے بولا'' یہ ڈبیا تو خالی نظر آ رہی ہے۔ اس کی انگوٹھی کہاں گئی؟''

'' اس انگوٹھی کے درست مقام کے بارے میں صرف تمہارا بھائی جانتا تھا جو اب زندہ نہیں رہا
اس لیے میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا
'' مجھے یہ ڈبیا مقتول کے لباس میں سے ایسے ہی خالی ملی تھی۔''

'' میں ذرا اپنی گھر والی سے پوچھتا ہوں۔'' نذر علی نے الجھن آمیز لہجے میں کہا'' شاید وہ اس
بارے میں کچھ جانتی ہو۔''

میں نے کہا'' تم اپنی گھر والی کو ادھر بیٹھک ہی میں بلا لو۔ میں بھی اس سے بہت کچھ پوچھنا

چاہتا ہوں۔''

نذر علی اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی بیوی کو لے کر آ گیا۔ اس کی بیوی کا نام خالدہ پروین تھا۔ وہ ایک قبول صورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے تیس اور بتیس کے درمیان لگایا۔ اس کے ساتھ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی عالیہ بھی تھی۔ عالیہ کی عمر کم وبیش پانچ سال تھی۔ عالیہ سے بڑی بہن کا نام فردوس تھا۔ فردوس سے بڑا ایک بھائی کامران تھا۔

خالدہ پروین کو انگوٹھی والی خالی ڈبیا کا پس منظر سنانے کے بعد میں نے پوچھا ''خالدہ بی بی، عارف علی تمہارا دیور تھا۔ دیور، بھابیوں سے بہت بے تکلف ہوتے ہیں اور عام طور پر انہیں اپنے ہر راز میں شریک رکھتے ہیں۔ تمہیں تو علم ہوگا، وہ یہ انگوٹھی کس کے لیے لایا تھا؟''

''نہ جی، اس نے مجھے تو انگوٹھی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' خالدہ نے جواب دیا ''میں سوچ رہی ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا، آخر یہ چکر کیا ہے۔''

''میں بھی اسی چکر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''یہ بات تو ثابت ہے کہ وہ لاہور سے آتے ہوئے اپنے ساتھ ایک انگوٹھی خرید کر لایا تھا۔ مجھے اس کی جیب سے انگوٹھی کی رسید بھی ملی ہے۔ اگر یہ پتا چل جائے کہ مقتول عارف علی وہ انگوٹھی کس کے لیے لایا تھا تو اس کے قاتل تک پہنچنے میں آسانی ہو جائے گی۔''

نذر علی نے کہا ''تھانے دار صاحب، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اس کی جیب میں وہ انگوٹھی والی خالی ڈبیا رکھ دی ہو۔''

''میں نے اس امکان پر بھی غور کیا ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن اس کی جیب سے برآمد ہونے والی انگوٹھی کی رسید ظاہر کرتی ہے کہ انگوٹھی وہی خرید کر لایا تھا۔''

خالدہ پروین نے کہا ''مجھے تو لگتا ہے، کسی نے عارف کے خلاف سازش کی ہے۔''

''ایسی سازش کون کر سکتا ہے؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔'' خالدہ پروین نے کہا ''میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ عارف کے ساتھ لڑکیوں والا کوئی چکر نہیں تھا۔ کسی لڑکی کو سونے کی انگوٹھی دینا تو بہت دور کی بات ہے، وہ تو لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔''

نذر علی نے کہا ''تھانے دار صاحب، میرا بھائی بہت شرمیلا تھا۔''

میں نے کہا ''میں اپنے طور پر اس انگوٹھی والے معاملے کی پوری چھان بین کروں گا۔ اگر

ضرورت پڑی تو کسی کو بھیج کر اس دکان سے بھی تصدیق کروں گا جہاں سے یہ خریدی گئی تھی۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے خالدہ پروین سے پوچھا ''خالدہ بی بی! تم نے اپنے دیور کو کوئی رومال دیا تھا؟''

''کیسا رومال جی؟''

''ریشمی رومال۔'' میں نے کہا ''ہاتھ کی کڑھائی والا؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے جیب سے وہ رومال نکال کر خالدہ پروین کی جانب بڑھا دیا جو مقتول کی جامہ تلاشی سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا ''اس رومال کو پہچانتی ہو؟''

وہ الٹ پلٹ کر رومال کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رومال اس نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ رومال کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اس نے پوچھا ''کیا یہ رومال بھی آپ کو عارف علی کے پاس سے ملا ہے؟''

''ہاں، یہ رومال اس کی جیب میں موجود تھا۔'' میں نے کہا ''اور اس قسم کے رومال بازار میں فروخت نہیں ہوتے بلکہ اپنے ہاتھ سے کاڑھ کے تحفے میں دیے جاتے ہیں۔ اتنا اندازہ تو تمہیں بھی ہوگا؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ''یہ رومال میں نے تو اسے دیا نہیں تھا پھر کس نے دیا ہوگا!''

میں نے کہا ''مجھے تو یہ سارا عشق کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کے تحفے تحائف کا تبادلہ بے معنی نہیں ہو سکتا۔ بہرحال، بہت جلد میں معاملے کی تہ تک پہنچ جاؤں گا۔''

نذر علی نے پوچھا ''تھانے دار صاحب، میرے بھائی کا قاتل گرفتار ہو جائے گا نا؟''

''انشاء اللہ قاتل ضرور گرفتار ہوگا۔'' میں نے تیقن سے کہا پھر نذر علی سے پوچھا ''نذر علی، تمہارے گھر میں کوئی لاٹھی وغیرہ تو ہوگی؟''

یہ سوال میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا تھا۔ نذر علی نے میرے سوال پر چونک کر مجھے دیکھا اور کہا ''لاٹھی کا کیا کریں گے آپ؟''

''تم میرے سوال کا جواب دو۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''جی...... جی۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا ''دو تین لاٹھیاں ہیں گھر میں رکھی ہوئی۔''

''وہ لاٹھیاں مجھے لا کر دکھاؤ۔''

وہ منمنایا ''کہیں آپ مجھ پر شک تو نہیں کر رہے!''

''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں نذر علی کہ تم پر شک کیا جا سکتا ہے۔'' میں اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا ''میرے شک کو دور کرنے کے لیے مجھ سے تعاون کرو۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو اور خواہ مخواہ سوالات نہ کرو۔''

''اچھا جی۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا ''میں ابھی لاٹھیاں لے کر آتا ہوں۔''

وہ اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا تو میں نے خالدہ پروین سے کہا ''خالدہ بی بی! میں تو اپنے طور پر تفتیش کر ہی رہا ہوں۔ تمہیں بھی اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہوگی۔''

''میں بھلا کیا کر سکتی ہوں جی۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا ''یہ گاؤں زیادہ بڑا نہیں ہے پھر یہاں ہر ایک شخص دوسرے کو جانتا ہے' خاص طور پر عورتیں تو ایک ایک گھر کی خبر رکھتی ہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے دیور نے کسی لڑکی سے محبت کا معاملہ چلا رکھا تھا۔ تم ذرا کوشش کرو تو اس لڑکی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتی ہو۔ تمہارے لیے یہ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ گزشتہ رات اسی مفروضہ لڑکی سے ملاقات کرنے گھر سے نکلا ہوگا۔ اگر لڑکی کا پتا چل جائے تو قتل کی اس واردات کے پوشیدہ گوشے وا ہو سکتے ہیں۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''میں پوری کوشش کروں گی جی۔''

اسی دوران میں نذر علی تین عدد لاٹھیاں لے کر بیٹھک میں داخل ہوا پھر ان لاٹھیوں کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا ''لیں جناب' میرے گھر میں یہی تین لاٹھیاں ہیں۔''

ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر وہ لاٹھیاں تھام لیں۔ میں نے مذکورہ کانسٹیبل سے ایک لاٹھی لے کر اس کا بغور معائنہ کیا۔ وہ اچھی خاصی مضبوط لاٹھی تھی۔ اس کے ایک سرے پر سم چڑھا ہوا تھا۔ میں نے لاٹھی کے دونوں سروں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ لاٹھی کے کسی بھی سرے پر کوئی نشان وغیرہ نہیں تھا ورنہ ہی کوئی انسانی بال سُم میں پھنسا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے باری باری تینوں لاٹھیاں دیکھ ڈالیں۔ مجھے ایسا کوئی سراغ نہ ملا جس سے ظاہر ہوتا کہ ان میں سے کسی لاٹھی سے عارف علی کے سر کو نشانہ بنایا گیا ہوگا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ عارف علی کے سر پر کسی ایسی ہی مضبوط لاٹھی سے وار کیے گئے ہوں گے۔''

میں نے نذر علی سے سوال کیا ''ان کے علاوہ بھی تمہارے گھر میں کوئی لاٹھی ہے؟''

''نہیں جناب' جو تھیں میں نے وہ آپ کو دکھا دی ہیں۔'' نذر علی نے جواب دیا ''اگر آپ کو

میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ میرے گھر کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں۔''

''ضرورت پڑی تو تلاشی بھی لے لوں گا۔''

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ نذر علی یا اس کی بیوی سے مزید' کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی اس لیے چند سوالات کے بعد میں وہاں سے واپس تھانے آ گیا۔

وہ پورا دن تھانے میں بہت مصروفیت رہی۔ میں نے سوچا تھا کہ شام کو گرداور ارشاد حسین سے ملنے جاؤں گا لیکن مجھے ایک لمحے کی فرصت نہ مل سکی لہٰذا گرداور سے ملاقات کو میں نے دوسرے روز تک ملتوی کر دیا۔

دوسرے روز پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔ میری توقع کے عین مطابق عارف علی کی موت کا سبب سر کے عقبی حصے میں لگنے والی چوٹ تھی۔ رپورٹ میں موت کا وقت رات گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد اپنے پاس محفوظ کر لیا اور اے ایس آئی نزاکت علی کے ساتھ گرداور ارشاد حسین کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

گرداور ارشاد حسین کا دو منزلہ پکا گھر چوہدری شہادت علی کی حویلی کے قریب ہی تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اے ایس آئی نے دستک دی۔ اس وقت ہم دونوں سرکاری وردی میں تھے۔

دستک کے جواب میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ وہ شکل وصورت سے ملازمہ دکھائی دیتی تھی۔ ہماری وردیوں پر نظر پڑتے ہی وہ خوف زدہ نظر آنے لگی تاہم دروازہ بند کرنے کے بجائے اس نے سوال کیا۔

''جی' آپ کس سے ملنے آئے ہیں؟''

اے ایس آئی نے پوچھا ''گرداور صاحب گھر پر ہیں؟''

''نہیں جی' گلداور (گرداور) صاحب تو کئی دن سے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) گئے ہوئے ہیں۔'' اس عورت نے جواب دیا۔

اسی وقت مجھے دروازے کے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر نسوانی آواز میں پوچھا گیا ''ساجدہ' دروازے پر کون ہے؟''

ساجدہ نامی اس عورت نے جواب دیا ''بی بی جی' باہر پولیس آئی ہے۔ گلداور صاحب کا پوچھ رہے ہیں۔''

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔'' میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا

"میں گرداور صاحب سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔"

دروازے کی اوٹ سے جواب آیا "میں ارشاد حسین کی بیوی ہوں۔ وہ لائل پور گئے ہوئے ہیں۔ آپ کس سلسلے میں ان سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔" میں نے کہا "ایک قتل کے بارے میں ان سے تھوڑی پوچھ گچھ کرنا تھی۔ وہ لائل پور سے کب واپس آئیں گے؟"

"ہوسکتا ہے آج ہی آجائیں۔" گرداور کی بیوی نے کہا "کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے نا؟"

میں نے کہا "آپ کو پتا ہوگا' کل آپ کے کھیتوں میں سے ایک لاش ملی تھی۔ میں اسی سلسلے میں گرداور صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ عارف علی کی لاش کا ذکر کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں' آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔"

"اس عارف کی وجہ سے نہ جانے اور کون کون سی مصیبت آئے گی۔" وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جلدی سے پوچھا "عارف کی وجہ سے آپ پر کون سی مصیبت نازل ہوئی ہے؟"

وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی "جی...... کچھ نہیں...... میں پریشانی میں' خدا جانے کیا کہہ گئی ہوں۔ بس کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا "ایسی کیا پریشانی ہے؟"

گرداور کی بیوی کے بجائے ملازمہ ساجدہ نے جواب دیا "تھانے دار صاحب چھوٹی بی بی جی سخت بیماری ہیں۔ بڑی بی بی جی اُسی لیے پریشان ہیں۔"

"اوہ' مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو تکلیف دی۔" میں نے نرم لہجے میں کہا "میں پھر کسی وقت گرداور صاحب سے ملنے آجاؤں گا۔"

واپسی پر میرے ذہن میں مختلف خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ گرداور کی بیوی نے بتایا تھا کہ عارف علی کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آگئی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے ٹال مٹول سے کام لیا تھا۔ مجھے صاف محسوس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ملازمہ ساجدہ نے اپنی مالکن کی

پریشانی کا سبب چھوٹی بی بی کی بیماری بتایا تھا۔ ساجدہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ گرداور صاحب کئی دن سے لائل پور گئے ہوئے تھے۔ چھوٹی بی بی سے ساجدہ کی مراد گرداور کی بیٹی ہی ہوسکتی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر گرداور کی بیٹی سخت بیمار تھی تو گرداور صاحب کئی روز سے لائل پور میں کیا کر رہے تھے۔ کہیں وہ بیٹی کے علاج کے سلسلے ہی میں تو نہیں گئے ہوئے تھے؟ گرداور کی گاؤں میں غیر موجودگی سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا کہ وہ عارف علی کے قتل سے آگاہ نہیں ہوگا۔

اچانک اے ایس آئی کی آواز نے مجھے چونکا دیا "ملک صاحب! کیوں نہ چوہدری صاحب کی حویلی کا ایک چکر لگالیں۔"

"وہاں کیا ہے بھئی؟"

"ہوسکتا ہے' گرداور صاحب کا کچھ پتا چل جائے!"

"گرداور کا چوہدری کی حویلی سے کیا تعلق؟"

"جناب' آپ تو جانتے ہی ہیں چوہدریوں کا پٹواریوں اور قانون گوؤں سے کیا تعلق ہوتا ہے۔" اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ پھر بولا "لیکن ارشاد حسین اور چوہدری شہادت علی کے درمیان ایک رشتہ بھی قائم ہونے والا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں چلتے چلتے رک گیا۔

اے ایس آئی نے کہا "جناب' میں نے سنا ہے کہ چوہدری شہادت علی اپنے بیٹے چوہدری عشرت کا رشتہ گرداور کی بیٹی سے کرنا چاہتا ہے۔"

"اچھا!" اے ایس آئی کے انکشاف نے مجھے واقعی حیران کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا "نزاکت علی' تمہیں یہ بات کس نے بتائی ہے؟"

"میری گھر والی نے جناب۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ عورتیں ایسے معاملات کی ٹوہ میں رہتی ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "لیکن اس دنیا میں خالدہ پروین جیسی عورتیں بھی موجود ہیں جنہیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ان کے دیور کن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔"

"تو پھر چلیں چوہدری صاحب کی طرف؟"

میں نے اے ایس آئی کے ساتھ چوہدری کی حویلی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا "گرداور ارشاد حسین کی کتنی اولادیں ہیں؟"

مجھے اس علاقے کے تھانے میں تعینات ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے یہاں کے تمام لوگوں کے بارے میں مجھے تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔ اے ایس آئی نزاکت علی یہیں کا رہنے والا تھا اسی لیے میں نے گرداور کے بارے میں اس سے پوچھا تھا۔

اے ایس آئی نے جواب دیا ''ارشاد حسین کی ایک ہی بیٹی ہے۔ اس کا نام سلمٰی ہے۔''

''اوہ، تو تمہیں اس کا نام بھی معلوم ہے؟''

''اس کا ذکر میں اپنی گھروالی سے سنتا رہتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''بھئی یہ تمہاری گھروالی تو بہت کام کی عورت ہے۔'' میں نے کہا ''اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مقتول عارف علی کا گاؤں کی کس لڑکی سے چکر چل رہا تھا؟''

اے ایس آئی نے کہا ''ہوسکتا ہے، اسے معلوم ہو مگر اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ آج گھر جا کر میں اس سے پوچھوں گا۔''

''ہاں، یہ کام تم یاد سے کرنا۔'' میں نے کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا ''نزاکت علی، گرداور کی ملازمہ نے بتایا تھا کہ چھوٹی بی بی سخت بیمار ہے۔ اگر تمہاری اطلاع کو درست مان لیا جائے تو پھر چھوٹی بی بی کی بیماری سے چوہدری یقینی طور پر آگاہ ہوگا۔ ملازمہ سلمٰی ہی کو چھوٹی بی بی کہہ رہی تھی نا؟''

''ظاہر ہے جناب، گرداور کی بیوی بڑی بی بی اور اس کی لڑکی سلمٰی چھوٹی بی بی۔'' اے ایس آئی نے کہا ''ملک صاحب، اسی لیے تو میں آپ کو چوہدری شہادت کی حویلی لے جانا چاہتا ہوں۔ چوہدری شہادت علی یقینی طور پر گرداور کے بارے میں جانتا ہوگا۔ عارف علی کا قتل چونکہ گرداور کی زمین پر ہوا ہے اس لیے ممکن ہے، گرداور اس قتل پر کوئی روشنی ڈال سکے!''

''میں بھی اسی لیے ارشاد حسین سے ملنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا ''چلو، چوہدری کو بھی چیک کر لیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، وہی کوئی کام کی بات بتا دے۔''

ہم اسی قسم کی گفتگو کرتے ہوئے چوہدری شہادت علی کی حویلی تک پہنچ گئے۔ میں بظاہر تو اے ایس آئی سے باتیں کرتا رہا تھا لیکن میرے ذہن میں گرداور کی بیوی کی بات مسلسل گردش کر رہی تھی ''اس عارف کی وجہ سے نہ جانے اور کون کون سی مصیبت آئے گی؟'' یہ جملہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اس سے ایک بات واضح تھی کہ مقتول کسی نہ کسی حوالے سے گرداور کی بیوی کے لیے پریشانی کا باعث ضرور رہا تھا۔

چوہدری شہادت علی نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ ہمیں اپنی حویلی کی شاندار اور وسیع

[ع]ریض بیٹھک میں لے آیا اور عزت سے بٹھانے کے بعد پوچھا۔

''ملک صاحب! خیریت تو ہے۔ آج فوجوں کا رخ میری حویلی کی طرف ہے۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''چوہدری صاحب، آپ کی بہت تعریف سنی تھی۔ سوچا، آج [ملا]قات ہی کر لی جائے۔''

''تعریف شعریف تو میں نے بھی آپ کی بہت سنی ہے بادشاہو۔'' چوہدری نے قہقہہ لگاتے [ہو]ئے کہا ''مجھے پتا چلا ہے کہ آپ بہت کڑک تھانے دار ہیں۔''

''اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عام روایتی چوہدریوں کے بالعکس خاصے سمجھ دار اور معقول [انس]ان ہیں۔'' میں نے بھی خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''آپ میں نہ تو دوسرے چوہدریوں [والی] پھوں پھاں ہے اور نہ ہی آپ حد سے تجاوز کو پسند کرتے ہیں۔''

وہ میری بات کے دوران میں زیرلب مسکراتا رہا۔ میں اپنا بیان ختم کر چکا تو وہ بولا ''لگتا ہے، [ہمار]ی خوب نبھے گی۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے چوہدری صاحب۔'' میں نے کہا۔

''او چھوڑیں ملک صاحب، باتوں کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ سب سے پہلے بلا تکلف یہ [بتائیں] کہ ٹھنڈا چلے گا یا گرم!''

میں نے جلدی سے کہا ''چوہدری صاحب! تکلفات کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت میں [ڈیوٹی پ]ر ہوں۔ ٹھنڈا گرم پھر دیکھیں گے۔''

''یہ کیا بات کر دی آپ نے۔'' چوہدری شہادت علی نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''ملک صاحب، [آپ] کرتے ہیں آپ بھی۔ آپ پہلی مرتبہ میری حویلی پر آئے ہیں۔ میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے [دوں گا]۔''

اس کی ضد اور اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے مزاحمت نہیں کی اور کہا ''جیسے آپ کی مرضی [چوہدری] صاحب۔''

''ایسا کرتے ہیں۔'' وہ پُرخیال انداز میں بولا ''پہلے ٹھنڈا پیتے ہیں۔ اس کے بعد گرم کا پروگرام [بنا]ئیں۔''

[اپن]ی بات ختم کرتے ہی وہ ملازمین کو ہدایت دینے لگا۔

[خ]اطر مدارت کے دوران میں ہمارے درمیان گفتگو بھی ہوتی رہی۔

چوہدری شہادت علی نے جب ہماری آمد کی غرض وغایت دریافت کی تو میں نے کہا۔

''چوہدری صاحب! دراصل ہم عارف علی کے قتل کے کیس کے سلسلے میں گرداور ارشاد حسین سے ملنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان کے گھر سے پتا چلا ہے کہ وہ کئی دن سے لائل پور گئے ہوئے ہیں چنانچہ ہم آپ کی طرف آئے۔ سوچا' ممکن ہے آپ ہی کچھ ہماری راہ نمائی کریں گے۔''

چوہدری نے پوری بات سننے کے بعد پوچھا'' آپ کو یہ کس نے بتایا کہ ارشاد حسین کئی روز سے لائل پور گئے ہوئے ہیں؟''

میں نے جواب دیا'' اس کی ملازمہ ساجدہ نے۔''

''اچھا۔'' چوہدری نے حیرت کا اظہار کیا'' میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس نے یہ جھوٹ کیوں بولا ہے۔''

''تو کیا ارشاد حسین لائل پور نہیں گیا ہوا؟'' میں نے پوچھا'' اس کی بیوی نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ممکن ہے' آج واپس آجائے۔''

چوہدری بولا'' ارشاد حسین لائل پور تو گیا ہوا ہے لیکن کئی روز سے نہیں بلکہ کل رات سے اور یہ بات بھی درست ہے کہ وہ آج رات واپس آجائے گا۔'' اپنی بات ختم کر کے چوہدری کچھ افسردہ نظر آنے لگا۔

میں نے پوچھا'' کیا بات ہے چوہدری صاحب' آپ پریشان نظر آرہے ہیں؟''

وہ ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے بولا'' ہاں ملک صاحب' بات تو واقعی پریشانی کی ہے۔''

میں نے کہا'' مجھے گرداور صاحب کے گھر سے پتا چلا کہ ان کی بیٹی سخت بیمار ہے؟''

''چوہدری خاصی دیر خاموش رہ کر کچھ سوچتا رہا پھر بولا'' آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ سلمیٰ کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے اور ارشاد حسین اسی سلسلے میں لائل پور گیا ہوا ہے۔ سلمیٰ وہاں اسپتال میں داخل ہے۔ میں بھی وہاں سے ہو کر آیا ہوں۔''

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا'' مجھے سلمیٰ کی بیماری کا سن کر بہت دکھ ہوا ہے چوہدری صاحب بچی (سلمیٰ) کی بیماری کی نوعیت کیا ہے؟''

چوہدری نے جواب دینے سے پہلے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے وہ اس بات کا فیصلہ کر رہا ہو کہ مجھے اصل بات سے آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ چند لمحے تذبذب کا شکار رہنے کے بعد اس نے شروع کیا۔

''ملک صاحب' آپ کو یہ بات تو معلوم ہوگی کہ میں اپنے بیٹے چوہدری عشرت کا رشتہ ارشاد حسین کی بیٹی سلمیٰ سے کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا'' ہاں' میں نے کچھ ایسا سنا تو تھا شاید۔''

وہ بولا'' ملک صاحب! آپ تو ہمارے گھر کے افراد کی طرح ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور مناسب الفاظ کی تلاش میں سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔

میں نے کہا'' چوہدری صاحب! آپ بالکل بےفکر رہیں۔ آپ مجھے ہر مرحلے پر ہم درد اور غم گسار پائیں گے۔''

اس نے ممنون نظر سے مجھے دیکھا' میں نے اضافہ کیا'' آپ مجھ پر اعتماد کریں اور ارشاد حسین کی بیٹی کی بیماری کے بارے میں کھل کر بتائیں۔''

''بات دراصل یہ ہے ملک صاحب۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں گویا ہوا'' سلمیٰ نے کل رات خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔''

''کیا؟'' مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔

''چوہدری سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد تفصیل بتانے لگا'' سلمیٰ نے کل شام کے وقت ڈی۔ ڈی۔ ٹی (کیڑے مار دوا) پی کر اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی۔''

میں نے سوال کیا'' اس نے ایسا کیوں کیا چوہدری صاحب؟''

''ابھی تک اس کے اس فعل کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی ہے۔'' چوہدری شہادت علی نے خلا میں گھورتے ہوئے جواب دیا'' سلمیٰ آخری اطلاع آنے تک اسپتال میں بے ہوش تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کے معدے کو صاف تو کر دیا ہے لیکن اس کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں ہے۔ زہریلی دوا نے اس کے اعضائے رئیسہ کو خاصا متاثر کیا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے تشویش ناک انداز میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

چوہدری گمبھیر لہجے میں بولا'' میں کل ارشاد حسین کے ساتھ ہی اسپتال گیا تھا۔ میں واپس آگیا۔ وہ ابھی تک وہیں ہے۔ اگر سلمیٰ کی طرف سے کوئی تسلی بخش اطلاع ملی تو وہ ہمیں خبر کرے گا پھر ممکن ہے مجھے دوبارہ جانا پڑے۔ ہو سکتا ہے' ارشاد حسین کی بیوی بھی جائے اور ہماری حویلی سے بھی کچھ خواتین کو جانا پڑے گا۔''

میں نے کہا "چوہدری صاحب! میں تو قتل کی تفتیش کے سلسلے میں ادھر آ نکلا تھا۔ مجھے نہیں معلو
تھا کہ آپ کسی حادثے سے گزر چکے ہیں۔ اگر میری آمد سے......"

اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مزید بولنے سے روک دیا پھر خود بولا "مجھے خوشی ہے
آپ اپنے فرائض کے سلسلے میں اس قدر فعال ہیں۔ مجھے خود بھی عارف علی کی موت کا افسوس ہے
سمجھ میں نہیں آتا' اس کا قاتل کون ہوسکتا ہے؟"

میں نے کہا "آپ کو پتا چل گیا ہوگا کہ اس کی لاش گنے کے جن کھیتوں سے ملی ہے' وہ ز
ارشاد حسین کی ملکیت ہے۔ میرا خیال تھا ممکن ہے' اس عقدے کو حل کرنے کے لیے ارشاد حسین ہما
کچھ مدد کرتا لیکن وہ بے چارہ تو خود ایک ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہے۔"

"آپ نے بالکل بجا فرمایا ملک صاحب۔" چوہدری میری تائید کرتے ہوئے بولا "صر
ارشاد حسین ہی کیا' ہم سب اس وقت پریشانی میں گھرے ہوئے ہیں۔ اب ایک حوالے سے ہم ر
دار ہی ہوئے نا!"

اس وقت اچانک میرے ذہن میں گرداور ارشاد حسین کی بیوی کے الفاظ پھر تازہ ہوگئے۔
نے چوہدری سے اس کا تذکرہ کرنا ضروری اور مناسب نہ سمجھا لیکن خود سوچنے لگا۔ گرداور ارشاد ح
کی بیوی کا کہنا تھا کہ عارف علی کی وجہ ان پر کوئی مصیبت آن پڑی تھی اور فی الوقت ان کے لیے
سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ان کی بیٹی نے ڈی۔ ڈی ٹی پی کر خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی
شخص ......خواہ مخواہ اپنی جان نہیں لینا چاہتا۔ خودکشی کرنے والا جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا۔
اسے زیست کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا یا اسے زندگی بے مصرف دکھائی دینے لگتی ہے تو وہ ا
قنوطیت کے عالم میں اپنی جان لینے کے بارے میں سوچتا ہے۔ میرے ذہن میں اس وقت ایک ف
چل رہی تھی اور مختلف خیالات یلغار کررہے تھے۔ عارف حسین کو بڑی بے دردی سے کیوں قتل کیا
سلمٰی نے زہریلی دوا پی کر اپنی جان لینے کی کوشش کیوں کی؟ جس طرح ابھی تک میں اندھیرے
تھا کہ عارف علی کا بہیمانہ قتل کیوں ہوا' اسی طرح سلمٰی کے لواحقین اور چوہدری شہادت وغیرہ بھی
تھے کہ سلمٰی نے خودکشی کی کوشش کیوں کی۔ میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھر رہا تھا کہ آیا سلمٰی
عارف علی کے معاملے میں کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔ عارف علی کے قتل کی تفتیش کے سلسلے میں ابھی تک
معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں' ان کی کچھ کڑیاں اگر سلمٰی سے ملا دی جاتیں تو بات بنتی ہوئی نظ
تھی۔ ایسا ہوسکتا تھا کہ وہ سلمٰی ہی ہو جو عارف علی کے گاؤں میں مستقل قیام کا سبب بن رہی تھ

عارف علی کی دردناک موت کے بعد اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد نظر نہ آیا ہو چنانچہ اس نے خودکشی
کے راستے نجات پانے کی کوشش کی۔

ابھی بہت سی باتیں جواب طلب تھیں اس لیے میں حتمی طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں
نہیں تھا۔ تاہم میں نے ان سارے امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسی وقت یہ سوچ لیا تھا کہ اب
پہلی فرصت میں مجھے سلمٰی سے ملنے لائل پور کے اسپتال جانا ہوگا۔

میں کافی دیر سے خیالات کی نگری میں بھٹک رہا تھا کہ چوہدری شہادت علی کی آواز نے مجھے
چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "ملک صاحب! آپ کہاں پہنچ گئے جناب؟"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! عارف علی قتل کیس کی کچھ کڑیاں گم شدہ ہیں۔ انہیں ڈھونڈنے
کی کوشش کررہا ہوں۔"

"کیا آپ نے اس سلسلے میں کچھ گرفتاریاں بھی کی ہیں؟"

"نہیں جناب۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "میں ان تھانے داروں میں
سے نہیں ہوں جو اپنی شان دکھانے اور رعب جمانے کے لیے خواہ مخواہ غیر مشتبہ افراد کو گرفتار کرکے
حوالات کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ابھی تک بہت سی باتیں مجھے الجھا رہی ہیں پھر مقتول کے لواحقین نے کسی
شخص پر اپنے شک کا اظہار بھی نہیں کیا۔ میں نے جن افراد کا بیان لیا ہے وہ بھی مقتول کے بارے میں
مثبت رائے رکھتے ہیں۔ آج تک کسی سے اس کا جھگڑا وغیرہ بھی سننے میں نہیں آیا اس لیے میں خود بھی
ایسے صلح جو اور امن پسند شخص کے قتل پر حیران ہوں۔"

چوہدری شہادت علی نے کہا "ملک صاحب! آپ نے عارف علی کی تعریف میں جو کچھ سنا ہے'
وہ بالکل درست ہے۔ وہ واقعی اس قابل تھا کہ اس کی تعریف کی جائے۔ میں خود بھی اس کا معترف
تھا۔"

"اور ایسا بندہ اچانک قتل ہو جائے تو گرفتاریاں کرنے کے لیے بہت کچھ سوچنا سمجھنا پڑتا ہے
چوہدری صاحب۔"

"ہاں' یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" چوہدری نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا "میں اگر سلمٰی
کے سلسلے میں پریشان نہ ہوتا تو آپ کے پاس تھانے ضرور آتا۔ میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ عارف
علی کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو جائے۔ آپ کو اس سلسلے میں جب بھی میری مدد کی ضرورت پڑے' میں
حاضر ہوں۔"

''یہ تو آپ کی محبت ہے چوہدری صاحب۔'' میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا ''ورنہ چوہدری حضرات تو عام طور پر میری تفتیش کے راستے میں روڑے اٹکانے کی کوشش ہی کرتے رہتے ہیں۔''

''پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں ملک صاحب!''

میں نے کہا ''آپ کا کہنا درست لیکن اگر انگوٹھا ساتھ دینے پر تیار ہو جائے تو وہ برابر ہو جاتی ہیں۔''

''واہ واہ' کیا دانش مندی کی بات کی ہے آپ نے ملک صاحب۔'' چوہدری نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر بولا ''میں تو اس موقع پر بس اتنا ہی کہوں گا کہ اللہ بُرے وقت سے بچائے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ یہ اللہ کی بنائی ہوئی ایسی مخلوق ہے جو کسی بھی وقت کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

میں نے بے ساختہ کہا ''اور یہی مخلوق عارف علی جیسے ہر دل عزیز انسان کے خون میں ہاتھ رنگنے سے بھی نہیں چوکتی۔ انسان واقعی بہت پیچیدہ مشین کا نام ہے۔''

چوہدری نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا ''ملک صاحب! ابھی تک آپ کی تفتیش اور پوچھ گچھ سے قاتل کے بارے میں کوئی چھوٹا موٹا سراغ بھی ملا ہے یا نہیں؟''

''آپ اسے سراغ تو نہیں کہہ سکتے چوہدری صاحب۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''البتہ ابھی تک میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس قتل کے محرکات میں عورت کی ذات ضرور ملوث ہے۔''

''یہ بھی عجیب بات کہی ہے آپ نے۔'' چوہدری نے کہا ''جب کہ میری معلومات کے مطابق مقتول عارف علی اس لائن کا آدمی نہیں تھا۔''

میں نے چوہدری کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے کہا ''ویسے مقتول کا بڑا بھائی بھی میری نظر میں شک سے بری نہیں ہے۔''

''نذر علی تو بڑا ہی بیبا بندہ ہے ملک صاحب۔''

''وہ بیبا بندہ تو ضرور ہے چوہدری صاحب۔'' میں نے چوہدری کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا ''لیکن بعض اوقات بیبے بندے بھی ایسا ہنر دکھا جاتے ہیں کہ کوئی ایسی بات کی توقع بھی نہیں کر سکتا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''زن' زر اور زمین انسانی تاریخ میں کیا کیا گل کھلاتی رہی ہیں' یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے؟''

''زن......زر......زمین۔'' چوہدری نے پُرسوچ انداز میں تینوں الفاظ تھوڑے وقفے سے دہرائے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''دونوں بھائیوں کے درمیان کوئی زن تو وجہ نزاع ہو ہی نہیں

سکتی۔ کیا آپ زر اور زمین کے بارے میں سوچ رہے ہیں ملک صاحب؟''

''آپ کا اندازہ درست ہے چوہدری صاحب۔'' میں نے کہا ''میں خاص طور پر زمین کے بارے میں سوچ رہا ہوں اور زر تو زمین کے ساتھ مشروط ہے۔''

''ہوں۔'' اتنا کہہ کر چوہدری کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے کہا ''چوہدری صاحب! مجھے پتا چلا کہ مقتول نے مستقل گاؤں میں رہنے کا فاصلہ کر لیا تھا اور وہ اب پوری توجہ سے کھیتی باڑی کرنا چاہتا تھا۔''

''ہاں' ایسا میں نے بھی سنا تھا۔'' چوہدری نے سر کو اثباتی جنبش دی ''جب کہ پہلے اس کا خیال تھا کہ وہ شہر میں کوئی کاروبار کرے گا۔ میں نے اس کے آخری فیصلے کو سراہا تھا۔ جو عزت اور مزہ زمین داری میں ہے' وہ بھلا شہر کے کاروبار میں کہاں لیکن تعلیم یافتہ نسل عام طور پر یا تو سرکاری نوکری ڈھونڈتی ہے یا پھر اسے کاروبار کی سوجھتی ہے۔''

''ہاں' یہ تو ہے۔'' میں نے کہا ''ویسے میرے خیال میں اگر کسی اچھے اور اونچے عہدے کی سرکاری نوکری مل جائے تو اس کا بھی اپنا ہی مزہ ہے۔''

''بس جی' یہ تو اپنی اپنی پسند اور شوق کی بات ہے۔''

مجھے محسوس ہوا کہ چوہدری شہادت علی' عارف علی کے قاتل کے بارے میں مجھے مفید معلومات فراہم نہیں کر سکتا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ''اچھا چوہدری صاحب' اب ہمیں تو اجازت دیں۔''

''جناب' اتنی جلدی بھی کیا ہے۔'' چوہدری بھی اٹھ گیا۔

''اب دوپہر کا کھانا تو کھا کر ہی جائیں۔''

میں نے کہا ''ابھی تو تھانے میں بہت کام ہے۔ عارف علی کا قاتل گرفتار ہو جائے پھر آپ سے کھانا بھی کھائیں گے اور سکون سے بیٹھ کر بات چیت بھی ہو گی۔''

''تو آپ کی دعوت مجھ پر ادھار رہی ملک صاحب۔'' چوہدری شہادت علی نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہم تھانے پہنچے تو دیوار گیر کلاک ساڑھے بارہ کا وقت بتا رہا تھا۔

اگلے روز میں صبح ہی صبح لائل پور کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں نے کل چوہدری شہادت علی کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ میں سلمٰی کو دیکھنے اسپتال جاؤں گا۔ سلمٰی نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کا یہ فعل قابل دخل اندازی پولیس تھا تاہم میں نے پریشان چوہدری کو مزید پریشان کرنا مناسب نہیں

سمجھا تھا۔ میں دراصل ان خدشات کی تصدیق چاہتا تھا جو میرے دل میں سلمٰی کے حوالے سے پیدا ہو چکے تھے۔ اس وقت میں سادہ لباس میں تھا اور حوالدار جمعہ خان میرے ساتھ تھا۔

اسپتال کے احاطے ہی میں گرداور ارشاد حسین سے ملاقات ہوگئی۔ جمعہ خان اسے پہچانتا تھا۔ ہم دونوں اس کے پاس چلے گئے۔ میں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''مجھے ملک صفدر حیات کہتے ہیں۔ میں آپ کے علاقے کا نیا تھانے دار ہوں۔''

ارشاد حسین کی حالت سے انداز ہوتا تھا کہ گزشتہ ایک دو راتیں اس نے جاگ کر گزاری ہوں گی۔ وہ لگ بھگ پچاس سال کا ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کی کاٹھی اور صحت قابل رشک تھی لیکن حالیہ واقعے نے اسے پژمردہ کر رکھا تھا۔

اس نے سرسری انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا ''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر'' پھر وہ چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا ''آپ سے ملاقات ایسے وقت میں ہو رہی ہے کہ میں آپ کی کوئی خاطر مدارات بھی نہیں کر سکتا۔''

''مجھے آپ کی پریشانی کا اندازہ ہے قانون گو صاحب۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ آپ کی صاحب زادی ٹھیک ہو جائے گی۔''

پھر ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہ بے اختیار انداز میں بولا ''آپ کو کیسے پتا چلا کہ سلمٰی نے......''

''میں نے کہا نا' آپ فکر نہ کریں۔'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے سے روک دیا اور کہا ''اگرچہ یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے لیکن میں یہاں کسی تفتیش کے سلسلے میں نہیں آیا۔ آپ اطمینان رکھیں اور مجھے اپنا دوست سمجھیں۔'' میں نے اسے تسلی دی حالانکہ میں چاہتا تو اپنے پورے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس سے سخت رویہ اپنا سکتا تھا لیکن میں نے ایک دکھی باپ کو مزید رنجیدہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''گرداور ارشاد حسین کی آنکھوں میں ممنونیت جھلکنے لگی۔ میں نے مزید کہا ''قانون گو صاحب' میں خاص طور پر سادہ لباس میں یہاں آیا تھا تاکہ آپ کو کسی ہتک کا احساس نہ ہو۔ مجھے نیک اور عزت دار لوگوں کی عزت کا بہت خیال رہتا ہے۔''

یہ ساری باتیں میں یوں بھی کر رہا تھا کہ اس کے ذہن کو تعاون کے لیے ہموار کر سکوں۔ اگر وہ

عدم تعاون کا اظہار کرتا تو میرے یہاں آنے کا مقصد فوت ہو جاتا۔ ارشاد حسین کے بارے میں مجھے اچھی رپورٹ ملی تھی اس لیے بھی میں اپنے دل میں اس کے لیے نیک خواہشات رکھتا تھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا ''میں نے تو کوشش کی تھی کہ گاؤں میں اس واقعے کا کسی کو علم نہ ہو لیکن آپ تو خیر پولیس والے ہیں' آپ سے بھلا کب تک یہ بات پوشیدہ رہ سکتی تھی۔''

میں ے کہا ''بس اسے ایک اتفاق ہی سمجھیں۔ میں عارف علی کے قتل کے سلسلے میں آپ سے ملنے آپ کے گھر گیا تھا تو پتا چلا کہ آپ لائل پور گئے ہوئے ہیں۔''

''کیا آپ کو میری بیوی نے یہ سب کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''پھر؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا ''آپ کے گھر سے تو بس اتنا ہی پتا چلا کہ آپ لائل پور گئے ہوئے ہیں۔ اس واقعے کے بارے میں تو مجھے چوہدری شہادت علی نے بتایا تھا۔''

''اوہ!'' وہ پریشان نظر سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''آپ کسی تشویش میں نہ پڑیں قانون گو صاحب۔'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا ''آپ کے گھر کا معاملہ سمجھیں' میرے گھر کا معاملہ ہے۔''

وہ ایک مرتبہ پھر شکر گزار انداز میں میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے معتدل لہجے میں کہا ''ارشاد حسین صاحب' بات دراصل یہ ہے کہ عارف علی کو جس کھیت میں قتل کیا گیا تھا' وہ زمین آپ کی ملکیت ہے۔ اسی وجہ سے میں آپ سے ملنے آپ کے گھر گیا تھا لیکن آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔''

اس نے پوچھا ''یہاں بھی آپ عارف علی کے قتل کے سلسلے میں مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آئے ہیں ملک صاحب؟''

''بالکل نہیں جناب۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا ''یہاں تو میں خاص طور پر آپ کی صاحب زادی کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔''

''آپ دوسرے تھانے داروں سے بہت مختلف ہیں۔''

میں نے کہا ''یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''مجھے ابھی تک اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا۔'' وہ پُر حیرت لہجے میں بولا ''بہرحال اپنی

آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اس لیے یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ واقعی پولیس کے محکمے میں بھی اچھے لوگ نظر آ ہی جاتے ہیں۔''

میں نے کہا ''معاف کیجئے گا قانون گو صاحب۔ محکمہ مال بھی کچھ کم ''شہرت یافتہ'' نہیں ہے مگر آپ جیسے لوگ بھی تو اسی محکمے میں موجود ہیں۔''

''یہ میں اپنی تعریف سمجھوں یا......؟''

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور زیرلب مسکرانے لگا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ وہ مجھ سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ مجھے اپنا ہمدرد اور مونس سمجھے۔

میں نے کہا ''میں نے تو آپ کی بات کا جواب دیا ہے۔ ویسے میں نے کسی شخص سے آپ کی برائی نہیں سنی۔''

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے پوچھا ''سلمٰی کی طبیعت کیسی ہے؟''

وہ اچانک ملول نظر آنے لگا۔ ''ابھی وہ خطرے سے باہر نہیں ہے ملک صاحب۔'' اس نے گلوگیر آواز میں بتایا ''آپ دعا کریں' میری بچی بچ جائے۔ ہماری تو وہ اکلوتی اولاد ہے۔''

''اللہ مہربانی کرے گا۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''میں نے تو چوہدری شہادت علی سے سنا تھا کہ ڈاکٹروں نے سلمٰی کا معدہ صاف کر دیا ہے؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ بولا ''لیکن ڈاکٹروں کا کہنا یہ بھی ہے کہ زہریلی دوا کے اثرات بہت گہرائی تک پہنچ چکے ہیں جس کی وجہ سے سلمٰی کا دماغ متاثر ہوا ہے۔ وہ ابھی پوری طرح ہوش میں نہیں آئی۔''

میں نے پوچھا ''ارشاد صاحب! خدانخواستہ سلمٰی کے ساتھ کوئی پریشانی تھی؟''

جواب دینے سے پہلے وہ ایک لمحے کو ہچکچایا پھر بولا ''نہیں' ایسی تو کوئی خاص پریشانی نہیں تھی۔''

میں نے کہا ''یہ عمر بڑی جذباتی ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں چھوٹی سی بات کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں اور بعض اوقات انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔''

''سلمٰی بہت حساس ہے ملک صاحب۔'' ارشاد حسین نے بتایا پھر اکلوتی ہونے کے سبب وہ ہماری لاڈلی بھی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''اب آپ سے کیا چھپانا ملک صاحب' آج کل سلمٰی کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ چوہدری شہادت علی اپنے بیٹے عشرت کے لیے سلمٰی کا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی بات طے تو نہیں ہوئی۔ ہم نے چوہدری صاحب سے

سوچنے کی مہلت لی ہے۔

میں نے پوچھا ''آپ نے تو اب تک اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہوگا۔ چوہدری صاحب آپ کے دیکھے بھالے ہیں اور ان کا بیٹا بھی آپ کی نظروں کے سامنے ہے؟''

''ہم میاں بیوی نے تو آپس میں مشورہ کر لیا ہے۔'' قانون گو نے بتایا۔ ''اور ہم اس رشتے پر متفق ہیں۔''

''آپ نے سلمٰی سے اس کی رائے بھی لے لی ہوگی؟''

''یہ ڈیوٹی میں نے اپنی بیوی کو سونپ رکھی تھی لیکن۔''

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ میں نے کہا ''قانون گو صاحب! اگرچہ مجھے آپ کے گھریلو معاملات میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے لیکن اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں؟''

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا ''آپ کی صاحب زادی نے اس رشتے کے لیے ''ہاں'' کہہ دی تھی یا......؟''

ایک لمحے کو وہ متذبذب نظر آیا پھر بولا ''اس نے نہ تو ''ہاں'' کہی تھی اور نہ ہی واضح طور پر اس رشتے سے انکار کیا تھا۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں!''

''سلمٰی نے کہا تھا کہ وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔''

قانون گو نے میری بات کا جواب بھی دے دیا تھا اور اصل بات کو چھپا بھی گیا تھا۔ میں نے بھی اس سلسلے میں اسے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے ان حالات و واقعات سے اپنے طور پر جو نتیجہ اخذ کیا تھا' وہ یہ تھا کہ سلمٰی کی ماں نے جب اس سے چوہدری عشرت کے رشتے کی بات کی تھی تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ ماں باپ چونکہ راضی تھے اس لیے اپنی بیٹی کا فیصلہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا ہوگا تاہم لاڈلی ہونے کے سبب وہ اس پر کچھ دباؤ بھی نہیں ڈالنا چاہتے ہوں گے۔ قانون گو کی بیوی کا وہ جملہ کہ عارف علی کی وجہ سے اور کون کون سی مصیبت آئے گی' بے معنی نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ سلمٰی اور عارف علی کے درمیان کوئی کھچڑی پک رہی تھی جس کی ابھی تک انہوں نے کسی کو ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ مائیں بیٹیوں سے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ عشرت کے رشتے سے انکار کے بعد ممکن ہے سلمٰی کی ماں نے اسے بہلا پھسلا کر یہ بات معلوم کر لی ہو کہ وہ عارف علی سے شادی کا ارادہ رکھتی تھی۔

ظاہر ہے' یہ بات دونوں میاں بیوی کو پسند نہیں آ سکتی تھی۔ عارف علی حیثیت اور خاندانی پس منظر کے حوالے سے قانون گو کا ہم پلا نہیں تھا۔ (گاؤں دیہات میں خاندانی پس منظر اور حیثیت و مرتبے کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے) یہ بھی ممکن ہے' میاں بیوی نے بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی ہو اور اونچ نیچ کا فرق بتایا ہو۔ بہرحال' یہ میرا قرین قیاس اندازہ تھا جو ازاں بعد غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا لیکن موجودہ حالات میں اس سے زیادہ صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے قانون گو سے پوچھا ''میں آپ کی بیٹی سلمٰی کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟''

''نہیں نہیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولا ''آپ آئیں میرے ساتھ۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ بے ہوش تھی۔ اب اللہ جانے۔''

میں نے جمعہ خان کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور قانون گو ارشاد حسین کے ساتھ اسپتال کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ جب ہم برآمدے میں سے گزر رہے تھے تو سامنے سے چوہدری شہادت علی آتے ہوئے نظر آیا۔ اس وقت اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ بعدازاں مجھے معلوم ہوا کہ ان میں ایک تو چوہدری شہادت علی کی بیوی تھی اور دوسری سلمٰی کی والدہ۔ میں نے گزشتہ روز سلمٰی کی والدہ سے اس کے گھر پر کچھ باتیں تو کی تھیں لیکن ہمارا سامنا نہیں ہوا تھا ورنہ میں اسے دیکھتے ہی پہچان جاتا۔

میں نے چوہدری شہادت علی سے مصافحہ کیا تو وہ بولا ''ملک صاحب! آپ یہاں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے!''

''آپ کو حیرت کیوں ہو رہی ہے چوہدری صاحب۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا ''کیا اس اسپتال میں میرے داخلے پر کوئی پابندی ہے؟''

وہ ندامت آمیز انداز میں بولا ''میرا یہ مطلب نہیں تھا جناب۔ کل آپ نے یہاں آنے کے بارے میں کوئی تذکرہ جو نہیں کیا تھا۔''

میں نے کہا ''بس آج صبح اچانک ہی پروگرام بن گیا تھا۔''

وہ میرے جواب سے مطمئن نظر نہیں آتا تھا' شک آمیز لہجے میں بولا ''خیریت ہی سے آئے ہیں نا آپ؟'' بات ختم کر کے وہ سوالیہ انداز میں گرداور ارشاد حسین کو دیکھنے لگا۔

ارشاد حسین اس کی نگاہ میں پوشیدہ سوال کو سمجھ گیا' کھنکار کر بولا ''چوہدری صاحب' پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ملک صاحب سلمٰی کو دیکھنے آئے ہیں۔''

چوہدری مزید الجھ گیا۔ سلمٰی کے ذکر سے وہ چونک اٹھا تھا۔ وہ تو یہی سمجھا ہوگا کہ میں سلمٰی کا بیان لینے آیا ہوں گا۔ ارشاد حسین نے چوہدری کی پریشانی کو بھانپ لیا اور کہا ''چوہدری صاحب! آپ خوامخواہ کسی الجھن کا شکار نہ ہوں۔ میں نے ملک صاحب کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔''

''اچھا!'' چوہدری نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔

چوہدری کا الجھنا اور پریشان ہونا بجا تھا' سلمٰی مستقبل قریب میں اس کی بہو بننے والی تھی لیکن شادی کی بات طے ہونے سے پہلے ہی وہ خودکشی کی کوشش کر کے اسپتال پہنچ گئی تھی۔ ان گھریلو معاملات میں میرا زیادہ عمل دخل چوہدری کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

چوہدری نے ارشاد حسین سے پوچھا ''سلمٰی بیٹی اب کیسی ہے؟''

''کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔''

ارشاد حسین کی بیوی صفیہ بیگم نے کہا ''یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ ہم سلمٰی کے پاس چلیں۔''

ہم سب باتیں کرتے ہوئے سلمٰی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سلمٰی اسپتال کے بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ وہ انیس بیس سال کی ایک خوب صورت لڑکی تھی لیکن اس وقت اس کی شکل مرجھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے بیمار ہو۔ خودکشی کی کوشش نے اسے موت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا تھا۔

اسی اثنا میں ڈاکٹرز راؤنڈ شروع ہو چکا تھا۔ جب ڈاکٹر سلمٰی کے کمرے میں آیا تو صفیہ بیگم نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ڈاکٹر نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے پہلے سلمٰی کا تفصیلی معائنہ کیا۔ سلمٰی کے ایک بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے ڈرپ کی رفتار کو کم کیا اور نرس کو ضروری انجکشن لگانے کی ہدایات دے دیں۔ پھر وہ سلمٰی کے لواحقین کی جانب متوجہ ہوا۔

اس نے ارشاد حسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ہم نے مریضہ کے جسم سے تمام زہریلا مواد نکال دیا ہے لیکن ڈی ڈی ٹی پاؤڈر نے اس کے دل و دماغ کو بُری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ جراثیم کش دوا کے اثرات رفتہ رفتہ زائل ہوں گے۔''

''میری بچی کب تک ٹھیک ہو جائے گی؟'' صفیہ بیگم نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کہا ''میں آپ کے سوال کا حتمی جواب نہیں دے سکتا۔ دراصل زہریلی دوا نے مریضہ کے دماغ کے نازک حصوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایک مرتبہ

یہ مکمل ہوش میں آ جائے پھر ہی کوئی واضح صورت حال سامنے آئے گی۔"

چوہدری نے کہا "ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کا اثر تو معدے پر ہونا چاہیے تھا۔ آپ بتا رہے ہیں کہ اس کے دماغی حصے متاثر ہوئے ہیں۔ یہ کیا ماجرا ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"جناب اگر آپ فوری طور پر مریضہ کو اسپتال لے آتے تو معاملہ اتنا نہ بگڑتا۔" ڈاکٹر نے متحمل لہجے میں جواب دیا "ایسی صورت میں ہم جلد از جلد معدے کو صاف کر دیتے اور اب تک مریضہ بھلی چنگی ہوتی لیکن تاخیر کے باعث زہر خون میں شامل ہو کر پورے بدن میں پھیل چکا ہے۔ دماغ جسم کا سب سے زیادہ نازک اور حساس حصہ ہوتا ہے اسی لیے وہ سب سے زیادہ متاثر بھی ہوا تھا۔ اگر چہ اب مریضہ کے جسم سے تمام زہریلا مادہ نکالا جا چکا ہے لیکن اس کی تباہ کاری باقی ہے اور یہ کوئی معمولی تباہ کاری نہیں ہے۔"

ڈاکٹر مزید کچھ دیر تک ارشاد حسین اور چوہدری شہادت علی کو تفصیلات بتاتا رہا پھر واپس چلا گیا۔ صفیہ بیگم نے ڈاکٹر کے جانے کے بعد ارشاد حسین سے کہا "میں بہت پریشان ہوں۔ میرا خیال ہے، سلمیٰ کو لاہور کے بڑے اسپتال میں لے چلتے ہیں۔"

"ہمیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے صفیہ۔" ارشاد حسین نے مدبرانہ انداز میں کہا "لاہور کے بڑے اسپتال والے بھی وہی علاج کریں گے جو یہاں ہو رہا ہے۔"

چوہدری شجاعت علی سے بھی مشورہ کیا گیا۔ وہ بھی مریضہ کو لاہور لے جانے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے استفسار کیا "ملک صاحب! آپ کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں؟"

میں نے کہا "آخری فیصلہ تو آپ لوگ ہی کریں گے لیکن میرے خیال میں ارشاد صاحب نے خاصی معقول بات کی ہے۔"

"یعنی آپ یہاں کے علاج سے مطمئن ہیں؟"

"میں پہلے بھی ایسے کئی کیس دیکھ چکا ہوں۔" میں نے کہا "اگر فوری طور پر معدہ صاف کر دیا جائے تو خطرے کی بات نہیں رہتی۔ جہاں تک علاج سے مطمئن ہونے والی بات ہے تو اس سلسلے میں میں یہی کہوں گا کہ علاج تو ہو ہی رہا ہے۔ اس کے ساتھ آپ سب لوگ سلمیٰ کی صحت یابی کے لیے بھرپور دعا بھی کریں۔"

"میں تو رات بھر مصلے پر بیٹھی رہی ہوں۔" صفیہ بیگم نے روہانسے لہجے میں کہا "اب اللہ میری سن ہی نہیں رہا تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

میں نے کہا "صفیہ بیگم! اللہ سب کی سنتا ہے۔ یہ سوچنا کہ وہ ہم سے بے خبر ہے یا ہماری طرف توجہ نہیں دے رہا، سراسر گناہ کی بات ہے۔ وہ وہی کچھ کرتا ہے جو ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس سے کچھ مانگتے ہوئے اپنی کوتاہیوں اور نالائقیوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔"

ارشاد حسین نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی آپ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ سلمیٰ نے ڈی ڈی ٹی پاؤڈر پینا کیوں گوارا کیا۔ اگر آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے تو میں زیادہ اصرار بھی نہیں کروں گا حالانکہ میں ایسا کر سکتا ہوں اور......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ چوہدری شہادت علی نے جلدی سے کہا "اور کیا ملک صاحب؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی سلمیٰ کے وجود میں جنبش پیدا ہوئی۔ شاید وہ ہلکا سا کراہی بھی تھی۔ ارشاد حسین اور صفیہ بیگم اس کی طرف لپک گئے۔ میں نے واضح طور پر دیکھا کہ سلمیٰ اپنے ایک بازو کو ہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ وہ بازو نہیں تھا جس میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

صفیہ بیگم، سلمیٰ کے بستر کے قریب ایک بینچ پر بیٹھ گئی اور اس کے بازو کو ہاتھ میں لے کر سہلانے لگی۔ ارشاد حسین نے کہا "شاید یہ ہوش میں آ رہی ہے۔"

چوہدری بولا "میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔"

چوہدرائن بھی صفیہ بیگم کے ساتھ ہی بینچ پر جا بیٹھی۔ میں ارشاد حسین کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سلمیٰ کے سرہانے کھڑا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہا تھا "بیٹی! آنکھیں کھولو۔ مجھے بتاؤ، تم کیا محسوس کر رہی ہو؟"

سلمیٰ دھیمی آواز میں ایک مرتبہ کراہی اور پھر پہلے کی طرح بے سدھ ہو گئی۔ ارشاد حسین نے مایوسی سے میری طرف دیکھا۔ صفیہ بیگم کے ہاتھ میں سلمیٰ کا بازو تھا۔ اچانک میری نگاہ سلمیٰ کے ہاتھ پر گئی اور میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔

اس ہاتھ میں مجھے ایک طلائی انگوٹھی نظر آئی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں انگوٹھی ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ انگوٹھی میرے دل میں کھلبلی مچا رہی تھی۔ وہ ایک بالکل نئی نکور انگوٹھی تھی۔ میں نے شعوری طور پر اس انگوٹھی کی ساخت کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

صفیہ بیگم، سلمیٰ کے بازو کو تھامے تھامے آنسو بہا رہی تھی "میری بچی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ اچھی خاصی ہنستی مسکراتی تھی۔ اب تو آنکھ کھول کر بھی نہیں دیکھ رہی۔"

ارشاد حسین نے بیوی کو سنبھالا دیا اور اسے وہاں سے اٹھا کر ایک طرف لے گیا۔ چوہدرائن البتہ وہیں بیٹھی رہی اور دزدیدہ نظر سے باری باری کبھی سلمٰی کو اور کبھی اس کے ماں باپ کو دیکھتی رہی۔ ارشاد حسین سرگوشیانہ انداز میں اپنی بیوی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی دوران میں چوہدری شہادت علی' ڈاکٹر کو لے کر آ گیا۔ ڈاکٹر نے دوبارہ سلمٰی کا تفصیلی معائنہ کیا پھر پوچھا ''اس نے ہوش میں آنے کے بعد کوئی بات وغیرہ کی تھی؟''

ارشاد نے جواب دیا ''نہیں جناب' کوئی بات نہیں کی۔ بس ایک آدھ بار ہلکا سا کراہی پھر دوبارہ بے ہوش ہو گئی۔''

''چلیں' یہ بھی غنیمت ہے کہ اس نے جنبش کی۔'' ڈاکٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ''اس کا مطلب ہے' یہ بہتری کی طرف آ رہی ہے۔''

میں نے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب' آپ کے خیال میں یہ کب تک بات کرنے کے قابل ہو جائے گی؟''

میں سلمٰی سے بات کرنے کے لیے بہت بے چین ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اس انگوٹھی کا کوئی نہ کوئی تعلق مقتول عارف علی سے ضرور ہو گا۔ عارف علی کی جامہ تلاشی سے جو انگوٹھی والی ڈبیا اور ریشمی رومال برآمد ہوا تھا وہ اس وقت بھی میرے پاس موجود تھا۔ میرے یہاں آنے کا واحد مقصد یہی تھا کہ میں اس سلسلے میں سلمٰی سے بات کروں گا لیکن وہ بات کرنے کے قابل نہیں تھی۔ ایک بات یقینی تھی کہ اگر سلمٰی کے ہاتھ میں موجود انگوٹھی کا تعلق عارف علی کے ساتھ تھا تو پھر سلمٰی' عارف علی کے قاتل سے بھی ضرور واقف ہو گی۔ اگرچہ ابھی تک سلمٰی اور عارف علی کے مابین کسی تعلق کو میں ثابت نہیں کر سکا تھا تاہم اس امکان میں مجھے خاصا وزن دکھائی دے رہا تھا۔

ڈاکٹر نے کچھ چپنے کے بعد جواب دیا ''فی الحال تو میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ ویسے مجھے امید ہے کہ جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے وجود میں حرکت پیدا ہوئی ہے' اگر ایسا دوبارہ ہوتا ہے تو مریضہ کے ہوش میں آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔''

''میں نے پوچھا تھا' یہ کب تک بات کرنے کے قابل ہو جائے گی؟''

''آپ کون ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس مرتبہ سنجیدگی سے میرا جائزہ لیا ''آپ مریضہ سے کس قسم کی بات کرنا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا ''میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں مریضہ کا ایک خیر خواہ ہوں۔''

میں نے دانستہ اپنا ادھورا تعارف کروایا تھا۔ میں ایک خاص مقصد کے تحت ابھی پردے میں رہ کر کام کرنا چاہتا تھا۔ میں چوہدری اور قانون گو کو محسوس کرائے بغیر اپنے شکوک کی تصدیق کر لینا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے سلمٰی کا ہوش میں آنا بہت ضروری تھا۔

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا تو میں نے قانون گو ارشاد حسین سے کہا ''میں آپ کی بیوی سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں' ضرور۔'' وہ صفیہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''میں تنہائی میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

میری اس بات پر چوہدری اور چوہدرائن کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ دونوں سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

صفیہ بیگم نے نحیف آواز میں کہا ''میں بہت پریشان ہوں۔ جب تک سلمٰی ہوش میں نہیں آ جاتی' میں کسی سے کوئی بات نہیں کروں گی۔''

چوہدری نے پوچھا ''ایسی کون سی خاص بات ہے ملک صاحب؟''

''وہ بات صرف صفیہ بیگم ہی سے کی جا سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا اس بات کا تعلق سلمٰی سے ہے؟''

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''نہ صرف سلمٰی سے بلکہ اس کی اس حالت سے بھی ہے۔''

صفیہ بیگم محتاط نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ چوہدری اور چوہدرائن پہلے ہی میری جانب متوجہ تھے۔ ارشاد حسین نے پوچھا ''ملک صاحب! کیا آپ وہ بات مجھے نہیں بتا سکتے؟''

''بتا سکتا ہوں۔'' میں نے کہا ''لیکن کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ میں جو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں' اس کا جواب صفیہ بیگم ہی دے سکتی ہیں۔''

اب وہاں پر موجود تمام افراد صفیہ بیگم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ چوہدری شہادت علی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''ملک صاحب! آپ ذرا میرے ساتھ آئیں۔''

میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ چوہدرائن بھی ہمارے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔ چوہدری نے کہا ''تم اندر ہی ٹھہرو۔''

وہ بُرا سا منہ بنا کر واپس چلی گئی۔

کاریڈور کے ایک دورافتادہ کونے میں آ کر چوہدری نے مجھ سے پوچھا ''ملک صاحب! میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں۔ مجھے بتائیں، وہ کیا بات ہے؟''

میں نے کہا ''چوہدری صاحب، آپ تو جانتے ہیں، میں عارف علی کے قتل کے سلسلے میں تفتیش کر رہا ہوں۔ اس روز جب میں آپ کی حویلی میں آیا تھا تو اس سے پہلے میں ارشاد حسین سے ملنے بھی گیا تھا۔''

''آپ نے مجھے بتایا تھا۔'' چوہدری جلدی سے بولا۔ ''ارشاد حسین سے آپ کی بات نہیں ہو سکی تھی۔''

''لیکن ان کی بیوی سے مختصر سی بات ہوئی تھی۔'' میں نے چوہدری کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں قبل از وقت یہ بات کرنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن میرا خیال ہے، آپ سے چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' چوہدری نے دوستانہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا ''چوہدری صاحب! مجھے امید ہے، آپ سردست اس بات کو آگے نہیں بڑھائیں گے۔''

چوہدری نے کہا ''آپ فکر نہ کریں۔''

میں نے کہا ''اس روز جب میں نے صفیہ بیگم کو بتایا کہ میں عارف علی کے قتل کے سلسلے میں ارشاد حسین سے بات کرنے آیا ہوں تو اس نے بے ساختہ ایک جملہ کہا تھا۔''

چوہدری کی بے قراری دیدنی تھی ''صفیہ نے کیا کہا تھا؟''

میں نے بتایا ''اس نے کہا تھا...... اس عارف کی وجہ سے نہ جانے اور کون کون سی مصیبت آئے گی۔''

''اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟''

''اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عارف علی کی وجہ سے پہلے بھی اس گھرانے پر کوئی مصیبت آ چکی ہے۔''

''ہوں۔'' چوہدری کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا ''اس وقت تو آپ نے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی؟

''شاید اب بھی نہ بتاتا اگر میں سلمیٰ کے ہاتھ میں سونے کی وہ انگوٹھی نہ دیکھ لیتا۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' چوہدری نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے جواب میں اپنی جیب سے ریشمی رومال اور انگوٹھی والی خالی ڈبیا نکال کر چوہدری کو دکھائی ''یہ دونوں چیزیں مقتول کے لباس سے برآمد ہوئی تھیں۔''

چوہدری نے رومال اور ڈبیا کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر پوچھا ''آپ نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟''

''ابھی تک کوئی واضح نتیجہ تو اخذ نہیں کیا۔'' میں نے وہ دونوں چیزیں چوہدری کے ہاتھ سے لے کر واپس جیب میں رکھتے ہوئے کہا ''لیکن بہت جلد حقیقت حال سامنے آ جائے گی، میں کل ہی لاہور جاؤں گا اور ایک خاص بات کی تصدیق کروں گا۔''

''کسی خاص بات کی تصدیق سے آپ کی مراد ہے؟''

میں نے کہا ''مجھے مقتول کی جیب سے سونے کی ایک انگوٹھی کی خریداری کی رسید بھی ملی ہے۔ مذکورہ انگوٹھی ایک ماہ قبل لاہور کے صرافہ بازار کے ''محبوب جیولرز'' نے فروخت کی تھی۔ رسید پر خریدار کا نام عارف علی درج ہے۔ اس انگوٹھی کا وزن پانچ ماشہ اور قیمت پینتالیس روپے ہے۔''

چوہدری نے کھردرے لہجے میں کہا ''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عارف نے جو انگوٹھی خریدی تھی وہ سلمیٰ کے ہاتھ میں ہے؟''

''یہ میں نہیں کہہ رہا، حالات اس جانب اشارہ کر رہے ہیں۔''

''اگر ایسا ہے تو ابھی تصدیق کر لیتے ہیں۔'' چوہدری نے کہا ''میں ارشاد حسین سے سلمیٰ کی انگوٹھی کے بارے میں پوچھ لیتا ہوں۔''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں چوہدری صاحب! ابھی اس کا وقت نہیں آیا اور آپ نے وعدہ کیا ہے کہ فی الحال آپ یہ بات آگے نہیں بڑھائیں گے۔ میں یہ اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ کے خاندان آگے چل کر ایک ہونے والے ہیں۔''

چوہدری نے کہا ''ملک صاحب! اگر آپ کے خدشات درست ثابت ہوئے تو پھر یہ خاندان بھی ایک نہیں ہو سکیں گے۔''

''آپ جذباتی ہو رہے ہیں چوہدری صاحب۔'' میں نے جلدی سے کہا ''ہمیں تفتیش کے سلسلے میں ہر قسم کی خوشگوار اور ناگوار صورتِ حال سے گزرنا پڑتا ہے مجھے افسوس ہے، میری بات نے آپ کو دکھ پہنچایا ہے۔''

چوہدری نے کہا ''سلمیٰ نے ڈی ڈی ٹی پاؤڈر کیوں پیا' یہ بات اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی
ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا ''ایک بات مجھے الجھن میں مبتلا کر رہی ہے' اگر ایسی کوئی
بات تھی تو ارشاد حسین کو چاہیے تھا کہ مجھے بتا دیتا۔ ہمارے بڑے گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔''

میں نے کہا ''چوہدری صاحب! آپ ابھی کسی بات کو حتمی نہ سمجھیں اس طرح خوامخواہ غلط
فہمیاں پیدا ہوں گی۔ پہلے مجھے اپنی تفتیش مکمل کر لینے دیں۔''

وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں نے کہا ''میں ایک بار پھر آپ کو یاد دلا دوں کہ ابھی آپ اس سلسلے میں
سلمیٰ کے والدین سے کوئی بات نہیں کریں گے۔''

''وعدہ کر کے میں نے خود کو پابند کر لیا ہے۔'' چوہدری بولا ''ورنہ جی تو چاہ رہا ہے کہ ابھی جا کر
صفیہ بیگم سے پوچھوں' اس نے عارف علی کے حوالے سے کس مصیبت کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی کہ سلمیٰ کے
ہاتھ کی انگوٹھی کا جغرافیہ اور تاریخ کیا ہے۔''

میں نے کہا ''مجھے امید ہے' آپ اپنے وعدے کے پابند رہیں گے۔''

چوہدری کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے دیکھا' ارشاد حسین بوکھلاہٹ کے انداز میں
کمرے سے نکلا تھا۔ اس کے کاریڈور میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی پھر ہماری طرف آنے لگا۔
بڑی تیزی میں تھا۔

ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ارشاد حسین کی جانب بڑھ گئے۔

وہ ہمارے قریب آ کر بولا ''چوہدری صاحب! سلمیٰ کی نبض ڈوب رہی ہے۔ وہ اکھڑی اکھڑی
سانسیں لے رہی ہے اور ڈرپ بھی چلنا بند ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا ''فوری طور پر ڈاکٹر کو مطلع کیا جائے۔''

''میں بلاتا ہوں ڈاکٹر کو۔'' چوہدری نے کہا ''آپ دونوں اندر جاؤ۔''

میں ارشاد حسین کے ساتھ سلمیٰ والے کمرے میں پہنچا۔ وہاں رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ صفیہ بیگم
باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہی تھی۔ چوہدرائن کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ وہ دونوں سلمیٰ کے بہت قریب
تھیں اور اسے ہلانے جلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

سلمیٰ کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہوتا تھا کہ سانس بہت دشواری سے چل رہی تھی۔ اس
کے چہرے پر سرسوں پھولی ہوئی تھی اور ڈرپ واقعی رک چکی تھی۔ میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ
لگا لیا کہ وہ لب دم ہے۔ اس کے زندہ بچ رہنے کے امکانات معدوم ہو چکے تھے۔

ڈاکٹر آتے ہی سلمیٰ کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ دو نرسیں اس کی ہدایت پر عمل کر رہی تھیں اور
ڈاکٹر خود بھی نہایت مہارت کے ساتھ سلمیٰ کی سانس بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سلمیٰ کو اوپر تلے
تین انجکشن لگائے گئے لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی حالت مزید بگڑتی جا رہی تھی۔

پھر اچانک اس کے جسم نے جھٹکے لینا شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کراہنے لگی۔ ارشاد
حسین' کان اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ سلمیٰ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش
کر رہی ہو۔ ارشاد حسین پوری توجہ سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

سلمیٰ نے دھیمی آواز میں ایک دو لفظ ادا کیے پھر اس کے جسم کو ایک خاصا بڑا جھٹکا لگا اور وہ
ساکت ہو گئی۔ ڈاکٹر نے سلمیٰ کی نبض ٹٹولی' پھر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں کچھ
بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر نے مایوسی سے گردن ہلائی اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

سلمیٰ کی ماں نے دہائی دینا شروع کر دی۔ میں ارشاد حسین کے قریب پہنچا اور پوچھا ''سلمیٰ کیا
کہہ رہی تھی گرداور صاحب؟''

چوہدری ہمارے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ وہ بولا ''ہاں ہاں' ارشاد حسین' بتاؤ۔ سلمیٰ نے اکھڑی
اکھڑی ہوئی سانسوں میں کیا کہا تھا؟''

گرداور کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا ''وہ کہہ رہی تھی...... عارف' پیچھے
مڑ کر دیکھو...... راجوراکٹ......''

''عارف' پیچھے مڑ کر دیکھو' راجوراکٹ؟'' چوہدری نے زیر لب دہرایا ''اس کا مطلب کیا ہوا؟''

میں نے کہا ''میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا ہوں۔''

''کچھ مجھے بھی تو بتائیں؟'' صفیہ خاتون آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

میں خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہاں رکنے کی اب مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میرے علم
میں تین نام آ چکے تھے۔ عارف علی' سلمیٰ اور راجوراکٹ۔ عارف علی قتل ہو چکا تھا۔ سلمیٰ کی خودکشی کی
کوشش بھی آخر کامیاب ہو گئی تھی اور راجوراکٹ کو میں نے تلاش کرنا تھا۔

سلمیٰ کی موت نے اسپتال کے کمرے میں کہرام برپا کر دیا تھا۔ ارشاد حسین اور صفیہ بیگم کا بُرا
حال تھا۔ چوہدری شہادت علی اور چوہدرائن بھی صدمے کی سی کیفیت سے دوچار تھے۔ کسی نے مجھے
روکنے کی کوشش نہیں کی۔

میں سیدھا حوالدار جمعہ خان کے پاس آ گیا" جمعہ خان!"

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا" اپنا تو کام ختم ہو گیا۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

"کیا ہوا ملک صاحب۔" جمعہ خان نے کہا" آپ خاصے تھکے ہوئے نظر آ رہے ہیں؟"

میں نے کہا" میری تھکاوٹ کو بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ' راجو راکٹ کون ہے؟"

"راجو راکٹ؟"

"ہاں' جمعہ خان۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا" راجو راکٹ مجھے فوری طور پر مطلوب ہے۔ تم جانتے ہو اسے؟"

"اسے کون نہیں جانتا جناب۔" جمعہ خان نے کہا" وہ ہمارے علاقے کا مشہور غنڈا ہے' آپ چونکہ ابھی اس تھانے میں نئے آئے......"

"یہ راکٹ کہاں پایا جاتا ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"چوہدری شہادت علی کے پنڈ میں ملک صاحب۔"

"یعنی تینوں کردار ایک ہی گاؤں کے ہیں!"

"کون تینوں جناب؟"

حوالدار کو پوری صورتِ حال سے آگاہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ سلمٰی نے آخری سانوں میں کتنا بڑا انکشاف کیا تھا۔ میں نے اسے مختصر طور پر بتایا تو وہ بولا" جناب' پھر تو سارا کیس ہی حل ہو گیا۔"

"کسی حد تک کہہ سکتے ہو۔"

"کسی حد تک کیوں جناب۔" جمعہ خان پُر جوش لہجے مین بولا" سیدھی سی بات ہے' عارف علی کو راجو راکٹ نے قتل کیا ہو گا۔"

میں نے اس کے تجزیے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو وہ خود ہی بولا" ملک صاحب' مقتول عارف علی کا متوفیہ سلمٰی کے ساتھ ضرور کوئی تعلق تھا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ راجو راکٹ کا ان دونوں سے کیا تعلق تھا۔"

میں نے کہا" جمعہ خان' بہت جلد سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ قبل از وقت ذہن کو تھکانے کی کوشش نہ کرو۔"

"آپ کی تفتیش کا انداز نرالا ہے ملک صاحب۔" جمعہ خان نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا" آپ

سے پہلے جو تھانے دار صاحب اس تھانے میں متعین تھے وہ تو دومنٹ میں پکڑ کر بندے کو لائن حاضر کر دیتے تھے جب کہ آپ بڑے بڑے معاملات کو بھی بڑی سہولت سے لیتے ہیں۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا جمعہ خان۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا" میں نے کہاں رعایت سے کام لیا ہے؟"

وہ بولا" خودکشی اور خودسوزی قابل دخل اندازی پولیس معاملات ہیں لیکن آپ نے کوئی ایکشن نہیں لیا۔"

"تمہارا اشارہ سلمٰی کی طرف ہے؟"

"جی ملک صاحب۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا" جمعہ خان' مجھے بخوبی علم ہے کہ کون سا معاملہ قابل دخل اندازی پولیس ہے اور کون سا نہیں لیکن میرا کام کرنے کا اپنا انداز ہے۔ میرے زیرِ پیش اس وقت سب سے اہم معاملہ عارف علی کے قاتل کی تلاش تھا اور میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس معاملے میں سلمٰی کی ذات بھی ملوث ہے۔ میں نے سلمٰی کے لواحقین کو دانستہ ڈھیل دی تھی اور اس سے مجھے بہت زیادہ فائدہ بھی ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ تم میرے انداز سے واقف ہو جاؤ گے۔"

"تو اب آپ گرداور اور اس کی بیوی کو شامل تفتیش کر لیں گے؟"

میں نے کہا" ضرورت پڑی تو چوہدری اینڈ کمپنی کو بھی نہیں بخشوں گا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے ناصحانہ انداز میں کہا" جمعہ خان! ایک بات میری کان کھول کر سن لو۔ ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے۔ گرم گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے۔"

"یہ تو آپ واقعی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میں نے مزید کہا" اور مصیبت میں گرفتار افراد کے ساتھ تھوڑی بہت رعایت کر دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں گرداور اور اس کی بیوی کو سلمٰی کی خودکشی کی کوشش کے سلسلے میں تنگ کر کے وہ مفید معلومات حاصل نہیں کر سکتا تھا جو میں نے دوستانہ فضا قائم کر کے حاصل کی ہیں۔ ویسے بھی سلمٰی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں تھانے دارانہ انداز میں اس کا بیان لینے کے لیے ان پر مسلط ہو جاتا۔"

"ملک صاحب! آپ تھانے دار کم اور سوشل ورکر زیادہ لگتے ہیں۔" جمعہ خان نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"جمعہ خان! تھانے دار دراصل ایک سوشل ورکر ہی ہوتا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں سر

ہلاتے ہوئے کہا ''اس کے پیچھے قانون کی طاقت ہوتی ہے اور وہ سرکاری وردی پہن کر اپنے علاقے کے لوگوں کے مسائل حل کرنے میں شب و روز مصروف رہتا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا ''جب کوئی تھانے دار ایسا نہیں کرتا تو پھر انصاف ناپید ہو جاتا ہے۔ مظلوم کمزور سے کمزور تر اور ظالم مضبوط سے مضبوط ترین ہو جاتا ہے اور یہ بات اس قادر مطلق کو سخت ناپسند ہے۔''

حوالدار مجھ سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا' جذباتی لہجے میں بولا ''ملک صاحب! میری دعا ہے کہ اس ملک کے سارے تھانے دار آپ جیسے خیالات کے مالک ہو جائیں۔''

واپسی کے سفر کے دوران میں حوالدار جمعہ خان کو میں جائز و ناجائز' غلط و صحیح اور اچھائی و برائی کے درمیان واقع فرق سے بالتفصیل آگاہ کرتا رہا۔ جب ہم تھانے پہنچے تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اے ایس آئی نزاکت علی نے آ کر اطلاع دی ''ملک صاحب! آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

''وہ کیا نزاکت علی؟''

''میری گھر والی نے بہت کام کی بات معلوم کر لی ہے۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولا ''اب عارف علی کے قتل کا معاملہ زیادہ آسانی سے نمٹ جائے گا۔''

نزاکت علی نہیں جانتا تھا کہ اب یہ کیس کون سا رخ اختیار کر چکا تھا۔ بہرحال میں نے پوچھ لیا ''تمہاری گھر والی کیا خبر لائی ہے؟''

''ملک صاحب! آپ کا اندازہ درست تھا۔ عارف علی کا گرداور کی بیٹی سلمٰی سے عشق والا معاملہ تھا۔ دونوں کے درمیان بڑے خفیہ انداز میں چکر چل رہا تھا۔ دونوں راتوں کی تاریکی میں چھپ چھپ کر ملتے تھے۔''

''اب وہ نہ چھپ کر مل سکیں گے اور نہ سب کے سامنے۔'' میں نے کہا ''اس کہانی کا انجام بہت دردناک ہوا ہے نزاکت علی۔''

پھر میں نے اسے ''انجام'' سے آگاہ کیا تو وہ افسردہ نظر آنے لگا ''ملک صاحب! دونوں حرام موت مارے گئے۔''

میں نے کہا ''سلمٰی نے کیڑے مار دوا پی کر جس حماقت کا ثبوت دیا تھا اس کا نتیجہ بہرحال حرام موت کی صورت ہی میں نکلنا تھا۔ ہاں' البتہ وہ مرنے سے پہلے عارف علی کے قاتل کی طرف ایک

واضح اشارہ کر گئی ہے۔''

نزاکت علی کے اصرار پر میں نے اسے سلمٰی کی زبان سے ادا ہونے والے آخری الفاظ کے بارے میں بتایا تو وہ بولا ''ملک صاحب! راجو راکٹ کی شہرت واقعی بہت خراب ہے۔ پہلے والے تھانے دار صاحب اس کے ساتھ خاصی رعایت کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہ خاصا شیر ہو گیا تھا اور من مانی کرتا پھرتا تھا۔''

میں نے کہا ''نزاکت علی' میں ایسے غنڈوں کی غنڈا گردی ناک کے راستے نکالنے کے ایک سو ایک طریقے جانتا ہوں۔ تم چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر جاؤ اور راجو راکٹ کو فوری طور پر گرفتار کر کے میرے پاس لے آؤ۔''

''جو حکم جناب۔'' اے ایس آئی نے سلیوٹ کرتے ہوئے کہا ''آپ نے دل خوش کر دیا ہے۔ اس تھانے سے راجو کی گرفتاری کا پہلی مرتبہ حکم نامہ جاری کیا جا رہا ہے۔ میں ابھی اس پھنے خان کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔''

میں نے کہا ''اور سنو! اگر راجو گرفتاری دینے میں کوئی پس و پیش کرے تم سختی سے بھی دریغ نہ کرنا۔ اس کی من مانیاں میں ناک کے راستے نکال دوں گا۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔'' اے ایس آئی نے خوش ہوتے ہوئے کہا ''راجو کی مرمت کر کے مجھے دلی مسرت ہو گی۔''

اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں نے دوسرے اے ایس آئی سلیمان شاہ کو اپنے پاس کمرے میں بلا لیا۔

''جی حکم ملک صاحب!''

میں نے کہا ''سلیمان شاہ' تم کل صبح ذرا جلدی تھانے پہنچ جانا۔''

''کسی خاص مشن کی تیاری ہے جناب؟''

''ہاں' خاص ہی سمجھو۔'' میں نے کہا ''میں کل لاہور جا رہا ہوں اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔''

''ٹھیک ہے' میں کتنے بجے تک آ جاؤں جناب؟''

''ٹھیک آٹھ بجے۔'' میں نے کہا ''سیدھے میرے سرکاری کوارٹر میں آنا۔ اور ہاں' ہم سادہ لباس میں لاہور جائیں گے۔''

میں آج کا پورا دن تھانے سے باہر رہا تھا اور کل کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں ''محبوب جیولرز'' جا کر تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ جو انگوٹھی میں نے سلمیٰ کی انگلی میں دیکھی تھی کیا وہ وہی انگوٹھی تھی جو عارف علی نے ایک ماہ قبل خریدی تھی۔ اگرچہ عارف علی اور سلمیٰ کے تعلقات اب میرے علم میں آ چکے تھے لیکن میں ہر قسم کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ ویسے تو یہ بات ارشاد حسین سے بھی پوچھی جا سکتی تھی کہ سلمیٰ کی انگلی میں پائی جانے والی انگوٹھی کہاں سے آئی تھی لیکن اس کے گھر میں پہلے ہی ایک قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اے ایس آئی نزاکت علی خالی ہاتھ واپس آ گیا۔

میں نے پوچھا ''راجو راکٹ کو نہیں لائے نزاکت علی؟''

''ملک صاحب' وہ گاؤں سے باہر کہیں گیا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا ''میں نے ہوشیار قسم کے چند سپاہیوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے کہ جیسے ہی وہ گاؤں میں نظر آئے' فوری طور پر اطلاع دیں۔''

''یہ تم نے ٹھیک ہی کیا ہے نزاکت علی۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''لیکن اس کی واپسی کے انتظار میں وقت ضائع نہیں کیا جا سکتا۔'' پھر میں نے اے ایس آئی کو ہدایت دی کہ گاؤں سے باہر بھی جہاں جہاں وہ پایا جاتا ہو' اسے تلاش کیا جائے۔ میں نے اسے چھاپا مار ٹیمیں تشکیل دینے کا مشورہ دیا۔

اگلے روز میں حسب پروگرام اے ایس آئی سلیمان شاہ کے ساتھ لاہور گیا۔ صرافہ بازار میں ''محبوب جیولرز'' کی دکان تلاش کرنے میں مجھے ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ خاصی بڑی اور مشہور دکان تھی۔

دکان کا مالک محبوب خان خاصا خوش مزاج اور شائستہ انسان تھا۔ وہ بڑی محبت سے ملا اور پوچھا ''فرمائیں' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

میں نے اپنے تعارف کروانے کے بعد کہا ''محبوب خان صاحب! میں قتل کے ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔''

وہ مجھے دکان کے اوپری حصے میں لے گیا۔ یہ ایک الگ تھلگ حصہ تھا۔ ہم بیٹھ گئے تو اس نے پوچھا ''کون قتل ہو گیا ہے اور میرا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے کہا ''آپ کی دکان کا تعلق اس قتل سے بڑا گہرا ہے۔''

وہ سراسیمہ نظر آنے لگا ''جناب' ذرا کھل کر بتائیں۔''

میں نے پوچھا ''قریب قریب ایک ماہ قبل آپ کی دکان سے ایک انگوٹھی خریدی گئی تھی۔ آپ کو کچھ یاد ہے؟ خریدار کا نام عارف علی تھا؟''

''جناب' ایک ماہ میں تو ہم نے سینکڑوں انگوٹھیاں فروخت کی ہوں گی۔'' محبوب خان نے کہا ''آپ کس انگوٹھی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اپنی جیب میں سے انگوٹھی کی خالی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی اور کہا ''میں اس انگوٹھی کی بات کر رہا ہوں۔''

''ڈبیا تو ہماری ہی دکان کی ہے۔'' وہ بولا ''ہم انگوٹھیوں کے لیے مخصوص ڈبیا بنواتے ہیں۔''

''اور یہ ہے رسید اس انگوٹھی کی۔'' میں نے عارف حسین کی جیب سے ملنے والی رسید اسے دکھائی۔

وہ رسید لے کر پڑھنے کے بعد بولا ''ملک صاحب! یہ رسید میرے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے۔ آخر معاملہ کیا ہے؟''

''گھبرانے کی بات نہیں ہے۔'' میں تشفی آمیز لہجے میں بولا ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بس ایک بات کی تصدیق کے لیے یہاں آیا ہوں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس انگوٹھی کا ڈیزائن کس قسم کا تھا؟''

''یہ کون سی مشکل بات ہے۔'' وہ جلدی سے بولا پھر دکان کے اندر موجود ایک ملازم کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔

''مشتاق محمد۔'' اس نے ملازم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اس رسید والی انگوٹھی کا جو مخصوص ڈیزائن تم نے بنایا تھا' وہ یاد ہے تمہیں۔''

وہ رسید کو دیکھنے کے بعد بولا ''مجھے اچھی طرح یاد ہے خان صاحب۔ عارف علی نے مجھ سے خصوصی فرمائش کی تھی کہ انگوٹھی زبردست ہونا چاہیے۔''

''تم عارف علی کو جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''جناب' عارف علی اپنے محلے میں رہتا تھا پر پتا نہیں کیا ہوا' وہ شہر چھوڑ کر واپس گاؤں چلا گیا ہے۔''

میں نے کہا ''اب اس نے گاؤں بھی چھوڑ دیا ہے۔''

''اچھا جی' پھر کہاں گیا ہے؟''

میں نے چھت کی طرف اشارہ کیا ''اب وہ وہاں سے واپس نہیں آئے گا۔''

پھر میں نے مختصر الفاظ میں مشتاق محمد اور محبوب خان کو عارف علی کے قتل کے بارے میں بتایا۔

مشتاق محمد افسردہ لہجے میں بولا ''عارف علی بہت اچھا آدمی تھا جناب۔ محلے میں میرا صرف اسی سے اٹھنا بیٹھنا تھا۔ یہ بات اس نے مجھے بڑے رازدارانہ انداز میں بتائی تھی کہ وہ کسی لڑکی کو سونے کی انگو کا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے خان صاحب سے سفارش کر کے انگوٹھی کی قیمت میں خاصی رعایت بھ کروادی تھی۔''

محبوب خان نے کہا ''مشتاق محمد، اسی نمونے کی ایک انگوٹھی لاکر ملک صاحب کو دکھاؤ۔''

مشتاق محمد گیا اور تھوڑی ہی دیر میں خوب صورت ڈبیا میں سجی ایک انگوٹھی لے آیا۔ میں نے پہ نظر میں ہی پہچان لیا۔ وہ ہو بہ ہو ویسی ہی انگوٹھی تھی جیسی میں نے متوفیہ سلمٰی کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔

''یہ لیں، اچھی طرح دیکھ لیں ملک صاحب۔'' محبوب خان نے انگوٹھی والی ڈبیا مشتاق محمد کے ہاتھ سے لے کر مجھے تھمادی ''اس انگوٹھی اور عارف علی والی انگوٹھی میں بس ایک ہی فرق ہے۔'' اس مجھے آگاہ کیا۔

میں نے کہا ''کیا میں اسے ڈبیا سے باہر نکال کر دیکھ سکتا ہوں؟''

''ضرور دیکھیں جناب۔''

میں نے انگوٹھی کو ڈبیا سے باہر نکال لیا پھر اس کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد اپنی را ظاہر کی ''میرا خیال ہے، نمایاں فرق تو یہ ہے کہ انگوٹھی پانچ ماشہ سے زیادہ وزن کی ہے۔''

''آپ کا خیال صدفی صد درست ہے۔'' محبوب خان نے ستائشی انداز میں کہا ''یہ انگوٹھی با ماشہ یعنی پورے ایک تولے کی ہے۔ شاہی محلے کی ایک بائی نے خاص طور پر بنوائی ہے۔''

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد میں نے محبوب خان کے تعاون کا شکریہ کیا اور سلیمان شاہ کے ساتھ دکان سے باہر نکل آیا۔

اب اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ عارف علی اور سلمٰی کے درمیا محبت کی کہانی بڑے خفیہ انداز میں چل رہی تھی اور وہ چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ ایسی ہی ایک ملاقا کے دوران میں عارف علی نے سلمٰی کو طلائی انگوٹھی کا تحفہ پیش کیا لیکن یہ ملاقات عارف علی کی زندگی آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اب حل طلب بات یہ تھی کہ اگر واقعی راجو راکٹ ہی عارف علی کا قا تھا تو اسے عارف سے کیا دشمنی تھی۔ کہیں وہ سلمٰی کا طلب گار تو نہیں تھا؟ راجو راکٹ کی گرفتاری،

ضروری ہوگئی تھی۔ بہت ضروری اور بہت جلد۔

میں تھانے پہنچا تو پتا چلا، چوہدری شہادت علی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کافی انتظار کیا پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس چلا گیا تھا۔ مجھے تھانے آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ چوہدری شہادت علی کی آمد کی اطلاع آ گئی۔ میں نے فی الفور اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چوہدری نے پوچھا ''ملک صاحب! آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟''

''کون سی تفتیش چوہدری صاحب؟''

''عارف علی کے قتل کی تفتیش۔''

میں نے کہا ''آخری مرحلے میں ہے۔''

''آپ نے قاتل کو گرفتار کرلیا ہے؟''

میں نے کہا ''میں نے راجو کی گرفتاری کے لیے اپنے بندے دوڑا دیے ہیں۔ انشاء اللہ آپ بہت جلد اسے حوالات کے اندر دیکھیں گے۔''

چوہدری نے پوچھا ''کیا یہ بات ثابت ہوگئی کہ قتل راجو ہی نے کیا ہے؟''

''فی الحال تو یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ عارف علی اور سلمٰی ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔'' میں نے دھیمی آواز میں کہا ''جس انگوٹھی کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا، وہ عارف علی نے سلمٰی کو محبت کے تحفے میں دی تھی۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''اور جہاں تک راجو راکٹ کے قاتل ہونے کا سوال ہے تو اس کا صحیح پتا تو اس وقت چلے گا، جب وہ ہمارے قابو میں آئے گا۔''

''اچھا ہوا، مجھے وقت سے پہلے معلوم ہوگیا۔'' چوہدری خیال افروز لہجے میں گویا ہوا ''اگر میں اپنے بیٹے کا رشتہ وہاں کر دیتا تو نہ جانے وہ لڑکی شادی کے بعد کیا گل کھلاتی۔''

میں نے چوہدری کی بات پر تبصرہ کرنے کے بجائے اپنے طور پر کہا ''چوہدری صاحب! اللہ کا کوئی کام خالی از مصلحت نہیں ہوتا۔''

''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میں نے کہا ''عارف علی اپنی جان سے گیا، سلمٰی نے اپنے محبوب کے غم میں خودکشی کر لی۔ اگر سلمٰی یہ سنگین قدم نہ اٹھاتی تو ممکن ہے، عارف علی کا قاتل اسے بھی ٹھکانے لگا دیتا۔ یعنی دونوں صورتوں میں اس کی موت یقینی تھی لیکن وہ اپنے مقررہ وقت اور طریقے سے ہی آتی ہے۔''

"میرا خیال ہے' قاتل سلمٰی کے خون میں ہاتھ رنگنے کی کوشش نہ کرتا۔" چوہدری نے کہا "عارف علی کو راستے سے ہٹانے کے لیے تو وہ یہ انتہائی قدم اٹھا سکتا تھا مگر سلمٰی کو تو وہ حاصل کرنا چاہتا تھا' اس کی جان کیسے لے سکتا تھا۔"

میں نے کہا "ابھی تک یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ قاتل نے سلمٰی کے حصول کے لیے عارف علی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ راجو راکٹ ہی عارف علی کا قاتل ہے۔"

"راجو راکٹ کی گرفتاری کے سلسلے میں اگر آپ کو میرے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔" چوہدری نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"آپ کی اس مخلصانہ پیش کش کا بہت بہت شکریہ چوہدری صاحب۔" میں نے کہا "اگر آپ کے تعاون کی ضرورت پڑی تو میں آپ کو ضرور تکلیف دوں گا۔"

ہمارے درمیان کافی دیر تک راجو راکٹ' سلمٰی اور عارف علی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر چوہدری واپس چلا گیا۔ میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

تیسرے روز رات میں راجو راکٹ کی گرفتاری عمل میں آ سکی۔ میں اس وقت تھانے سے اٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ نزاکت علی نے آ کر اطلاع دی۔

"ملک صاحب! راجو راکٹ گرفتار کر لیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" میں یہ خبر سن کر اچھل پڑا تھا۔

نزاکت علی نے کہا "ابھی حاضر کرتا ہوں جناب۔"

تھوڑی دیر کے بعد راجو راکٹ میرے سامنے موجود تھا۔ وہ صورت سے ہی سکہ بند غنڈا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے خاصی صحت مند مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں اور گراں ڈیل تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھ کڑی لگی ہوئی تھی لیکن وہ کچھ زیادہ خوف زدہ نظر نہیں آتا تھا۔

"تو تم ہو راجو راکٹ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ مسکین سے لہجے میں بولا "جناب' نام تو میرا ریاض احمد ہے لیکن لوگوں نے راجو راکٹ مشہور کر دیا ہے۔ آپ نے مجھے کیوں گرفتار کرایا ہے' کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت پیدا ہو گئی ہے؟"

میں نے اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا "سؤر کی اولاد! کیا تم سمجھتے ہو کہ یتیموں والی صورت بنا کر تم مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اس غلط فہمی کو تم اپنے ذہن سے نکال دو۔ میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری قسم کا۔"

"وہ تو مجھے آپ کے تھپڑ ہی سے اندازہ ہو گیا ہے جناب۔" وہ سادگی سے بولا "پہلے والے تھانے دار صاحب میرا بہت خیال رکھتے تھے۔"

اے ایس آئی نے اس کی کمر میں لات رسید کرتے ہوئے کہا "سیدھا ہو کر کھڑا ہو راکٹ کی اولاد۔ ملک صاحب بھی تمہارا بہت خیال کریں گے مگر ذرا وکھرے انداز میں۔"

"راجو راکٹ!" میں نے اپنی چھڑی (رولر) اس کے سینے میں چبھوتے ہوئے کہا "میں ان لوگوں کا بہت خیال رکھتا ہوں جو میرے سامنے سچ بولتے ہیں۔"

"میں تو ہمیشہ سچ ہی بولتا ہوں جناب۔" وہ سنجیدگی سے بولا "آپ کے سامنے بھی سچ ہی بولوں گا۔ آپ پوچھیں' کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "تم نے عارف علی کو کیوں قتل کیا تھا؟"

"کون عارف علی؟"

اے ایس آئی نزاکت علی نے اس کی گردن پر ایک زوردار ہاتھ جماتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا "تمہاری ماں کا خصم عارف علی جسے تم نے گرداور ارشاد حسین کی زمین پر قتل کیا تھا!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔" وہ رونی صورت بنا کر بولا "میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"یہ ایسے نہیں مانے گا ملک صاحب۔" اے ایس آئی نے کہا "اس کے ساتھ دوسرا طریقہ آزمانا پڑے گا۔"

میں نے ایک سپاہی کو بھیج کر حوالدار جمعہ خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جمعہ خان نے آ کر مجھے سلیوٹ کیا۔ میں نے کہا "جمعہ خان' تمہیں مجھ سے شکایت تھی نا کہ میں بڑے بڑے معاملات کو بھی بڑی سہولت سے لیتا ہوں جب کہ سابق تھانے دار صاحب' دومنٹ میں بندے کو پکڑ کر لائن حاضر کر دیتے تھے۔" پھر میں نے راجو راکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس بندے کو تمہارے سابق تھانے دار صاحب نے کتنی مرتبہ لائن حاضر کیا تھا؟"

جمعہ خان خجالت آمیز انداز میں بولا "میری سوچ غلط تھی جناب۔"

"میں نے جو پوچھا ہے' اس کا جواب دو۔" میں نے کہا "راجو راکٹ آج سے پہلے کتنی مرتبہ گرفتار ہوا ہے؟"

"ایک بار بھی نہیں۔"

"تمہارے خیال میں یہ ایک نہایت ہی معزز انسان ہے؟"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔"

"اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو پھر یہ آزاد کیوں تھا؟" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "اس کے نامہ اعمال پر تو بدمعاشی اور غنڈا گردی کی اتنی داستانیں رقم ہیں کہ اسے اس وقت جیل میں ہونا چاہیے تھا۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" حوالدار نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

جمعہ خان، میں راجو راکٹ کو آج کی رات تمہارے حوالے کر رہا ہوں۔" میں نے فیصلہ کن لہ... میں کہا "اب تمہاری صلاحیت کا امتحان ہے۔ اسے یقین دلا دو کہ ہمارے پاس کیسے کیسے راکٹ موجو... ہیں۔ مجھے بس ایک سوال کا جواب چاہیے...... عارف علی کو کیوں قتل کیا گیا؟"

"آپ فکر نہ کریں ملک صاحب۔" جمعہ خان نے راجو کو بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا "اس سور... آج پتا چل جائے گا کہ تھانا کس جگہ کا نام ہے۔ نانی، دادی خواب میں نہ آ گئی تو میرا نام بھی جمعہ خا... نہیں۔"

میں جمعہ خان اور اے ایس آئی نزاکت علی کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اپنے کوارٹر... آ گیا۔ مجھے امید تھی کہ جمعہ خان، راجو کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہ فرض محال اگر را... نے عارف علی کو قتل نہیں بھی کیا تھا تو پھر بھی اس کی "آؤ بھگت" بہت ضروری تھی۔ وہ ایک طویل عر... سے آزادانہ اپنی بدمعاشی چمکا رہا تھا۔ میں نے اس کو زنجیر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دوسری صبح میں تھانے پہنچا تو صورت حال خاصی خوش گوار تھی۔ میں اپنے کمرے میں جا کر... تو جمعہ خان نے خوش خبری سنائی "ملک صاحب! راجو نے عارف علی کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے۔"

"اسے میرے پاس لے کر آؤ۔"

تھوڑی ہی دیر بعد راجو راکٹ میرے سامنے موجود تھا۔ اس کے شانے ڈھلکے ہوئے تھے... شکل پر بارہ بج رہے تھے۔ جمعہ خان نے دل کھول کر اس کی درگت بنائی تھی۔ جمعہ خان واقعی ا... "باصلاحیت" حوالدار تھا۔

میں نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا اور پوچھا "راجو راکٹ! تم نے ایک معصوم اور بے... انسان کے خون میں ہاتھ کیوں رنگے؟"

"جناب، میں لالچ میں آ گیا تھا۔" وہ گڑگڑایا۔

"کیا لالچ؟"

"فیکے ڈوگر نے مجھے اس کام کے لیے پورے پانچ سو روپے دیے تھے۔"

"تو تم نے پانچ سو روپے کی خاطر ایک انسان کی جان لے لی؟"

"جناب، پانچ سو روپے اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔" وہ نظر چراتے ہوئے بولا "لالچ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور میں نے......"

"یہ فیکا ڈوگر کون ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"چوہدری شہادت علی کی حویلی میں ملازم ہے۔"

"کیا؟" میں چونک اٹھا۔

جمعہ خان نے تصدیقی لہجے میں کہا "ملک صاحب! رفیق حسین عرف فیکا ڈوگر چوہدری شہادت علی کا ایک پرانا ملازم ہے۔"

میرا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے جمعہ خان سے کہا "اس راکٹ کی اولاد کو لے کر جا کر حوالات میں بند کر دو اور اس کی سخت نگرانی کرو۔ کسی بھی شخص کو اس سے ملنے نہ دیا جائے۔"

حوالدار راجو کو لے کر چلا گیا تو میں نے اے ایس آئی سلیمان شاہ کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ عارف علی کو قتل کرنے کے احکامات چوہدری شہادت علی کی حویلی سے جاری کیے گئے تھے، میں کسی اور ہی زاویے سے سوچنے لگا تھا۔ ظاہر ہے، فیکا ڈوگر اتنی بڑی رقم اپنی جیب سے تو نہیں نکال سکتا تھا (اس زمانے میں پانچ سو روپے اچھی خاصی رقم ہوتی تھی) اگر راجو راکٹ کی یہ بات سچ تھی کہ فیکے نے اسے عارف علی کو قتل کرنے کا معاوضہ پانچ سو روپے دیا تھا تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ کسی اور شخص نے فیکے کو اس ڈیل کا حکم دیا ہوگا اور اس شخص کا تعلق حویلی کے مالکان سے ہوسکتا تھا۔

میرے ذہن میں تین نام چمکنے لگے۔ چوہدری شہادت علی، اس کی بیوی اور چوہدری عشرت۔ چوہدری کے گھر کے باقی افراد بچوں اور بچیوں پر مشتمل تھے جو ظاہر ہے، اس معاملے میں ملوث نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے فوری طور پر چوہدری شہادت علی کی حویلی جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اے ایس آئی سلیمان شاہ کمرے میں آیا تو میں نے اس سے کہا "ہم ابھی چوہدری شہادت علی کی حویلی میں جا رہے ہیں۔ تم پوری تیاری کر لو۔ ممکن ہے، گرفتاریاں بھی کرنا پڑیں۔"

ایک گھنٹے بعد میں اے ایس آئی سلیمان شاہ اور دو سپاہیوں کے ساتھ چوہدری شہادت علی کی

حویلی میں موجود تھا۔ چوہدری نے حسبِ سابق خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور ملازم سے بیٹھک کا دروازہ کھلوانے کو کہا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب! آج میں بیٹھنے نہیں آیا۔ آپ کا ملازم فیکا کہاں ہے؟"

"فیکا ادھر ہی ہوگا۔" چوہدری نے جواب دیا "آپ کو فیکے کی کیا ضرورت پڑ گئی ملک صاحب؟"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! باقی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ پہلے آپ فیکے کو یہاں بلوائیں۔"

"آپ اندر تو بیٹھیں جناب۔ فیکا بھی آ جاتا ہے۔ چوہدری کا ملازم اس وقت تک بیٹھک کھلوا چکا تھا۔ چوہدری نے کہا "تشریف لائیں ملک صاحب اور مجھے ساری بات بتائیں۔"

ہم چوہدری کی بیٹھک میں آ گئے۔ میں نے چوہدری سے کہا "ساری بات یہ ہے چوہدری صاحب کہ راجو راکٹ کو ہم نے گرفتار کر لیا ہے اور اس نے عارف علی کے قتل کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا" چوہدری اطمینان بخش لہجے میں بولا "پھر تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ آپ فیکے کو کیوں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟"

"ابھی یہ مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا چوہدری صاحب۔" میں نے کہا "راجو راکٹ نے قتل کا اقرار تو کر لیا ہے لیکن اس نے یہ قتل فیکے کے ایما پر کیا ہے۔ وہ محض اجرتی قاتل ہے۔"

"فیکے کی بھلا عارف علی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"یہ تو فیکا ہی بتائے گا۔" میں نے کہا "آپ فوری طور پر اسے یہاں بلائیں۔ راجو نے بتایا ہے کہ فیکے نے اس قتل کے لیے اسے پورے پانچ سو روپے دیے تھے۔"

"میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" چوہدری الجھن آمیز لہجے میں بولا "بہر حال میں فیکے کو بلاتا ہوں۔"

پھر اس نے ایک ملازم کو فیکے کے لیے بھیج دیا۔ اس کے ملازم نے تھوڑی دیر بعد آ کر بتایا

"چوہدری صاحب' فیکا حویلی میں نہیں ہے۔"

"حویلی میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟" چوہدری غصے سے دہاڑا "کسی سے پوچھو اس کے بارے میں۔"

میں نے معلوم کر لیا ہے چوہدری صاحب۔" ملازم نے وضاحت کی "فیکا اس وقت ڈیرے پر ہے۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا "ہم ڈیرے پر چلتے ہیں۔" پھر میں نے چوہدری سے پوچھا "ڈیرا کس طرف ہے چوہدری صاحب؟"

"ٹھہریں' میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" چوہدری بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم سب باجماعت ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ملازم نے جس ڈیرے کا ذکر کیا تھا' وہ دریا کے کنارے مغربی جانب واقع تھا۔ اس ڈیرے کے آس پاس چوہدری شہادت علی نے باغات لگا رکھے تھے۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں ڈیرے پر پہنچ گئے۔

رفیق حسین عرف فیکا ڈوگر اس وقت ڈیرے پر موجود تھا۔ میں نے اے ایس آئی سلیمان شاہ کو حکم دیا "اسے گرفتار کر لو۔"

اے ایس آئی اور دو صحت مند سپاہی فیکے کی طرف بڑھے۔ دونوں سپاہیوں نے بغلوں میں ہاتھ پھنسا کر فیکے کو قابو کیا اور اے ایس آئی نے پلک جھپکتے میں اسے ہتھکڑی پہنا دی۔

فیکا حیرت زدہ نظر سے ہم سب کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے چوہدری شہادت علی سے فریاد کی "چوہدری صاحب' مجھے بچا لیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے' اگر تم نے کچھ نہیں کیا تو "ریں ریں" کیوں کر رہے ہو۔"

چوہدری نے آگے بڑھ کر فیکے کے منہ پر ایک چانٹا رسید کیا اور خونخوار لہجے میں بولا "یہ میں کیا سن رہا ہوں فیکے' تم نے ملک صاحب کے سامنے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا چوہدری صاحب۔"

"جرم تم نے کیا' کیا کیے ہیں یہ تو تمہیں تھانے چل کر پتا چلے گا۔" سلیمان شاہ نے اس کی پنڈلی پر ایک زوردار ٹھڈا رسید کیا۔ "وہ تمہاری ماں کا یار راجو راکٹ بھی ادھر ہی بند ہے۔"

"راجو راکٹ گرفتار ہو گیا" راجو راکٹ کا نام سن کر فیکے کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"اور اس نے ہمیں سب کچھ بتا بھی دیا ہے۔" میں نے اسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا "اب تم شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کر لو ورنہ ہمیں سچ اگلوانے کے سو ڈھنگ آتے ہیں۔"

چوہدری نے غصیلے لہجے میں فیکے سے پوچھا "فیکے' ملک صاحب بتا رہے ہیں تم نے پانچ سو روپے دے کر راجو راکٹ سے عارف علی کو قتل کروایا ہے۔ بولو' تم نے ایسا کیوں کیا۔ عارف علی سے

"تمہیں کیا پرخاش تھی؟"

وہ گھگیانے لگا "راجوراکٹ جھوٹ بولتا ہے جناب۔ میں تو اس سے ملتا جلتا بھی نہیں ہوں اور ......اور میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی۔"

"جھوٹ اور سچ کا فیصلہ کرنا ہمیں بہ خوبی آتا ہے۔" اے ایس آئی سلیمان شاہ نے تیز لہجے میں کہا "تم تھانے جاکر فرفر بولنے لگو گے۔"

"فیکے نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا پھر چوہدری سے التجا آمیز لہجے میں بولا "چوہدری جی' خدا کے واسطے مجھے بچالیں۔ میں نے راجوراکٹ سے کوئی بات نہیں کی تھی اور قتل والے معاملے سے تو میرا ذرا سا بھی تعلق نہیں ہے۔"

"پھر کس کا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی......وہ......وہ......میرا مطلب ہے' میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ وہ کوئی بات کہتے کہتے اچانک بات بدل گیا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ دال میں کچھ کالا تھا۔ کوئی ایسی بات فیکے کی زبان تک آتے آتے رک گئی تھی جو اس کے لیے یا کسی اور کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔

میں نے اے ایس آئی سے کہا "تم اسے لے کر تھانے پہنچو۔ میں ذرا چوہدری صاحب سے بات کرکے آتا ہوں۔"

سلیمان شاہ اور دونوں سپاہی فیکے کو لے کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ میں چوہدری کے ساتھ واپس اس کی حویلی میں آگیا۔

چوہدری نے کہا ملک صاحب' اگر فیکا واقعی قصوروار ثابت ہوگیا تو میں خود اسے آپ کے حوالے کروں گا۔ آپ جو چاہیں اس کے ساتھ سلوک کریں۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب' آپ فیکے کو میرے حوالے تو جب کریں گے' جب وہ آپ کے پاس ہوگا۔ فیکا تو اب میرے قبضے میں آچکا ہے۔ ویسے آپ بےفکر رہیں۔ اگر اس نے کوئی جرم نہیں کیا تو میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ بہ صورت دیگر میں اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ معتدل لہجے میں بولا "میں ناجائز رعایت کرنے کے لیے آپ

سے کبھی نہیں کہوں گا۔ ویسے میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ فیکے کے پاس پانچ سو روپے کہاں سے آئے اور اس نے راجوراکٹ سے عارف علی کو کیوں قتل کروایا۔ میرے علم میں یہ بات بھی نہیں ہے کہ فیکے کا کوئی تعلق سلمٰی سے رہا ہو پھر عارف علی سے اس کی دشمنی سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔"

"آپ بہت بھولے ہیں چوہدری صاحب۔" میں نے کہا "آپ تو یہ بات بھی نہیں جانتے تھے کہ سلمٰی اور عارف علی کے بیچ کون سی کھچڑی پک رہی تھی۔"

وہ ندامت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا "آپ کی اس بات سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ فیکے کے پاس اتنی رقم نہیں ہوسکتی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے کسی نے یہ رقم مہیا کردی ہو۔"

"مثال کے طور پر؟"

میں نے کہا "معاف کیجئے گا چودھری صاحب' میرے خیال میں یہ کام حویلی ہی کے کسی بااثر فرد کا ہوسکتا ہے۔"

"یعنی آپ ہم پر شک کررہے ہیں؟"

"شک کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا چوہدری صاحب۔" میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا "تفتیش کی گاڑی شک کے پٹرول ہی سے رفتار پکڑتی ہے۔"

چوہدری نے کہا "آپ بلاوجہ ہم پر شک کررہے ہیں۔ ہم اس بات کا تصور بھی نہیں کرسکتے کہ کرائے کے قاتل کے ذریعے کسی بےگناہ شخص کا خون بہائیں۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب' آپ بدگمانی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں اپنے فرائض سے مجبور ہوں۔ حالات وواقعات حویلی کے مکینوں کو میری نظر میں مشکوک ٹھہرا چکے ہیں۔ اگر راجوراکٹ کا کہنا درست ہے کہ فیکے نے اسے پانچ سو کے عوض عارف علی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا کام سونپا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی ہوگا کہ فیکے نے حویلی ہی کے کسی شخص کے حکم پر ایسا کیا ہوگا۔"

"حویلی میں تو میں' میری بیوی اور میرا بیٹا چوہدری عشرت ہی ہوتے ہیں۔" چوہدری نے کہا "باقی سب تو چھوٹے بچے ہیں۔"

"میرا شک بھی تین افراد تک ہی محدود ہے۔"

"ہوں۔" چوہدری کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میں اپنے

بارے میں تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایسا کوئی حکم فیکے کو نہیں دیا۔ البتہ چوہدرائن اور عشرت سے میں خود پوچھ پرتیت کرلوں گا۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ کا شک' شک ہی ثابت ہوگا۔ راجو راکٹ نے اپنی جان بچانے کے لیے خواہ مخواہ فیکے نام لے لیا ہوگا۔"

"چوہدری صاحب!" میں نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا "راجو تو اپنے جرم کا اقبال کر چکا ہے۔ اس کی جان تو اب کسی صورت چھوٹ ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس امکان کو تو خارج ہی کر دیں البتہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اگر راجو کا بیان غلط ثابت ہوا تو میں فیکے کو چھوڑ دوں گا۔"

چوہدری کافی دیر تک مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں حویلی کے مکینوں پر خواہ مخواہ شک کر رہا ہوں۔ اس کے جواب میں' میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر حویلی کے مکینوں کے ہاتھ اس معاملے میں صاف ہیں تو انشاءاللہ ان کا بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔

میں واپس تھانے پہنچا تو جب تک دو ہٹے کٹے سپاہی فیکے کی اچھی خاصی مٹی جھاڑ چکے تھے۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلالیا اور ساتھ ہی ایک جلاد صورت کانسٹیبل کو بھی طلب کرلیا۔

میں نے فیکے سے پوچھا "ہاں بھئی' چوہدری کے نمک خوار' کچھ یاد آیا تمہیں؟"

"جناب آپ کے سپاہیوں نے مجھے بہت مارا ہے۔" وہ گریہ وزاری کرنے لگا "میں بے قصور ہوں جناب۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ تم نے اپنے ہاتھ سے قتل کیا ہے۔" میں نے کانسٹیبل کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کانسٹیبل نے اس کی پنڈلیوں پر جوتے کی نوک سے ضرب لگائی۔ فیکا بلبلا اٹھا۔ میں نے کہا "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم نے پانچ سو روپے راجو کو دے کر عارف علی کو قتل کروایا ہے۔"

"جناب' راجو راکٹ جھوٹ بولتا ہے۔"

"جھوٹ بولنے میں اس کا کیا فائدہ ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا جناب۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔" میں نے کہا "جھوٹ انسان اس وقت بولتا ہے جب وہ کوئی بہت بڑا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہو یا پھر کسی بہت بڑی بات چھپانے کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ راجو کے معاملے میں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں۔ اس نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا ہے۔ وہ تو اب سیدھا پھانسی کے تختے پر جائیگا۔ تمہارا فائدہ اس میں ہے کہ ہمیں سب کچھ سچ سچ بتا دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ قتل کا حکم دینے والا بھی قانون کی

نظر میں قاتل ہی گردانا جاتا ہے۔ میں تمہیں بچنے کا ایک موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم نے کسی کے حکم پر یہ فریضہ سرانجام دیا ہے تو اس کا نام بتا دو۔ ورنہ موت کا پھندا تمہارے گلے میں بھی فٹ ہو جائے گا۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خوف زدہ نظر آیا پھر منت سماجت کرنے لگا "تھانے دار صاحب۔ میں بالکل بے قصور ہوں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"تم قصوروار کا نام بتا دو' میں تمہیں جانے دوں گا۔"

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ فیکے کے سر پر سوار جلاد صورت کانسٹیبل نے کہا "ملک صاحب! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ آپ اسے میرے حوالے کریں۔ میں اس کی زبان کھلواتا ہوں۔"

"مجبوری ہے' اب تو یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے فیکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہاتھ پاؤں کی زبان ہی سمجھے گا۔"

کانسٹیبل نے فیکے کو کالر سے پکڑا اور ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے کہا "چل اوئے آگے لگ۔ میں دیکھتا ہوں' چوہدریوں کی حویلی میں رہ کر تم پر کتنے سوت چربی چڑھی ہے۔"

میں نے تنبیہی لہجے میں کہا "فیکے' تم جس کے ساتھ جا رہے ہو' اس کے سامنے پتھر بھی بولنے لگتے ہیں۔ اگر تمہاری زبان بھی کھل گئی تو پھر تمہارا چوہدری بھی تمہیں نہیں بچا سکے گا۔ اب جاؤ۔"

"تھانے دار صاحب۔" وہ ملتجی لہجے میں بولا "میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ مجھے اور نہ ماریں۔"

"اوئے اپنی بے بے کے یار! ابھی ہم نے تمہیں مارا ہی کتنا ہے۔" کانسٹیبل نے اسے جھنجوڑتے ہوئے کہا "مار کیا ہوتی ہے' یہ تمہیں اب پتا چلے گا۔"

میں نے کہا "اگر تم سچ بولنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے ساتھ رعایت کا وعدہ کرتا ہوں۔"

پھر میں نے کانسٹیبل کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ کانسٹیبل کمرے سے نکل گیا تو میں نے قدرے نرم لہجے میں فیکے سے کہا "تم بے فکر ہو کر بولنا شروع کر دو۔"

وہ بولا "چوہدری صاحب میری کھال کھینچ لیں گے۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب تو تمہاری کھال بعد میں کھینچیں گے میں تمہیں اس سے پہلے ہی

جیل بھجوا دوں گا۔ تم چوہدری صاحب کی فکر نہ کرو۔ اپنی جان کی فکر کرو اور یہ بتاؤ کہ تمہیں پانچ سو روپے کس نے مہیا کیے تھے۔ چوہدری شہادت علی نے ......؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا ''چوہدرائن نے؟ یا...... چوہدری عشرت نے؟''

وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ میں نے کہا ''میں تمہیں صرف ایک منٹ دیتا ہوں۔ اگر تم نے مطلوبہ شخص کا نام نہ بتایا تو پھر میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔''

وہ بولا ''جب دونوں طرف موت کھڑی ہے تو پھر میں حرام موت نہیں مروں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا ''شاباش...... بولتے جاؤ۔''

''تھانے دار صاحب!'' وہ لرزیدہ لہجے میں بولا ''چوہدری عشرت کے حکم پر میں نے راجو راکٹ کو پانچ سو روپے دیے تھے۔''

''اور ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ رقم اسے کس مقصد کے لیے دی جا رہی ہے؟''

''جی تھانے دار صاحب۔'' وہ خوف زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا ''آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ مجھے بچا لیں گے۔''

میں نے کہا ''اگرچہ تمہارا جرم قابل معافی نہیں ہے لیکن میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں۔ میں تمہیں وعدہ معاف گواہ بناؤں گا۔ تمہیں عدالت میں جج کے سامنے یہی بیان دہرانا ہوگا۔''

''چوہدری صاحب مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ باقاعدہ رونے لگا۔

میں نے کہا ''چوہدری شہادت علی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تمہاری حفاظت کروں گا''

پھر میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر فیکے کو اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا ''اس کو حوالات میں بند کر دو'' وہ فیکے کو لے کر جانے لگا تو میں نے تاکید کی ''اور ہاں' اسے راجو سے الگ رکھنا۔''

اسی روز میں چوہدری عشرت کو گرفتار کرنے ایک مرتبہ پھر چوہدری شہادت علی کی حویلی پہنچ گیا۔ چوہدری شہادت علی کو جب پتا چلا کہ عارف علی کے قتل کے احکامات اس کے اپنے فرزند ارجمند نے جاری کیے تھے تو اسے یقین نہیں آیا۔

''یہ نہیں ہو سکتا ملک صاحب۔'' چوہدری نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا ''عشرت بھلا ایسا کیوں کرنے لگا؟''

''یہ تو میں عشرت سے خود پوچھ لوں گا۔'' میں نے کہا ''فی الحال تو حالات و واقعات اس کے

خلاف جا رہے ہیں۔ فیکے نے آپ کے بیٹے کا کچا چٹھا کھول دیا ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو میں خود عشرت سے پوچھتا ہوں۔'' چوہدری کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

میں نے کہا ''چوہدری صاحب' اب یہ معاملہ باپ بیٹے کے درمیان سے قانون اور مجرم کے درمیان چلا گیا ہے۔ آپ خوامخواہ پوچھ گچھ کی زحمت نہ کریں۔ ہم ہیں نا اس کام کے لیے۔''

''تو آپ عشرت کو گرفتار کر کے تھانے لے جائیں گے؟''

''ظاہر ہے۔'' میں نے کہا ''میں اسے گرفتار کرنے ہی آیا ہوں۔''

یہ ساری باتیں میرے اور چوہدری کے درمیان حویلی کی بیٹھک میں ہو رہی تھیں۔ اس وقت میرے ساتھ حوالدار جمعہ خان بھی تھا۔

میں نے چوہدری سے کہا ''چوہدری صاحب! آپ عشرت کو یہاں بلا رہے ہیں یا ہمیں حویلی کے اندر جا کر اسے گرفتار کرنا ہوگا؟''

''آپ بیٹھیں' میں اسے یہیں لے کر آتا ہوں۔''

چوہدری کے اٹھنے کے بعد میں نے حوالدار جمعہ خان کو خبردار کیا کہ وہ حویلی کے بیرونی گیٹ پر نظر رکھے۔ چوہدری شہادت علی اگرچہ دوسرے روایتی چوہدریوں کے بالعکس خاصا معقول اور انصاف پسند چوہدری تھا۔ تاہم معاملہ اس کے بیٹے کا تھا اس لیے میں اس پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسی احتیاط کے پیش نظر میں نے پہلے ہی دو سادہ لباس سپاہیوں کو حویلی کے عقبی حصے میں بھی متعین کر دیا تھا تاکہ اگر چوہدری عشرت فرار ہونے کی کوشش کرے تو وہ اسے قابو کر لیں۔ دونوں سادہ لباس سپاہی پوری طرح مسلح تھے۔

چوہدری کے بیٹھک سے اٹھ کر حویلی کے اندرونی حصے میں جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے چوہدرائن کی آواز کو پہچان لیا۔ وہ چوہدری شجاعت علی سے کہہ رہی تھی ''میں اپنے بیٹے کو نہیں جانے دوں گی۔ آپ تھانے دار کو خریدنے کی کوشش کریں۔''

میں اور حوالدار جمعہ خان بھڑا مار کر حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ چوہدری عشرت ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا اور اس نے ایک جانب بھاگنے کی کوشش کی۔

''جانے نہ پائے جمعہ خان۔'' میں نے گرج کر کہا ''اسے فی الفور گرفتار کر لو۔''

جمعہ خان نے برق رفتاری سے چوہدری عشرت پر چھلانگ لگائی اور آن واحد میں اسے جا لیا۔

چوہدری عشرت نے جمعہ خان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں پھینکنا شروع کر دیے۔ جب کوئی بس نہ چلا تو اس نے حوالدار کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ حوالدار جمعہ خان کے حلق سے ایک سسکاری برآمد ہوئی۔ اسی اثنا میں' میں نے آگے بڑھ کر عشرت کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر جمعہ خان نے عشرت کو ہتھکڑی پہنا دی۔

میں نے چوہدرائن کی طرف رخ کر کے زہریلے لہجے میں کہا ''آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا فرما رہی تھیں۔ مجھے خریدنے کے لیے کتنی رقم ہے تمہارے پاس؟''

چوہدری شہادت علی گنگ کھڑا یہ تماشا دیکھا رہا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کھڑے کھڑے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس کی حالت کسی ہارے ہوئے جواری سے مختلف نہیں تھی۔

چوہدرائن میری منت سماجت کرنے لگی ''تھانے دار صاحب! آپ جتنی رقم طلب کریں گے' میں دینے کو تیار ہوں' پر آپ میرے بیٹے کو چھوڑ دیں۔ یہ پہلے ہی بہت بڑا صدمہ اٹھا چکا ہے۔''

میں نے کہا ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے' اسے ایک روز خود کھائی میں گرنا پڑتا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''اور اس بھول میں نہ رہنا چوہدرائن جی کہ میں رشوت لے کر تمہارے بیٹے کو چھوڑ دوں گا۔ یہ تو گردن تک پھنس چکا تھا..........اور یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر کے اس نے اپنے مجرم ہونے کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ اگر یہ قصوروار نہیں تھا تو اسے پولیس کو دیکھ کر یوں بدکنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کچھ بھی ہے۔'' چوہدرائن مصالحت آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے بولی ''اگر آپ تھوڑی گنجائش نکالیں تو یہ معاملہ یہیں پر رفع دفع ہو سکتا ہے۔ سب کچھ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ چاہیں تو گھر کی بات گھر میں رہے گی۔ قاتل تو گرفتار ہو ہی چکا ہے۔ عارف علی بھی اب دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے گھر کو برباد ہونے سے بچالیں۔''

اس وقت چوہدری شہادت علی نے گمبھیر لہجے میں کہا ''ملک صاحب' میں آپ سے یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ کوئی بڑی رقم لے کر معاملے کو ختم کر دیں لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ کوئی دفعہ لگانے سے پہلے اچھی طرح چھان بین ضرور کر لیں۔''

''آپ فکر نہ کریں' میں انصاف کے تقاضے ضرور پورے کروں گا۔''

چوہدرائن رونے لگی ''چوہدری صاحب! آپ کیسے باپ ہیں۔ اپنے بیٹے کو خود پولیس کے

حوالے کر رہے ہیں۔ آپ کی دولت کس کام آئے گی؟''

''تم اپنی بکواس بند کرو۔'' چوہدری شہادت علی نے بیوی کو ڈانٹا ''اگر ہمارا بیٹا بے گناہ ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں سپریم کورٹ تک جاؤں گا۔''

''آپ کہیں نہیں جائیں گے۔'' چوہدرائن نے پاؤں پٹخ کر کہا ''اسی حویلی میں بیٹھے باتیں بناتے رہیں گے۔''

میں چوہدری اور چوہدرائن کو وہیں چھوڑ کر حویلی سے نکل آیا۔ چوہدری عشرت کی ہتھکڑی کا دوسرا سرا حوالدار جمعہ خان کے ہاتھ میں تھا۔ سادہ لباس پولیس اہل کاروں نے ہمیں دیکھا تو ہمارے قریب آ گئے۔ ہم گاؤں ہی کے تانگے میں سوار ہوئے اور تھانے آ گئے۔

چوہدری عشرت پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس نے حوالات میں راجو راکٹ اور فیکے کو بھی دیکھ لیا تھا۔ دو چار تھپڑ کھانے کے بعد اس نے سب کچھ قبول کر لیا۔ چوہدری عشرت کے بیان کا خلاصہ یوں ہے۔

کسی طرح چوہدری عشرت کو عارف علی اور سلمٰی کے تعلقات کا پتا چل گیا تھا۔ عشرت کے لیے سلمٰی کے رشتے کی بات چل رہی تھی اور عشرت خود بھی اس سے شادی کا خواہاں تھا مگر وہ کہیں اور ہی دل لگائے بیٹھی تھی اور وہ بھی اتنی راز داری کے ساتھ کہ کسی کو مدت تک اس کی خبر ہی نہ ہو سکی تھی۔ چوہدری عشرت کو جب یقین ہو گیا کہ سلمٰی ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے تو اس نے ایک روز عارف علی سے بات کی اور اسے اپنا راستہ بدلنے کو کہا مگر عارف علی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ چوہدری نے پہلے تو اسے نوٹوں کی جھلک دکھائی پھر ڈرایا دھمکایا مگر عارف علی' سلمٰی سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ ہر طرف سے بے بس ہونے کے بعد چوہدری عشرت نے کہا ''ٹھیک ہے' اب میں تمہیں دوسرے طریقے سے سمجھاؤں گا۔''

چوہدری عشرت نے عارف علی کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا' اس نے تین گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ محبت کرنے والے دو دل پیوند خاک ہوئے اور چوہدری عشرت ایک لمبی مدت کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔

فیکے نے وعدہ معاف گواہ بن کر اپنے سر پر پڑنے والی افتاد سے نجات حاصل کر لی تھی۔ ویسے چوہدری عشرت کا اقبالی بیان بھی کافی تھا۔ چوہدری شجاعت علی نے اپنے بیٹے کے لیے بہت بڑا وکیل کیا تھا لیکن سیشن کورٹ نے راجو راکٹ اور چوہدری عشرت کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ چوہدری

شہادت نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی اور بہ وقت تمام بیٹے کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کروانے میں کامیاب ہوگیا۔ البتہ راجو راکٹ کا مقدمہ سیشن کورٹ تک ہی محدود رہا اور اس نے پھانسی کی سزا پائی۔

بعض اوقات رقابت کی چنگاری اتنی شدت سے بھڑکتی ہے کہ ایک دہکتے ہوئے الاؤ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس الاؤ کی آگ جہاں تک پھیلتی ہے، سب کچھ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ چوہدری عشرت کے دل میں بھڑکنے والی رقابت کی آگ نے کئی افراد کو عبرت ناک انجام سے دوچار کر دیا تھا۔

❖❖❖

برائے خلش:

کنگن کی چوری کی رپورٹ کنگن پور کے تھانے میں درج کروائی گئی تھی مگر اے ایس آئی مشکور علی تفتیش کرتے ہوئے میرے علاقے میں پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں میں بصیر پور (ضلع اوکاڑہ) کے تھانے میں تعینات تھا جبکہ کنگن پور ضلع قصور میں واقع تھا۔

اے ایس آئی مشکور علی کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جن میں ایک کانسٹیبل محمد نذیر اور دوسرا کھوجی خوشی محمد تھا۔ کھوجی خوشی محمد کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی مگر اس عمر میں بھی وہ خاصا صحت مند اور چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ اہم چیز اس کی آنکھیں تھیں جن سے ذہانت اور بردباری ٹپکتی تھی۔ اس کے لہجے میں بھی ایک خاص قسم کا اعتماد پایا جاتا تھا۔

اے ایس آئی مشکور علی، خوشی محمد کھوجی ہی کی راہنمائی میں بصیر پور پہنچا تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اے ایس آئی سے پوچھا ''مشکور علی! کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ تمہارا مطلوبہ بندہ میرے تھانے کی حدود میں موجود ہے؟''

مشکور علی متذبذب لہجے میں بولا ''ملک صاحب! آپ نے خاصا پیچیدہ سوال کر دیا ہے تاہم میں یہی کہوں گا کہ چور آپ کے علاقے میں پہنچا ضرور ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''اب اس وقت بھی وہ یہاں موجود ہے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

خوشی محمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''تھانے دار صاحب! میری ساری عمر چوروں، ڈکیتوں اور دوسرے مجرموں کا کھرا اٹھاتے ہوئے گزر گئی ہے۔ میں نے ایسے ایسے مجرم گھڑ سواروں کا بھی سراغ لگایا ہے جنہوں نے اپنے گھوڑوں کے پاؤں پر مخصوص قسم کے چرمی تھیلے چڑھا رکھے تھے تاکہ کھرا نہ اٹھایا جا سکے۔'' اتنا کہہ کر وہ چند ساعتوں کے لیے خاموش ہوا پھر پُر وثوق لہجے میں بولا ''میرا

تجربہ یہ بتاتا ہے کہ کنگن پور آنے والا چور آپ کے علاقے میں ہی پہنچا ہے۔ اب یہاں پر بندے کو کیسے تلاشنا ہے‘ یہ تو آپ ہی فیصلہ کریں گے۔ بہرحال‘ میری خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔‘‘

میں نے کہا’’خوشی محمد! تمہاری صلاحیتوں سے کام لے کر مجھے خوشی ہوگی۔‘‘

’’ملک صاحب! چور کا کھرا اٹھانے کے علاوہ بھی میں نے کچھ تفتیش کی ہے۔‘‘ اے ایس آئی مشکور علی سے بتایا’’واقعات‘ شواہد اور چند لوگوں کے بیانات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کنگن پور کے تھانے میں جو رپورٹ درج کروائی گئی ہے اس میں مطلوب شخص بذریعہ ٹرین یہاں پہنچا ہے۔‘‘

میں نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا اور ٹھوس لہجے میں کہا’’اگر آپ کا مطلوبہ چور میرے علاقے میں ہے تو پھر آپ مطمئن ہو جائیں۔ وہ بچ کر کہیں نہیں جائے گا۔ اس سلسلے میں مجھے آپ کا بھرپور تعاون بھی درکار ہے۔‘‘

’’ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے سرتاپا تیار ہیں ملک صاحب۔‘‘ اے ایس آئی نے جلدی سے کہا ’’آپ سے تعاون کرنے میں سراسر ہمارا ہی فائدہ ہے جناب۔‘‘

میں نے سرسری انداز میں پوچھا’’شاہ جی کا کیا حال ہے؟‘‘

’’کون شاہ جی۔‘‘ اے ایس آئی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

اس موقع پر خوشی محمد بول اٹھا’’آپ ولایت شاہ کی بات کر رہے ہیں ملک صاحب!‘‘

’’ہاں ہاں‘ وہی شاہ جی۔‘‘ میں نے تصدیق کی۔

خوشی محمد نے کہا’’کچھ عرصہ پہلے شاہ جی کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ اب وہ بھکر کے ایک تھانے میں تعینات ہیں۔ آج کل ہمارے تھانے کے انچارج رانا جمشید صاحب ہیں۔‘‘ پھر وہ اے ایس آئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا’’مشکور علی کو کنگن پور کے تھانے میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اس لیے یہ شاہ جی کے ذکر پر الجھ گیا تھا۔‘‘

ولایت شاہ سے میری اچھی خاصی تعلق داری تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ اے ایس آئی نے ازخود اس کا ذکر نہیں کیا تھا اسی وجہ سے میں نے ولایت شاہ کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ ولایت شاہ ایک جی دار اور نڈر پولیس افسر تھا۔ ایک مرتبہ اس نے تن تنہا پانچ ڈاکوؤں سے دست بدستہ مقابلہ کر کے انہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ ڈاکو بھی خاصے ہٹے کٹے اور پیشہ ور مجرم تھے۔ اس کارنامے پر ولایت شاہ کو حکومت کی طرف سے خصوصی انعام بھی ملا تھا۔ تھانہ کنگن پور کے حوالے سے

میرا ذہن ولایت شاہ کی طرف چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ولایت شاہ کے تذکرے سے واپس موجود صورتِ حال کی طرف لوٹ آیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی سے سوال کیا’’مشکور علی! تم نے بتایا ہے کہ تمہارے تھانے میں کسی جڑاؤ کنگن کی چوری کی رپورٹ درج کروائی گئی ہے۔ ذرا اس کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔‘‘

’’تفصیل بس اتنی سی ہے جناب۔‘‘ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا’’مسروقہ جڑاؤ کنگن بہت قیمتی ہے۔ اس طلائی کنگن میں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ جن میں نیلم‘ یاقوت‘ زمرد اور پکھراج وغیرہ شامل ہیں اس سے آپ کنگن کی وقعت کا اندازہ لگا لیں۔‘‘ ایک لمحے کو رک کر اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا’’ملک صاحب! میں جس کنگن کا ذکر کر رہا ہوں اسے رکھنے کے لیے اس کی مالکن نے ایک خصوصی بکس بنوایا تھا۔ صندل کی لکڑی سے تیار کردہ وہ منقش بکس بہت ہی خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔ متذکرہ بکس کی لمبائی چوڑائی ایک جیسی ہے جو کہ چھ انچ ہے یعنی وہ ایک چوکور بکس ہے البتہ اس کی اونچائی چار انچ ہے۔‘‘

اے ایس آئی ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا’’مشکور علی! تمہارے ایک جملے سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ مذکورہ مسروقہ کنگن کسی عورت کی ملکیت ہے؟‘‘

’’آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب۔‘‘ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا’’کنگن کی مالکن ایک صاحبِ حیثیت بیوہ ہے جس کا نام دلشاد بیگم ہے۔ وہ کنگن پور کے ایک نزدیکی گاؤں شام کوٹ کی رہنے والی ہے۔ دلشاد بیگم کے مطابق مسروقہ کنگن کی مالیت کم از کم آٹھ ہزار روپے ہوگی۔‘‘

قارئین کی معلومات کے لیے واضح کر دوں کہ اس زمانے کے آٹھ ہزار روپے بہت بڑی رقم تھی۔ آپ آج کل کے پانچ لاکھ روپے سمجھ لیں۔ یہ جن دنوں کا ذکر ہے اُس وقت بڑا سستا دور تھا۔ اول درجے کا سونا نوے روپے تولہ مل جاتا تھا۔ ایک عام آدمی کی ماہانہ آمدنی ساٹھ روپے تک ہوتی تھی۔ ایک متوسط گھر کا پورے مہینے کا سودا تیس پینتیس روپے میں آجاتا تھا۔ آٹا دو آنے سیر یعنی پانچ روپے کا من اور اعلیٰ درجے کی صاف ستھری گندم لگ بھگ پونے پانچ روپے من کے حساب سے دستیاب تھی۔ ڈیڑھ‘ دو سو روپے میں تو شادی ہو جایا کرتی تھی۔ اب یہ سب باتیں خواب و خیال ہو کر رہ گئی ہیں۔

میں نے اے ایس آئی مشکور علی سے استفسار کیا’’کیا بیوہ دلشاد بیگم نے خود تھانے آ کر رپورٹ درج کروائی تھی یا اس کی طرف سے کوئی اور شخص آیا تھا؟‘‘

"یہ کام اس نے خود ہی کیا تھا جناب۔" اے ایس آئی نے جواب دیا "البتہ اس کے ساتھ شام کوٹ ہی کا رہنے والا تانگابان محمد بوٹا بھی تھانے پہنچا تھا۔ دلشاد بیگم بوٹا ہی کے تانگے میں بیٹھ کر شام کوٹ سے کنگن پور آئی تھی۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے مزید بتایا "ہماری معلومات کے مطابق دلشاد بیگم اپنے شوہر کے انتقال کے بعد بالکل تنہا ہو گئی ہے۔ اس کے نہ تو کوئی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی قریبی رشتے دار۔ اس کا شوہر امتیاز علی شام کوٹ کا ایک باحیثیت زمیں دار تھا۔ کوئی تین سال پہلے ہی اس کا انتقال ہوا ہے۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی مشکور علی۔" میں نے کہا "اتنے باحیثیت زمیں دار کی بیوہ اکیلی تھانے کیوں کر آ سکتی ہے۔ یقیناً اس کے گھر میں دو چار ملازم تو ضرور ہوں گے۔"

اے ایس آئی نے جواب دیا "جناب! میں جہاں تک جانتا ہوں' شوہر کی وفات کے بعد سے دلشاد بیگم تنہائی پسندی کا شکار ہو گئی ہے۔ اس نے یکے بعد دیگرے تمام ملازمین کی چھٹی کر دی۔ اس وقت اس کے عالیشان حویلی نما مکان میں صرف ایک ملازمہ ہے۔ جیواں نامی اس عورت کی عمر لگ بھگ چالیس سال ہو گی۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا "بیوہ دلشاد بیگم کی عمر کیا ہو گی؟"

"وہ پینتیس چھتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی جناب۔"

میں نے کہا "کیا دلشاد بیگم نے کسی شخص پر اپنا شک ظاہر کیا ہے؟"

"ہم نے یہ سوال اس سے پوچھا تھا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مگر اس نے کسی خاص آدمی کا نام نہیں لیا' کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے ہمیں تفتیش میں کوئی خاص مدد مل سکتی البتہ اس نے چور کا حلیہ بڑی حد تک بیان کر دیا تھا۔"

میں چونک اٹھا "کیا دلشاد بیگم نے چور کو دیکھا تھا؟"

"جی ہاں' کسی حد تک۔" اے ایس آئی نے جواب دیا "جبھی تو اس نے چور کا حلیہ بتایا ہے۔"

"اور تم کہہ رہے تھے کہ اس نے کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جو تفتیش میں معاون ثابت ہو۔" میں نے اے ایس آئی کو گھورا "مجرم' خصوصاً چور اور ڈکیت کا حلیہ انتہائی اہم ہوتا ہے۔ پچاس فیصد کیس تو اسی سے حل ہو جاتا ہے۔"

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا "جناب! شاید میں کچھ غلط کہہ گیا تھا۔"

میں نے اے ایس آئی سے اب تک ہونے والی گفتگو سے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ایک

روایتی پولیس والا تھا۔ اس میں مجھے "ٹیلنٹ" کہیں دکھائی نہیں دیا تھا جبکہ اس کے برخلاف کھوجی خوشی محمد جہاں دیدہ اور تجربے کار شخص نظر آتا تھا۔ اے ایس آئی ابھی تک خوشی محمد کے بنائے ہوئے رستے پر ہی چل رہا تھا۔ خوشی محمد کی اس عادت نے بھی مجھے متاثر کیا کہ اس نے ایک مرتبہ بھی ہماری بات چیت کے دوران میں مداخلت نہیں کی تھی۔

میں نے خوشی محمد سے پوچھا "چوری کی یہ واردات کب پیش آئی؟"

"تین دن پہلے جناب۔" اس نے جواب دیا۔

اس دن اگست کی اٹھارہ تاریخ تھی۔ تین دن پہلے کا مطلب پندرہ اگست تھا۔ پچھلے مہینے یعنی ساون میں بہت زیادہ بارشیں ہوئی تھیں۔ تاہم بھادوں شروع ہوتے ہی برسات کی شدت میں واضح کمی آ گئی تھی۔ برسات کے موسم میں کھرا اٹھانا ناممکن کی حد تک مشکل ہو جاتا ہے۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ خوشی محمد کی پیشہ ورانہ مہارت کو کتنے بڑے امتحان سے گزرنا پڑا ہو گا۔ اسی حوالے سے میں نے اس سے سوال کیا۔

"خوشی محمد! تمہیں کھرا تلاش کرنے میں دقت تو ہوئی ہو گی؟"

"کوئی دقت سی دقت جناب۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "یہ تو اچھا ہوا کہ ساون ختم ہو گیا ورنہ......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر چند سیکنڈ تک اے ایس آئی کو دیکھا پھر بولا "ملک صاحب! ہمیں یہاں تک پہنچانے میں کھرے سے زیادہ چور کے حلیے نے مدد دی ہے۔ اگرچہ دلشاد بیگم نے چور کی ایک ہی جھلک دیکھی تھی تاہم اس کا مشاہدہ حیرت انگیز ہے کیونکہ اس نے بڑی وضاحت کے ساتھ چور کا حلیہ بیان کیا تھا۔"

میں نے اے ایس آئی سے مبینہ چور کے حلیے کے بارے میں استفسار کیا۔ مشکور علی اس کیس میں تفتیشی افسر تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

"ملک صاحب! جڑاؤ کنگن چوری کرنے والا شخص دراز قامت ہے۔ اس کا قد لگ بھگ سوا چھ فٹ ہے' ہاتھ پاؤں بڑے' صحت مند وجود' گھونگریالے بال' دائیں گال پر سیاہ مسّا چنے کے برابر' گلے میں تین طلائی تعویذ والی سیاہ ڈوری' سفید چکن کرتہ لٹھے کا تہ بند اور پاؤں میں دیسی کھسا۔"

اے ایس آئی خاموش ہوا تو میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا "کیا چوری کی یہ واردات دن دہاڑے ہوئی تھی...... اگر واقعی ایسا ہے تو پھر یہ......"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "چوری کی واردات تو رات کے آخری پہر ہوئی تھی جناب۔"

پندرہ اگست کی رات کو یعنی سولہ اگست کی صبح۔''

''اور تھوڑی دیر قبل تم بتا چکے ہو کہ چور کے حلیے کے بارے میں دلشاد بیگ سے پتا چلا تھا جس نے اتفاق سے چور کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔'' میرے لہجے میں طنز اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت تھی ''اگر واقعی ایسا ہی ہے تو پھر تمہاری یہ دلشاد بیگم بڑی حیرت انگیز قوت مشاہدہ کی مالک ہے۔ بہ خدا مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا تم واقعی سچ کہہ رہے ہو؟''

وہ میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے اور اپنی حماقت کو فوراً محسوس کرتے ہوئے جلدی سے بولا ''بات دراصل یہ ہے جناب کہ دلشاد بیگم نے تو ہمیں صرف اتنا بتایا تھا کہ چور اونچے لمبے قد کا مالک اور ایک صحت مند پہلوان نما شخص ہے جس کے بال گھونگھریالے ہیں اور یہ کہ اس نے کرتہ و تہ بند پہن رکھا ہے۔''

''اور حلیے کی باقی بیان کردہ جزئیات؟''

''وہ میری اپنی تفتیش ہے جناب۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا۔

اس موقع پر خوشی محمد نے مجھے بتایا ''ملک صاحب! مشکور علی پہلی مرتبہ کسی کیس کی تفتیش تنہا کر رہا ہے یعنی اس کیس کا تفتیشی افسر اول آخر یہی ہے۔ شاید اسی لیے یہ ذرا گھبراہٹ کا شکار ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ باتیں آپ کو بتاؤں۔''

''بہتر ہے کہ تم ہی بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''جناب! جیسا کہ آپ کو بتایا گیا ہے' پندرہ اور سولہ تاریخ کی درمیانی رات کے آخری پہر چوری کی واردات ہوئی تھی۔ شام کوٹ کی وسنیک دلشاد بیگم نے دوسری صبح سولہ تاریخ کو تھانہ کنگن پور میں چوری کی رپورٹ درج کروائی اور چور کا سرسری سا حلیہ بھی بیان کر دیا۔ اگلے روز یعنی سترہ تاریخ کو اے ایس آئی اور میں کنگن پور ریلوے اسٹیشن پہنچے جہاں سے ایک روز پہلے مبینہ چور ٹرین میں سوار ہوا تھا۔''

میں نے پوچھا ''آپ لوگ سترہ اگست کو کیوں کنگن پور ریلوے اسٹیشن پہنچے' سولہ تاریخ ہی کو یہ کام کیوں نہ کر ڈالا؟ اور آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ مبینہ چور شام کوٹ کے ایک گھر سے جڑاؤ طلائی کنگن چرا کر کنگن پور کے ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوا تھا؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں جناب۔'' کھوجی بابا خوشی محمد متحمل لہجے میں بولا ''جناب! سولہ تاریخ کو شام تک ہم چور کا کھرا اٹھانے میں مصروف رہے تھے۔ شام کوٹ میں واقع دلشاد بیگم کے گھر

سے لے کر ریلوے اسٹیشن کنگن پور تک میں نے بڑی محنت کی' اپنا پورا تجربہ کام میں لایا اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ ہمارا مطلوبہ بندہ اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تھا۔''

اے ایس آئی نے کہا ''اس کے بعد کی تفصیل میں بتاتا ہوں جناب!''

اے ایس آئی کہ مداخلت پر خوشی محمد خاموش ہو گیا۔ مشکور علی نے کہنا شروع کیا ''ملک صاحب! سولہ اگست کی تاریخ میں ہم نے یہ پتا چلا لیا تھا کہ مبینہ چور شام کوٹ سے کنگن پور ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا۔ میں نے رات کو اپنی کارگزاری کی رپورٹ رانا صاحب (رانا جمشید) کو تھانے جا کر دی۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ ریلوے اسٹیشن جا کر وہاں لوگوں سے پوچھ گچھ کروں......''

''حالانکہ اس کام کے لیے کسی حکم کی ضرورت نہیں تھی۔'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''تمہیں چاہیے تھا کہ اس شام واپس تھانے جانے کے بجائے تم ریلوے اسٹیشن پر پوچھ تاچھ کرتے۔''

وہ میرے لہجے کی کاٹ کو محسوس کرتے ہوئے شرمندہ لہجے میں بولا ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔'' بولتے ہوئے وہ ایک ایسا شخص دکھائی دیتا تھا جس کی حماقت میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہ ہو' تھانے دار رانا جمشید صاحب نے مجھے ڈانٹ بھی پلائی تھی اور کہا تھا کہ اگلی صبح میں ضرور اسٹیشن جا کر مبینہ چور کا سراغ لگانے کی کوشش کروں۔''

اے ایس آئی نے اپنی بات مکمل کی تو مجھے ایک شک گزرا۔ پتا نہیں کیوں' مجھے ایسا محسوس ہوا' جیسے وہ دانستہ خود کو احمق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بعض اوقات چغلی کھاتی تھیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں بلکہ وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک ایک قدم آگے بڑھ رہا ہو۔ میں نے اس سلسلے میں کافی سوچا لیکن اپنے محسوسات کی تصدیق کے لیے مجھے کوئی واضح اشارہ نہ ملا چنانچہ میں نے سردست اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اے ایس آئی مشکور علی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''ملک صاحب! رات کو مجھے خود بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ واقعی مجھے اس شام پلیٹ فارم پر موجود ٹھیلے والوں سے اور قلیوں وغیرہ سے مبینہ چور کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیے تھا۔ تاہم یہ سوچ کر میں نے خود کو مطمئن کر دیا کہ اگلی صبح میں سیدھا کنگن پور کے ریلوے اسٹیشن کا رخ کروں گا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ''ملک صاحب! سچی بات یہ ہے کہ میں کچھ نروس ہو گیا تھا۔ دراصل' پہلا پہلا کیس ہے نا اس لیے......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہونقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے عام سے لہجے میں دریافت کیا "اچھا یہ بتاؤ' اگلی صبح یعنی کل صبح کنگن پور کے ریلوے اسٹیشن پر تم نے کون سا تیر مارا؟" "کل صبح سے میری مراد گزری ہوئی سترہ تاریخ کی صبح تھی۔

وہ بولا" جناب! میں نے دلشاد بیگم کا بیان کردہ حلیہ جب منظور احمد کو تفصیلاً بتایا تو اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ منظور احمد نے ہمارے مطلوبہ بندے کو ضرور دیکھا ہوگا۔"

"یہ منظور احمد کون ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"منظور احمد میرا پرانا یار بیلی ہے۔" اے ایس آئی نے بتایا" ادھر کنگن پور کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اس کا چائے کا اسٹال ہے۔ کیک' پیسٹری اور بسکٹ وغیرہ بھی ملتے ہیں اس کے اسٹال پر......"

وہ منظور احمد کی مزید تفصیل میں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کی بات قطع کی اور پوچھا" منظور احمد سے تمہیں کیا معلوم ہوا تھا؟"

"منظور احمد نے تصدیق کی تھی کہ ایسا ایک شخص سولہ اگست کو صبح وہاں آیا تھا۔" مشکور علی نے بتایا" اس شخص نے منظور احمد سے چائے اور کیک پیس خریدا تھا۔ رواروی میں منظور نے اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ اس شخص نے منظور کو بتایا کہ وہ بصیر پور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔" ایک لمحے کو وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا" یہ بات مجھے منظور ہی سے پتا چلی تھی کہ مذکور شخص کے دائیں گال پر چنے کے برابر سیاہ مستا بھی تھا اور اس کے گلے میں تین طلائی تعویذ والی سیاہ ڈوری بھی تھی۔ ازیں علاوہ منظور نے یہ بھی بتایا کہ اس شخص نے پاؤں میں دیسی کھسا پہن رکھا تھا۔"

اتنا کہہ کر مشکور علی خاموش ہو گیا۔ جواب میں' میں بھی خاموش رہا تو اس نے اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا" میں منظور احمد کے پاس تھوڑی دیر رک کر پلیٹ فارم کی رونق کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں منظور کا ایک دوست لیاقت خان بھی وہاں آ گیا۔ منظور نے لیاقت سے پوچھا کہ آیا اس نے ہمارے مطلوبہ بندے کو دیکھا تھا۔ لیاقت نے تصدیق کر دی کہ اس نے نہ صرف مبینہ چور کو دیکھا تھا بلکہ اس سے مختصر بات چیت بھی کی تھی۔ لیاقت نے اس سے ٹکٹ وغیرہ کے لیے پوچھا تھا جس کے جواب میں اس نے لیاقت کو بتایا کہ وہ ٹکٹ حاصل کر چکا ہے۔ لیاقت خان کے استفسار پر اس شخص نے یہی بتایا تھا کہ وہ کنگن پور سے سیدھا بصیر پور جا رہا تھا۔ میں نے جب لیاقت خان سے دو چار

سوالات کیے تو مجھے پتا چلا کہ اس شخص کے ہاتھ پاؤں غیر معمولی طور پر لمبے تھے۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا جبکہ اس کے جوتے کا نمبر ساڑھے نو یا دس سے کم نہیں تھا۔ لیاقت خان نے دلشاد بیگم کے بیان کردہ حلیے کی بھی پوری تصدیق کی تھی۔"

اے ایس آئی مشکور علی کا طویل بیان ختم ہوا تو میں نے سوال کیا" مشکور علی! تمہیں کل صبح یعنی سترہ اگست کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ تمہارا مطلوبہ مبینہ کنگن چور کنگن پور سے بصیر پور آیا تھا تو پھر تم کل ہی یہاں کیوں نہیں آ گئے۔ یہ پورے چوبیس بلکہ تیس گھنٹے کی تاخیر کیوں؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا" وہ بات دراصل یہ ہے جناب کہ کل خوشی محمد میرے ساتھ نہیں تھا۔ رانا صاحب نے مشورہ دیا کہ میں خوشی محمد کو ضرور اپنے ساتھ رکھوں کیونکہ بصیر پور ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد مبینہ چور کا سراغ لگانے کے لیے مجھے قدم قدم پر خوشی محمد کی ضرورت تھی اس لیے مجھے خوشی محمد کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا جو اپنی بیٹی سے ملنے موضوع کوٹھا گیا ہوا تھا۔"

اے ایس آئی میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دے رہا تھا جیسے اسے پہلے سے معلوم ہو کہ میں کیا پوچھنے والا ہوں اور وہ اپنی مرضی کا جواب سوچ لیتا ہو۔ اس کا یہ انداز مجھے میکانکی اور مصنوعی سا لگا۔ مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ جیسے اے ایس آئی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بول رہا ہو۔ تاہم میں کوشش کے باوجود بھی اس کے مقصد تک نہیں پہنچ سکا تھا۔

وہ بتا رہا تھا" ملک صاحب! کل رات کو خوشی محمد واپس کنگن پور آیا اور میں آج اسے اپنے ساتھ بصیر پور لے آیا ہوں۔"

خوشی محمد نے کافی دیر کے بعد لب کشائی کی" مگر میرا آنا نہ آنا برابر ہو گیا جناب۔ ہم صبح جیسے ہی ٹرین میں بیٹھے' ہلکی پھلکی بوندا باندی شروع ہو گئی پھر جب ٹرین اٹاری کے اسٹیشن پر پہنچی تو باقاعدہ بارش شروع ہو گئی۔ پانچ چھ دن سے بارش رکی ہوئی تھی۔ خدا کی قدرت ایسی ہوئی کہ بصیر پور پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی بارش ہو چکی تھی۔ اب آپ خود ہی بتائیں اس موسلا دھار بارش میں کسی کے پاؤں کا کھرا ملنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے!"

"مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری ملک صاحب!" اے ایس آئی نے پرجوش لہجے میں کہا" میں نے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ ہمارا مطلوبہ بندہ بصیر پور کے ریلوے اسٹیشن پر ضرور اترا ہے اور اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر پیدل ہی ایک طرف گیا ہے۔"

"یہ معلومات تم نے کس طرح حاصل کی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ فخریہ لہجے میں بولا ''بصیر پور کے ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک متوسط درجے کا ہوٹل ہے جس کے مالک کا نام ناظم علی ہے۔ ہوٹل کا نام ''نعمت کدہ'' ہے۔ یقیناً آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ میں نے ناظم علی سے سوال وجواب میں معلوم کرلیا کہ ہمارے مطلوبہ مبینہ کنگن چور نے اس کے ہوٹل میں کچھ دیر رک کر چائے وغیرہ پی تھی۔ ناظم علی نے مجھے بتایا ہے کہ اس شخص کے پاس ایک چھوٹی سے پوٹلی بھی تھی۔ میرا خیال ہے' وہ صندلی بکس اس پوٹلی میں ہوگا۔ ہوٹل کے نزدیک ہی سگریٹ کی ایک دکان ہے۔ دکان کے بجائے کھوکھا کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کھوکھے کے مالک طالب حسین نے بھی تصدیق کی ہے کہ ہمارے بیان کردہ حلیے کے ایک شخص نے سولہ اگست کے دن اس سے سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔'' وہ تھوڑے سے توقف کے بعد کہنے لگا ''ملک صاحب! یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ ہمارا مطلوبہ چور آپ کے علاقے میں پہنچا ہے۔ اب چور کو تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ بھرپور تعاون کریں گے۔''

میں نے کہا ''آپ کے مطلوبہ کنگن چور کو برآمد کر کے آپ کے حوالے کرنے میں مجھے خوشی محسوس ہوگی لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ شخص یہیں کا رہنے والا ہے یا یہ کہ وہ ابھی تک بصیر پور ہی میں موجود ہے۔''

''یہ پتا چلانا تو آپ کا کام ہے جناب۔'' مشکور علی نے کہا ''میرے لیے آپ جو حکم کریں' میں کرنے کو تیار ہوں بلکہ میں نے تو ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ جب تک مبینہ چور کا سراغ نہیں لگ جاتا' میں اور کانسٹیبل محمد نذیر یہیں بصیر پور ہی میں رہیں گے البتہ کھوجی خوشی محمد کو واپس بھیجنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔''

''مجھے تمہارے یہاں رکنے پر کوئی اعتراض نہیں مشکور علی۔'' میں نے عام سے انداز میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ''مشکور علی! تم نے بتایا ہے کہ سولہ اگست کو مبینہ چور نے بصیر پور پہنچنے کے بعد سگریٹ کے ایک کھوکھے سے سگریٹ وغیرہ خریدے تھے...... طالب حسین سگریٹ والے سے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''جی ہاں' آپ چاہیں تو اس بات کی تصدیق کرسکتے ہیں۔''

''تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوگے۔'' میں نے کہا ''مجھے تمہارے کہے پر پورا بھروسا ہے۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ مبینہ چور نے کون سے برانڈ کے سگریٹ خریدے تھے۔ کیا تم نے دکان دار سے اس بارے میں کوئی سوال کیا تھا؟''

''جی ملک صاحب! میں نے طالب حسین سے اس بارے میں پوچھا تھا۔'' مشکور علی نے کہا ''اس کے مطابق ہمارے مطلوبہ چور نے قینچی مارکہ سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا تھا۔''

میں نے سگریٹ کا برانڈ اپنی ڈائری میں نوٹ کرلیا۔ اس سے پہلے میں مبینہ کنگن چور کا مکمل حلیہ' دلشاد بیگم کے کوائف اور جائے وقوعہ کے بارے میں تمام ضروری نکات بھی اپنی ڈائری میں درج کرچکا تھا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''مشکور علی! اگر تمہارا مطلوبہ بندہ میرے علاقے ہی کا رہنے والا ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ بچ کر نہیں جائے گا۔''

''بس جی ملک صاحب! یہ میرا پہلا کیس ہے' اس لیے بھی آپ کے تعاون کی بہت ضرورت ہے مجھے۔'' وہ عاجزی سے بولا ''اگر میں اس امتحان میں پاس ہوگیا تو تھانہ انچارج رانا جمشید کی نظر میں میرا ایک مقام بن جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اپنے ہی ایک جونیئر کے طور پر سمجھتے ہوئے میری بھرپور راہنمائی کریں گے۔''

''انشاءاللہ'' میں نے پورے وثوق سے کہا۔

اے ایس آئی کے انداز میں اگرچہ عجز وانکسار پایا جاتا تھا لیکن لاشعوری طور پر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اداکاری کررہا ہو۔ میں نے ایک دو مواقع پر پہلے بھی ایسا ہی محسوس کیا تھا تاہم اس کی واضح اور معقول وجہ نہ ہونے کے سبب میں نے اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اے ایس آئی نے کانسٹیبل محمد نذیر اور کھوجی خوشی محمد کو واپس کنگن پور بھیج دیا۔ اس نے خود اکیلے ہی میرے پاس رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے تھانے ہی میں اس کے نجی بستر ے کا انتظام کردیا۔ سامان کے نام پر اس کے پاس صرف ایک بیگ تھا جو کسی جھولے سے مشابہ تھا۔

کانسٹیبل اور کھوجی کے جانے کے بعد میں نے اے ایس آئی سے پوچھا ''مشکور علی! تفتیش کا میرا اپنا ایک علیحدہ انداز ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی کارروائی کا آغاز کروں' تم مجھے وہ تمام باتیں بتا دو جو اب تک بتانے سے رہ گئی ہیں۔''

''میرے خیال میں تو میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔'' وہ پیشانی کو مسلتے ہوئے بولا ''مبینہ چور کے بارے میں' میں مزید کچھ نہیں جانتا۔''

''میرا مطلب ہے' کنگن اور کنگن کی مالک دلشاد بیگم کے بارے میں؟''

''کنگن کے بارے میں' میں نے آپ کو پوری تفصیل بتا دی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''دلشاد بیگم کے حوالے سے میری معلومات بھی محدود ہیں میں بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ تین سال پہلے اس کے شوہر امتیاز علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ بالکل تنہا ہو گئی ہے۔''

''امتیاز علی کا انتقال کس طرح ہوا تھا؟''

''میں سمجھا نہیں جناب!'' اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میرا مطلب ہے' امتیاز علی طبعی موت مرا تھا یا کوئی حادثہ وغیرہ......''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے میری بات کاٹ دی اور بولا ''امتیاز علی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس کی موت کا سبب دل کا جان لیوا دورہ تھا۔ حرکتِ قلب بند ہونے سے وہ چل بسا تھا۔''

میں نے پوچھا ''تم نے بتایا تھا کہ امتیاز علی کی کوئی اولاد وغیرہ بھی نہیں ہے اور نہ ہی دونوں میاں بیوی کا کوئی نزدیکی رشتے دار ہے۔''

''جی ہاں' میں نے یہی بتایا تھا۔'' اے ایس آئی نے جواب دیا ''میری معلومات تو یہی ہے جناب۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ امتیاز علی کے انتقال کے بعد تمام جائیداد اور زمین کی وارث دلشاد بیگم ہی ٹھہری ہو گی۔''

''یہ تو ظاہری بات ہے جناب۔''

میں نے کہا ''تمہارے بیان کے مطابق امتیاز علی خاصا باحیثیت زمیں دار تھا۔ اس کی زمینوں کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟''

''مجھے پتا چلا ہے کہ امتیاز علی کی کوئی پچاس ایکڑ کے اریب قریب زرعی زمین ہے جس میں سے بیس ایکڑ شام کوٹ میں اور باقی تیس ایکڑ دیگر مختلف علاقوں میں ہے۔''

''ہوں۔'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اے ایس آئی نے پوچھا ''آپ کیا سوچ رہے ہیں جناب؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا ''مشکور! اس بارے میں تم نے اچھی طرح دلشاد بیگم سے پوچھ لیا تھا نا کہ یہ چوری کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ تو نہیں؟''

''میں نے بہت کرید کر پوچھا تھا جناب۔'' وہ تسلی آمیز انداز میں بولا ''دلشاد بیگم نے کسی بھی شخص پر اپنے شک کا اظہار نہیں کیا۔''

اے ایس آئی مشکور علی کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ متناسب قد کا مالک ایک خوب رو شخص تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ گورے چٹے چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں بڑی بھلی دکھائی دیتی تھیں۔

میں لگ بھگ دو گھنٹے تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوال پوچھتا رہا اور اس کے جوابات میں پائی جانے والی اہم باتوں کو اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ میں جب کنگن والے صندلی بکس کے بارے میں پوچھ رہا تھا تو اس نے چونکتے ہوئے ایک اہم انکشاف کیا۔

''ملک صاحب!'' وہ پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ''ایک بات تو میں آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔'' پھر وہ نفی میں گردن ہلانے لگا۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے کسی وجہ سے افسوس ہو رہا ہو۔

''ایسی کیا بات ہے بھئی؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! دلشاد بیگم نے بتایا تھا کہ بکس کے جس خانے میں طلائی جڑاؤ کنگن رکھا جاتا ہے اس کے نیچے ایک خفیہ خانہ بھی ہے اور اس خفیہ خانے میں اس کا ایک خاص کاغذ بھی موجود ہے۔''

''خاص کاغذ!'' میں نے زیرِ لب دہرایا ''کس قسم کا خاص کاغذ؟''

''کوئی دستاویز وغیرہ جناب۔''

''کیوں پہیلیاں بجھوا رہے ہو مشکور علی۔'' میں نے بیزاری سے کہا ''کھل کر بتاؤ کس نوعیت کی دستاویز اس جیولری بکس میں موجود تھی؟''

وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا ''جناب! میں اس سلسلے میں آپ سے معذرت ہی کر سکتا ہوں۔ آپ یقین کریں' میں اس دستاویز کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے دلشاد بیگم سے پوچھا تھا لیکن اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔ بس اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ کوئی اہم قانونی کاغذ ہے۔ ممکن ہے جناب' وہ زمین جائیداد سے متعلق کوئی اہم دستاویز ہو۔''

''ہاں' ایسا ہو سکتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

اس کے بعد بھی ہمارے درمیان کنگن اور دلشاد بیگم کے موضوع پر بات چیت ہوتی رہی۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے اے ایس آئی کو آرام کرنے کے لیے اس کے بستر تک پہنچا دیا اور خود

تھانے کے پچھواڑے اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا آیا۔

دوسری صبح جب میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ اے ایس آئی مشکور تھانے میں موجود نہیں تھا۔ وہ علی الصباح وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے میرے تھانے کے ایک کانسٹیبل طارق نے دی تھی۔ وہ ان دنوں شبینہ ڈیوٹی پر تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔

''ملک صاحب! اس وقت ابھی پوری طرح اجالا بھی نہیں پھیلا تھا کہ مہمان اے ایس آئی چلا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ملک صاحب کو اس کے بارے میں کیا بتایا جائے تو اس نے جواب دیا کہ ملک صاحب کو یہی بتایا جائے کہ اسے ایک نہایت ہی ضروری کام یاد آ گیا ہے...... اور یہ کہ وہ آج ہی کسی وقت واپس آ جائے گا۔''

اے ایس آئی کی یہ حرکت مجھے ناگوار گزری تھی۔ اگر اسے جانا ہی تھا تو کم از کم مجھے تو بتا جاتا۔ میں اذان فجر کے وقت بیدار ہو جاتا تھا اور یہ بات میں نے اسے رات ہی میں بتا دی تھی۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

''طارق! کیا مہمان نے یہ بتایا تھا کہ وہ کہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا؟''

''جی ملک صاحب!'' طارق نے جواب دیا ''اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ واپس کنگن پور جا رہا تھا۔''

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد طارق سے پوچھا ''کیا اس کا سامان وغیرہ تھانے ہی میں رکھا ہوا ہے؟''

''نہیں جناب، وہ اپنا تھیلا بھی ساتھ لے گیا ہے۔''

''تمہاری تو رات کی ڈیوٹی ہے نا طارق۔'' میں نے کانسٹیبل کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''اور ڈیوٹی کا مطلب ہوتا ہے، جاگنا...... مسلسل جاگنا۔''

''جی ملک صاحب! میں اپنی ڈیوٹی کے دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا ''میں پوری رات جاگتا رہا ہوں۔''

''پھر تو تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہوگا کہ مہمان اے ایس آئی نے گزشتہ رات آرام سے سو کر گزاری تھی یا......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا، کانسٹیبل جلدی سے بولا ''ملک صاحب! آپ کو تو پتا ہے، تھانے میں مچھر اتنی تعداد میں موجود ہیں کہ آرام سے سونا ناممکنات میں سے ہے تاہم مہمان اے

ایس آئی آدھی رات کے بعد بے خبر سو گیا تھا پھر جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی، میں اس کے پاس چلا گیا۔ اسی وقت اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے ایک نہایت ہی ضروری کام یاد آ گیا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''ملک صاحب! مجھے تو یوں لگتا ہے، وہ ضروری کام اسے خواب میں نظر آیا ہو گا۔''

میں نے کانسٹیبل کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ اے ایس آئی کے اچانک چلے جانے سے میں عجیب سی الجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک خیال ذہن میں یہ آتا تھا کہ فوری طور پر کنگن چور کے سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھاؤں، دوسرا خیال یہ تھا کہ مشکور علی کی واپسی کا انتظار کروں پھر میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ مشکور علی کے انتظار میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر اپنے تھانے کے اے ایس آئی خورشید خان کو اپنے پاس بلا لیا۔

خورشید کی آمد پر میں نے تفصیلاً اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ مبینہ نامعلوم کنگن چور کا حلیہ اسے ذہن نشین کروانے کے بعد کہا ''خورشید! اس شخص کو بصیر پور میں تلاش کرنا ہے۔ تم تو یہیں بصیر پور کے رہنے والے ہو نا!''

''جی ملک صاحب!'' اس نے اثبات میں جواب دیا ''میں جدی پشتی بصیر پور کا رہنے والا ہوں مگر بصیر پور بھی کوئی چھوٹا سا علاقہ نہیں ہے۔ مطلوبہ بندے کا سراغ لگانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا ''کیا یہ بندہ بھی بصیر پور کا ہی وسنیک ہے یا کنگن پور کا رہنے والا ہے؟''

میں نے مشکور علی سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں جواب دیا ''اس بات کی تو تصدیق ہو گئی ہے کہ مبینہ چور کا تعلق کنگن پور سے نہیں ہے مگر وہ بصیر پور کا رہنے والا ہے یا نہیں اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی تمہیں ہی معلوم کرنا ہوگا۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا ''خورشید خان! تمہیں جتنے آدمیوں کی ضرورت ہو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مذکورہ شخص سولہ اگست کو بصیر پور ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا۔ اس نے ناظم علی نامی شخص کے ہوٹل ''نعمت کدہ'' سے کچھ کھایا پیا بھی تھا اور طالب حسین سگریٹ فروش سے قینچی مارکہ سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خریدا تھا۔ تم ناظم علی اور طالب حسین سے بھی پوچھ تاچھ کر سکتے ہو۔''

''او کے سر! میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔'' خورشید خان نے کہا۔

''شاباش۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''مجھے امید ہے، تمہاری یہ کوشش ضرور کامیاب ہوگی۔''

تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے کمرے سے چلا گیا۔ میں روزمرہ کے کام نمٹانے میں مصروف ہو گیا پھر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب پندرہ منٹ بعد ہی اے ایس آئی خورشید دوبارہ میرے پاس آیا اور یہ اطلاع دی۔

''ملک صاحب! بندے کا سراغ مل گیا ہے۔''

''وہ کیسے بھئی؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''جناب! اس کنگن چور کا نام رب نواز ہے اور بصیر پور ہی میں رہتا ہے۔'' اے ایس آئی نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

میں نے کہا ''تمہاری فراہم کردہ اطلاع حیرت زدہ کر دینے والی ہے مگر یہ تو بتاؤ' تم نے یہ سب کچھ کس طرح معلوم کر لیا۔ پندرہ منٹ میں تم اسٹیشن سے ہو کر تو نہیں آ سکتے۔ تم نے کون سا جادوئی ذریعہ استعمال کیا ہے؟''

''جناب! میں تو تھانے کی چوحدی ہی سے باہر نہیں گیا۔''

''پھر...... پھر کیسے معلوم کر لیا؟'' میری حیرت دوچند ہو گئی۔

اے ایس آئی خورشید خان نے میری حیرت اور کیفیت کو بھانپتے ہوئے بتایا ''میں نے تھانے سے روانہ ہونے سے قبل حوالدار عید محمد سے سرسری تذکرہ کیا تھا۔ وہ پوچھ بیٹھا تھا کہ میں کہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اسے اپنے ارادے سے آگاہ کر کے میں نے اچھا کیا یا برا اس کا تو مجھے اندازہ نہیں مگر اس کے نتائج خاصے امید افزا اور مفید برآمد ہوئے ہیں۔'' اے ایس آئی سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! حوالدار عید محمد ''چک گنڈا سنگھ'' کا رہنے والا ہے۔ میں نے جب اسے مبینہ کنگن چور کا حلیہ بتایا تو وہ فوراً بول اٹھا کہ اس حلیے پر رب نواز سولہ آنے پورا اترتا ہے۔ رب نواز پہلے چک گنڈا سنگھ ہی میں رہتا تھا۔ پچھلے چند سالوں سے وہ بصیر پور میں ہے۔''

''بصیر پور میں کہاں...... کس جگہ؟'' میں نے اضطراری انداز میں دریافت کیا۔

جواب میں خورشید خان نے کہا ''ملک صاحب! آپ حوالدار عید محمد کو یہاں بلا لیں۔ یہ بات زیادہ بہتر طور پر بتا سکتا ہے۔''

اے ایس آئی کی بات معقول تھی۔ میں نے فوراً حوالدار کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میں نے مختصر تمہید کے بعد حوالدار سے سوال کیا ''عید محمد! کیا تمہیں یقین ہے کہ ہمارا مطلوبہ بندہ تمہارا بیان کردہ رب نواز ہی ہے؟''

''جناب حلیے کے حساب سے تو وہ رب نواز ہی ہو سکتا ہے۔''

''رب نواز تمہارے علاقے چک گنڈا سنگھ کا رہنے والا ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ملک صاحب!'' حوالدار نے جواب دیا ''وہ چند سال پہلے تک چک گنڈا سنگھ ہی میں رہتا تھا مگر اب یہیں بصیر پور میں پایا جاتا ہے۔''

''یہاں وہ کیا کرتا ہے' تمہیں معلوم تو ہوگا؟''

''یہاں وہ ملک دلدار کی چاکری میں ہے۔''

''کون ملک دلدار؟''

''ملک دلدار بصیر پور کی معروف شخصیت ہے جناب۔'' اے ایس آئی خورشید نے بتایا ''بہت ہی طاقت ور زمیں دار ہے وہ۔''

''کیا یہ وہی دلدار ہے جو آئندہ الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''بالکل وہی جناب۔'' حوالدار نے کہا ''کہا جا رہا ہے کہ ملک دلدار یہ الیکشن ضرور جیتے گا۔ اس نے اپنے حریفوں میں سے دو کو تو اپنی طاقت کا ''استعمال'' کر کے بٹھا دیا ہے۔ اس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ ہر ناممکن کام کو ممکن کر سکتا ہے۔ اب تو الیکشن میں زیادہ عرصہ باقی نہیں رہا۔ بڑی دھوم دھام سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔''

میں نے ملک دلدار کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ زبردست سیاسی چالیں چلنے کا ماہر تھا۔ مجھے بصیر پور کے اس تھانے میں تعینات ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ملک دلدار سے ابھی میری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

میں نے حوالدار عید محمد اور اے ایس آئی خورشید خان کو باری باری مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اب تم دونوں اس منصوبے پر کام کرو گے۔ کسی تیسرے کو کانوں کان خبر نہیں ہونا چاہیے۔ تم نے جلد از جلد یہ معلوم کر کے مجھے بتانا ہے کہ آیا سولہ اگست کو کنگن پور سے بصیر پور تک ٹرین میں سفر کرنے والا شخص ہمارا مطلوبہ کنگن چور رب نواز ہی تھا یا کوئی اور شخص تھا اور اگر رب نواز نہیں تھا تو پھر یہ ضرور معلوم کیا جائے کہ وہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب کہاں تھا؟ آپ میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

''جی' بالکل سمجھ رہے ہیں۔'' انہوں نے بیک زبان کہا۔

میں نے مختصراً حوالدار کو بھی کنگن کی چوری کے بارے میں آگاہ کر دیا پھر ضروری ہدایات کے بعد انہیں رخصت کر دیا۔ اگر کنگن پور کے تھانے والوں کا مطلوبہ شخص یہی رب نواز ہی تھا تو پھر یہ کیس حل ہونے کے قریب ہی تھا۔ میں کنگن چور کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک خیال نے چونکا دیا اور وہ خیال یہ تھا کہ رب نواز کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کے لیے عید محمد اکیلا ہی کافی تھا۔ خورشید خان کو اس طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس سے رب نواز کو کوئی شک گزر سکتا تھا۔

میں نے فوری طور پر معلوم کروایا کہ وہ دونوں تھانے سے نکل چکے ہیں یا نہیں۔ اتفاق سے وہ دونوں ابھی تھانے ہی میں تھے۔ میں نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ وہ اس بلاوے پر حیران تھے۔

میں نے پہلے خورشید خان کو مخاطب کیا ''تم صرف اسٹیشن کی طرف جاؤ گے اور حوالدار تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ تمہیں اکیلے ہی ''نعمت کدہ'' کے مالک ناظم علی اور سگریٹ فروش طالب حسین سے مل کر معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔ اس کے علاوہ تم اسٹیشن کے اندر بھی جاؤ گے اور ممکن حد تک نامعلوم کنگن چور کے بارے میں جاننے کی کوشش کرو گے۔''

''جو حکم ملک صاحب۔'' اے ایس آئی خورشید خان نے فرماں برداری سے کہا۔

''اور تم عید محمد!'' میں نے حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اپنے واقف رب نواز سے ملنے ملک دلدار کے ٹھکانے پر جاؤ گے۔ تم سادہ لباس میں جاؤ گے۔ رب نواز کسی زمانے میں تمہارے گاؤں میں رہتا تھا اس لیے وہ تم پر شک نہیں کر سکتا۔ تم اس سے دوستانہ ماحول میں ملو گے اور اپنے مخصوص ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے حقیقت حال جاننے کی کوشش کرو گے۔ خاص طور پر یہ بات معلوم کرنا ہو گی کہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب رب نواز کی کیا مصروفیات رہی تھیں۔''

حوالدار عید محمد نے کہا ''آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔ میں یہ کام بہت آسانی سے کر لوں گا۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر ان دونوں کو رخصت کر دیا۔

شام کے وقت اے ایس آئی خورشید خان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ مہمان اے ایس آئی مشکور علی کی فراہم کردہ اطلاعات صد فی درست تھیں۔ رب نواز جیسا حلیہ رکھنے والے ایک شخص نے ''نعمت کدہ'' سے چائے پانی پیا تھا اور طالب حسین سے سگریٹ کا پیکٹ بھی خریدا تھا۔ یہ دونوں افراد چونکہ رب نواز کو ذاتی طور پر نہیں جانتے اس لیے کنگن چور کی شناخت بہ حیثیت رب نواز نہیں ہو سکی۔

میں خورشید خان سے بات چیت کر ہی رہا تھا کہ حوالدار بھی واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش پایا جاتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی بڑی خبر لایا تھا۔

''ہاں، بھئی عید محمد!'' میں نے اسے مخاطب کیا ''کیا رہا؟''

''ایک اچھی خبر ہے'' اس نے بتایا ''مگر میں کچھ الجھا ہوا ہوں۔''

''تم خبر سناؤ۔ تمہاری الجھن کو میں دور کر دوں گا'' میں اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

حوالدار نے بتایا ''ملک صاحب! پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب رب نواز بصیر پور میں نہیں تھا۔''

''پھر کہاں تھا؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ دیپال پور گیا ہوا تھا۔''

''دیپال پور میں کس جگہ؟''

''موضع قلعہ تارا سنگھ'' حوالدار نے جواب دیا۔

دیپال پور (ضلع اوکاڑہ) سے شام کوٹ (ضلع قصور) کافی فاصلے پر واقع ہے۔ اگر رب نواز وقوعہ کی رات موضوع قلعہ تارا سنگھ میں موجود تھا تو پھر کنگن کی چوری کے حوالے سے اس پر شک کمزور ہو جاتا تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت حوالدار سے سوال کیا۔

''عید محمد! کیا یہ معلوم ہو سکا ہے کہ رب نواز قلعہ تارا سنگھ کیوں گیا تھا؟''

''اس کے ایک دوست کی شادی تھی وہاں'' عید محمد نے جواب دیا ''وہ ملک دلدار سے ایک دن کی چھٹی لے کر گیا تھا۔''

میں نے پوچھا ''تم نے یہ ساری معلومات کس طرح حاصل کی ہیں؟''

''بس جناب، ہے میرا بھی اپنا ایک طریقہ کار'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

''کیا تم ملک دلدار سے ملے تھے؟'' میں نے استفسار کیا۔

حوالدار نے نفی میں سر ہلایا۔

''رب نواز سے تو یقیناً تمہاری ملاقات ہوئی ہو گی!''

''نہیں جناب!'' اس نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا ''رب نواز ملک دلدار کی حویلی میں موجود نہیں تھا۔ ملک دلدار نے اسے کسی ضروری کام سے موضوع کوٹ زمان شاہ بھیجا ہوا ہے۔''

موضع کوٹ زمان شاہ، بصیر پور ہی میں تھا۔ میں نے کہا ''عید محمد! تم ملک دلدار کی حویلی میں

داخل ہوئے بغیر اور رب نواز سے ملے بنا خاصی مفید معلومات جمع کر لائے ہو۔“

”بس ملک صاحب‘ اتفاق سے حویلی کے باہر ایک ایسا بندہ مل گیا جو ملک دلدار کی الیکشن کی تیاریوں میں پیش پیش ہے۔ میں نے حشمت اللہ نامی اس شخص سے تھوڑی دیر گپ شپ کی اور باتوں ہی باتوں میں رب نواز کے بارے میں چند اہم باتیں پوچھ لیں۔“

ہم تینوں کنگن چور نا معلوم شخص اور ملک دلدار کے ملازم رب نواز کے بارے میں گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ایک کانسٹیبل نے میرے کمرے میں آ کر اطلاع دی۔

”ملک صاحب! اے ایس آئی مشکور علی کنگن پور سے واپس آ گیا ہے اور فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

”اسے اندر بھیج دو“ میں نے بے ساختہ کہا۔

چند لمحوں کے بعد مشکور علی میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے سرسری علیک سلیک کے بعد پوچھا ”بھئی! تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟“

”بس جی‘ کچھ بات ہی ایسی ہو گئی تھی کہ مجھے آپ کو بتائے بغیر یہاں سے جانا پڑ گیا“ وہ قدرے شرمندہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”ایسی کیا بات ہو گئی تھی آخر؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے باری باری ہم تینوں کے چہروں کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا ”پتا نہیں‘ آپ لوگوں کو میری بات کا یقین بھی آئے گا یا نہیں۔ مجھے لگتا ہے‘ آپ میرا مذاق اڑائیں گے۔“

”ہم تمہارا مذاق اڑائیں گے یا تمہیں سراہیں گے“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”پہلے اپنے بارے میں بتاؤ تو سہی۔ ایسی کیا مجبوری تھی کہ تمہیں صبح سویرے اٹھ کر بھاگنا پڑا؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! دراصل میں نے گزشتہ رات ایک معنی خیز خواب دیکھ لیا تھا۔“

مشکور علی کی بات سن کر میرا دھیان کانسٹیبل طارق کے تبصرے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے بھی کچھ ایسی ہی بات کی تھی‘ کسی خواب وغیرہ کا حوالہ دیا تھا۔ طارق کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ مشکور علی کوئی ضروری کام یاد آ جانے پر علی الصباح کنگن پور روانہ ہو گیا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مشکور علی! میرے ایک کانسٹیبل نے مجھے

بتایا تھا کہ تمہیں کوئی ضروری کام یاد آ گیا تھا اس لیے تم فوراً کنگن پور چلے گئے تھے مگر اب تم بتا رہے ہ کہ تم نے کوئی ایسا ویسا خواب دیکھ لیا تھا۔ یہ کیا چکر ہے بھئی؟“

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ”جناب! صبح میں بہت جلدی میں تھا اس لیے کانسٹیبل کو میں ضروری کام کہہ کر ٹال دیا تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں خواب کی وجہ سے کنگن پور گیا تھا۔“

”ایسا کیا خواب دیکھ لیا تھا تم نے؟“

”آپ مذاق تو نہیں اڑائیں گے نا!“

”چلو نہیں اڑائیں گے تمہارا مذاق“ میں نے تشفی آمیز انداز میں کہا ”اب بتاؤ کیا خواب دیکھ تھا؟“

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ”جناب! میں نے خواب میں دلشاد بیگم کو دیکھا تھا“ اس کا انداز خاصا پراسرار تھا۔

”دلشاد بیگم...... یعنی جڑاؤ کنگن کی مالک؟“

”جی بالکل وہی دلشاد بیگم!“ وہ جلدی سے بولا۔

”وہ خواب میں تم سے کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ہماری جانب ایسی نظر سے دیکھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ ہم اس کی بات سن کر تمسخر اڑائیں گے۔ جب ہم پوری توجہ سے اس کی جانب متوجہ رہے تو اس نے بتایا۔

”دلشاد بیگم نے خواب میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ جان چکی ہے کہ میں کنگن چور کی تلاش میں کنگن پور سے بصیر پور پہنچ گیا ہوں۔ بصیر پور کے حوالے سے وہ مجھے کوئی خاص الخاص بات بتانا چاہتی تھی اس لیے اس نے مجھے فوراً کنگن پور بلایا تھا۔“

”دلشاد بیگم وہ خاص بات تمہیں خواب میں بھی تو بتا سکتی تھی“ میں نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا ”اس نے تمہیں کنگن پور جانے کو کیوں کہا تھا؟“

”خواب کے مسائل بہت بے چیدہ ہوتے ہیں جناب!“ وہ مفکرانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا ”پھر سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے خواب میں اس سے زیادہ سوال و جواب نہیں کیے اور اس کی ہدایت پر فوراً کنگن پور روانہ ہو گیا۔“

میں نے فروعی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سوال کیا ”پھر دلشاد بیگم نے تمہارے کنگن پور پہنچنے پر کون کون سے انکشافات کیے ہیں مشکور علی؟“

مشکور علی نے جواب دیا ''ملک صاحب! جب میں کنگن پورا اپنے تھانے پہنچا تو اس وقت دلشاد بیگم رانا صاحب کے پاس تھانے میں موجود تھی۔ اگر وہ وہاں نہ پائی جاتی تو میرا ارادہ سیدھا شام کوٹ جانے کا تھا تا کہ خواب کے حوالے سے اس سے بات کر سکوں۔ کانسٹیبل محمد نذیر اور کھوجی خوشی محمد نے رانا صاحب کو بصیر پور والی صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ رانا صاحب نے دلشاد بیگم کو بتایا تھا کہ کنگن چور کنگن پور سے بہ ذریعہ ٹرین بصیر پور پہنچا ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی دلشاد بیگم نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا اور پوچھا کہ کیا میں نے کنگن چور کر پکڑ لیا ہے؟ اس کے سوال کے جواب میں' میں نے بتایا کہ کنگن چور انشاء اللہ بہت جلد قانون کی گرفت میں آ جائے گا۔ پھر میں نے خواب کے حوالے سے دلشاد بیگم کو سب کچھ بتا دیا۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ بولی کہ خواب تو بس خیال ہی ہوتا ہے۔ چلو' یہ اچھا ہوا کہ آپ بصیر پور ہی میں رکنے کے بجائے کنگن پور چلے آئے۔ جب سے مجھے پتا چلا ہے کہ کنگن چور بصیر پور سے تعلق رکھتا ہے' اس وقت سے میرا ذہن الجھن کا شکار ہے۔ بار بار میرے دماغ میں ایک نام گونج اٹھتا ہے۔ پتا نہیں مجھے اس کا ذکر کرنا چاہیے یا نہیں۔ دلشاد بیگم کی اس بات پر رانا جمشید صاحب نے اس سے کہا کہ اس کے دماغ میں جو نام پریشانی پیدا کر رہا ہے وہ اسے اپنی زبان پر ضرور لائے۔ ممکن ہے' اس سے موجودہ کیس میں کچھ مدد مل سکے۔ اس پر دلشاد بیگم نے کہا کہ ہمیں بصیر پور کی معروف سیاسی شخصیت ملک دلدار کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔''

اتنا کہہ کر اے ایس آئی خاموش ہو گیا۔ ملک دلدار کے ذکر نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا ''ملک دل دار کا موجودہ کیس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے' اس بارے میں دلشاد بیگم نے کچھ بتایا ہے؟''

مشکور علی نے کہا ''میں نے یہی سوال دلشاد بیگم سے کیا تھا اور اس نے جواب میں بتایا تھا کہ ملک دلدار کسی زمانے میں اس کے مرحوم شوہر کا دوست ہوا کرتا تھا' پھر کسی معاملے پر ان دونوں میں ان بن ہو گئی اور ان کا ملنا جلنا ختم ہو گیا۔ امتیاز علی کے انتقال کے بعد تو ملک دلدار نے کبھی بھول کر بھی شام کوٹ کا رخ نہیں کیا تھا۔''

قارئین کرام! آپ شام کوٹ اور کنگن پور کے تذکرے سے کسی الجھن کا شکار نہ ہوں۔ اس زمانے میں موضوع شام کوٹ کو تھانہ کنگن پور ہی لگتا تھا۔ آج کل کا مجھے پتا نہیں۔ دلشاد بیگم موضوع شام کوٹ کی رہنے والی تھی اور کنگن کی چوری والے کیس کے سلسلے میں کنگن پور تھانے میں اس کی آمد و رفت رہتی تھی جس کے لیے عموماً وہ تانگا استعمال کرتی تھی۔

میں نے پوچھا ''مشکور علی! کیا دلشاد بیگم کنگن کی چوری کے سلسلے میں ملک دلدار پر اپنے شک کا اظہار کر رہی ہے؟''

''اس نے واضح طور پر تو شک کا اظہار نہیں کیا'' مہمان اے ایس آئی نے بتایا۔ ''البتہ دلدار کی طرف سے محتاط اور ہوشیار رہنے کی بات کی ہے۔''

اس وقت میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہی کیفیت اے ایس آئی خورشید خان اور حوالدار عید محمد کی بھی تھی۔ بیگم دلشاد نے ملک دلدار کے حوالے سے ہوشیار رہنے کو کہا تھا۔ کنگن چور جو ممکن طور پر رب نواز ہو سکتا تھا' وہ ملک دلدار کا خاص ملازم تھا...... اور وہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب بصیر پور میں نہیں تھا۔ اگرچہ اس کے بارے میں پتا چلا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست کی شادی میں قلعہ تارا سنگھ (دیپال پور) گیا ہوا تھا لیکن عین ممکن تھا کہ وہ قلعہ تارا سنگھ جانے کے بجائے سیدھا شام کوٹ (کنگن پور) پہنچا ہو اور رات کی تاریکی میں کنگن چرا کر بصیر پور آ گیا ہو۔ اگر یہ سب کچھ ایسا ہی تھا جیسا بیان کیا گیا ہے تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ کنگن کی چوری کے پیچھے ملک دلدار کا ہاتھ تھا مگر اس نتیجے پر پہنچنے سے پہلے رب نواز کو ''چیک'' کرنا ضروری تھا۔ اب تک مجھے رب نواز کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ ملک دلدار کا وفادار ملازم تھا۔

اس کیس کی بہت سی کڑیاں آپس میں مل گئی تھیں۔ چند کڑیاں باقی تھیں۔ اگر وہ بھی مل جاتیں تو یہ زنجیر مکمل ہو سکتی تھی۔ مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر مہمان اے ایس آئی نے پوچھا۔

''ملک صاحب! آپ نے اب تک کوئی کارروائی ڈالی یا نہیں؟''

میں نے چونکتے ہوئے کہا ''کارروائی ڈالنے کا وقت آ گیا ہے مشکور علی!''

پھر میں نے اسے مختصراً رب نواز کے بارے میں بتایا۔ میری بات سننے کے بعد وہ جوشیلے لہجے میں بولا ''پھر دیر کس بات کی ہے جناب! ہم ابھی چلتے ہیں ملک دلدار کی حویلی پر۔''

''ہم فوری طور پر وہاں نہیں جا سکتے مشکور علی!'' میں نے کہا۔

''وہ کیوں ملک صاحب!''

''بس سمجھ لو کہ میں سر دست ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟'' مشکور علی نے پوچھا۔

''میں نے کہا'' اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔''

''مثلاً کون کون سی؟''

میں نے معتدل لہجے میں جواب دیا ’’پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت رب نواز ملک دلدار کی حویلی پر موجود نہیں۔ ملک نے اسے کسی ضروری کام سے کوٹ زمان شاہ بھیجا ہوا ہے......‘‘

’’کوئی سیاسی کام ہی ہوگا‘‘ مشکور علی بیچ میں بول پڑا ’’سنا ہے، ملک دل دار آیندہ الیکشن میں حصہ لے رہا ہے!‘‘

’’بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا ہے بھئی!‘‘ میں نے کہا پھر دوبارہ اپنی بات کی طرف آتے ہوئے بتایا ’’مشکور علی! فوری طور پر ملک دل دار کی حویلی نہ جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔‘‘

’’میں کچھ سمجھا نہیں جناب!‘‘ مشکور علی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

میں نے وضاحتی لہجے میں کہا ’’بات یہ ہے مشکور علی کہ میں جب پوچھ تاچھ کے لیے ملک دلدار کی حویلی جاؤں گا تو میری خواہش ہوگی کہ اگر ضرورت پڑے تو میں اس کی حویلی کی تلاشی بھی لوں اور اس کے لیے سرچ وارنٹ کا ہونا ضروری ہے جو کل صبح ہی عدالت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ملک دلدار جیسے طاقتور سیاسی آدمی پر بڑی پلاننگ سے ہاتھ ڈالنا ہوگا‘ کیا سمجھے تم؟‘‘

’’بالکل سمجھ گیا جناب!‘‘ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ’’آپ نے رب نواز کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اور دلشاد بیگم نے ملک دلدار کے حوالے سے جو نشاندہی کی ہے اس کی روشنی میں، مجھے پورا یقین ہے کہ جڑاؤ کنگن کی چوری میں ملک دلدار ہی کا ہاتھ ہے۔‘‘

ہم رات گئے تک کنگن اور ملک دلدار کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر میں آرام کرنے کی غرض سے اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا گیا۔

دوسری صبح میں سرچ وارنٹ حاصل کرنے عدالت نہ جا سکا۔ تھانے میں بلوے کا ایک کیس آ گیا تھا۔ نہری پانی کی تقسیم کے سلسلے میں دو چھوٹے زمین داروں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ دونوں طرف سے خاصا جانی نقصان ہوا تھا۔ اس معرکے میں چار افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ دونوں پارٹیاں تھانے میں موجود تھیں۔ میں نے فوری ضروری کارروائی کر کے چند افراد کو گرفتار بھی کر لیا تھا۔ اس معاملے کو سیدھا کرتے کرتے دوپہر ہو گئی۔ مجھے جب سر کھجانے کی فرصت ملی اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ عدالت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اب آیندہ روز ہی سرچ وارنٹ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ تاہم شام کے وقت میں نے حوالدار عید محمد کو ملک دلدار کی حویلی کی طرف روانہ کیا تا کہ تازہ ترین صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے۔

عید محمد نے واپس آ کر مجھے بتایا کہ رب نواز کوٹ زمان شاہ سے لوٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی عید محمد نے یہ اطلاع بھی دی کہ ملک دلدار بہ ذات خود حویلی میں موجود نہیں تھا۔ پوچھنے پر اسے پتا چلا تھا کہ ملک دلدار ارد گرد کے گاؤں کا سیاسی دورہ کرنے گیا تھا تا کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ووٹ دینے کے لیے ذہنی طور پر ہموار کر سکے۔ دو دن کے اس دورے میں ملک دلدار نے قلعہ دیوا سنگھ، چورستہ میاں خان، روہیلہ تاجے کا، چک شاہ محمد بودلا، مرزا پور اور دیپال پور وغیرہ جانا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ آیندہ دو دن تک ہم ملک دلدار سے ملاقات نہیں کر سکتے تھے۔

اس صورت حال نے مجھے الجھا دیا تھا۔ میرے تھانے کے اے ایس آئی خورشید خان نے کہا ’’ملک صاحب! یہ اچھا موقع ہے۔ ملک دلدار دو روز کے لیے بصیر پور سے باہر گیا ہوا ہے۔ اس دوران میں ہم رب نواز پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ ملک دلدار کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں ہوگا۔ اس طرح ہم رب نواز سے حقیقت حال جاننے میں کامیاب ہو جائیں گے۔‘‘

’’تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے خورشید خان!‘‘ میں نے تائیدی لہجے میں کہا پھر خانہ پری کے لیے مشکور علی سے پوچھا ’’تمہارا کیا خیال ہے بھئی؟‘‘

میرے استفسار پر مشکور علی چیں بہ جبیں دکھائی دینے لگا، ہچکچاتے ہوئے لہجے میں بولا ’’ملک صاحب! اس طرح کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟‘‘

’’کیسی گڑبڑ مشکور علی؟‘‘

’’مم...... میرا مطلب ہے......‘‘ وہ اٹکتے ہوئے بولا ’’اگر واقعی کنگن کی چوری ملک دلدار کے ایما پر کی گئی ہے تو رب نواز پر ہاتھ ڈالنے سے ملک دلدار ہوشیار ہو سکتا ہے۔‘‘

’’تمہارے خیال میں ہمیں براہ راست ملک پر ہاتھ ڈالنا چاہیے۔‘‘

’’جی ہاں، میرا یہی خیال ہے‘‘ مشکور علی نے سر کو تائیدی جنبش دی۔

’’اور اس کے لیے ہمیں کم از کم دو دن انتظار کرنا ہوگا‘‘ میں نے پرسوچ لہجے میں کہا ’’لیکن میں دو دن تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ مشکور علی، ملک دلدار جب واپس آئے گا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے ذرا رب نواز کی خبر تو لے لیں۔‘‘

اے ایس آئی خورشید خان نے کہا ’’ملک صاحب! اگر آپ کا حکم ہو تو میں رب نواز کو پکڑ کر تھانے لے آؤں؟‘‘

’’ہاں بھئی، یہ کام ضرور کرو‘‘ میں نے اسے اجازت دیتے ہوئے کہا ’’اور اپنے ساتھ دو کانسٹیبلز

بھی لے جاؤ۔"

خورشید خان اسی وقت اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ مہمان اے ایس آئی کو میرا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ میں اس موقع پر مشکور علی کی دلداری نہیں کرسکتا تھا۔ کام کرنے کا میرا اپنا ایک انداز تھا اور میرا خیال تھا کہ میں نے رب نواز کو تھانے بلانے کا بروقت فیصلہ کیا تھا۔ مشتبہ افراد کو ڈھیل دینا کیس بگاڑنے کے مترادف تھا۔

حوالدار تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر کمرے سے باہر گیا تو مہمان اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھا "ملک صاحب! آپ رب نواز سے کس قسم کے سوالات کریں گے؟"

مجھے اس کا یہ سوال ناگوار گزرا تاہم میں نے اپنی ناپسندیدگی کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کسی کسی وقت مشکور علی مجھے ایک احمق پولیس والا نظر آتا تھا اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خود کو بے وقوف ظاہر کرنے کی اداکاری کررہا ہو۔ اس کی شخصیت ایک بڑے تضاد کا شکار تھی۔ معلوم نہیں' اس تضاد میں اس کی فطرت کا کتنا ہاتھ تھا اور خود اس کا اپنا کتنا حصہ تھا۔

میں نے متحمل انداز میں جواب دیا "مشکور علی! میں رب نواز سے تمہارے سامنے ہی پوچھ گچھ کروں گا۔ تم خود دیکھ لینا' میں کس قسم کے سوالات کرتا ہوں۔"

"آپ بھی سوچتے ہوں گے' میں خواہ مخواہ آپ کے معاملات میں دخل دیتا ہوں" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا "اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو ملک صاحب' تو میں معافی چاہتا ہوں۔"

یہ اس کا ایک اور نیا انداز سامنے آیا تھا۔ میں نے سوچا' مشکور علی ایک پراگندہ طبع شخص ہے جو مختلف مواقع پر مختلف قسم کے رویے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ میں نے اس کے مسئلے کو اپنے ذہن سے پوری طرح جھٹکتے ہوئے کہا۔

"مشکور علی! بے فکر رہو' تمہاری کوئی بات مجھے بری نہیں لگی" پھر اس کی تسلی کے لیے مزید کہا "تم اگر گاہے بہ گاہے میرے معاملات میں مداخلت کرتے ہو تو تمہیں اس کا استحقاق حاصل ہے۔ در حقیقت یہ تمہارا ہی معاملہ ہے جو اب ہمارا مشترکہ معاملہ بن گیا ہے۔ یہ کیس دو تھانوں کی مدد سے حل ہوگا۔ تھانہ کنگن پور اور تھانہ بصیر پور کا پورا عملہ اس وقت ایک پلیٹ فارم پر جمع ہے..... اور وہ پلیٹ فارم ہے' طلائی جڑاؤ کنگن کی تلاش۔"

میری اس وضاحت پر وہ مطمئن نظر آنے لگا۔

اسی وقت حوالدار عید محمد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے بھی تھی جس میں

چائے دانی کے علاوہ چار کپ بھی موجود تھے۔

چائے پینے کے دوران میں ہمارا موضوع گفتگو رب نواز نہیں تھا' نہ ہی ہم نے طلائی جڑاؤ کنگن کے بارے میں بات کی تھی۔ ہمارے درمیان پولیس' قانون' قانون شکنی اور جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح پر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔

غروب آفتاب سے چند منٹ قبل رب نواز کو تھانے پہنچا دیا گیا۔ تاہم اسے ہتھکڑی لگائے بغیر تھانے لایا گیا تھا۔ میں نے مہمان اے ایس آئی مشکور علی اور حوالدار عید محمد کو اپنے کمرے میں رکنے کے لیے کہا اور رب نواز کی جانب متوجہ ہوگیا۔

رب نواز اس حلیے پر صد فی صد پورا اترتا تھا جو میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کررکھا تھا۔ اس کی عمر لگ بھاگ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک گبرو جوان تھا اور ڈیل ڈول سے کوئی پہلوان ہی نظر آتا تھا۔ وہ اپنے تھانے بلائے جانے پر خاصا حیران دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اسے سرتاپا گہری نظر سے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا "رب نواز! کیا تم جانتے ہو کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"تھانے دار صاحب!" وہ حیرت آمیز لہجے میں بولا "میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ نے مجھے تھانے کیوں بلایا ہے۔"

"دیکھ رب نواز!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "میں ذرا دوسری قسم کا تھانے دار ہوں۔ جو لوگ میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں' میں انہیں ہر ممکن رعایت دیتا ہوں مگر جو لوگ مجھے چکر دینے کی کوشش کریں اور میرے سوالات کے جواب میں غلط بیانی سے کام لیں ان کے ساتھ میں بہت برا سلوک کرتا ہوں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اب یہ تم پر منحصر ہے کہ میں تمہارے ساتھ کون سا رویہ اختیار کروں۔"

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا "میں تو یہی چاہوں گا جناب کہ آپ میرے ساتھ نرمی کا رویہ اپنائیں۔"

"اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ مکمل تعاون کرنا ہوگا۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں جناب۔"

"فی الحال تم صرف اتنا تعاون کرو کہ میرے ہر سوال کا ٹھیک اور سچا جواب دو" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا ’’آپ پوچھیں جناب‘ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کی توقع پر پورا اترسکوں۔‘‘

وہ ابھی تک بڑی شرافت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی وضع قطع سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک اکھڑ مزاج شخص ہوگا۔ ایسے لوگ تعاون کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہوتے۔ رب نواز کی یہی ادا مجھے شک میں مبتلا کر رہی تھی۔ میں نے اسے گھیرنے کے لیے ذرا مختلف زاویے سے سوالات شروع کر دیے۔

میں نے پوچھا ’’رب نواز! گزشتہ روز تم بصیر پور میں نہیں تھے۔ سچ سچ بتاؤ‘ تم کہاں گئے ہوئے تھے؟‘‘

’’جناب! میں کوٹ زمان شاہ گیا ہوا تھا۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’وہاں کیا لینے گئے تھے؟‘‘

’’ملک صاحب نے ایک ضروری کام سے بھیجا تھا جناب۔‘‘

’’ملک دلدار آج اپنی حویلی میں نہیں ہے۔‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ’’وہ کہاں گیا ہے؟‘‘

رب نواز نے وہی جواب دیا جو مجھے پہلے سے معلوم ہو چکا تھا یعنی ملک دلدار ووٹوں کے سلسلے میں آس پاس کے گاؤں دیہات کا دورہ کرنے گیا تھا اور دو دن بعد اسے واپس آنا تھا یعنی متوقع طور پر بائیس اگست کی شام کو۔ میں نے ذرا مختلف انداز سے سوال کیا۔

’’رب نواز! چار پانچ روز پہلے بھی تم بصیر پور سے باہر گئے تھے؟‘‘

اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی‘ تھوک نگلتے ہوئے بولا ’’جی ہاں‘ گیا تھا تھانے دار صاحب۔‘‘

میں نے پوچھا ’’تم کہاں گئے تھے؟‘‘

’’میں قلعہ تارا سنگھ گیا تھا جناب۔‘‘

’’مجھے پتا چلا ہے کہ تم پندرہ اگست کو دوپہر کے بعد بصیر پور سے روانہ ہوئے تھے۔‘‘ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ’’اور سولہ اگست کو واپس آئے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘

’’نن...... نہیں......‘‘ وہ اٹک اٹک کر بولا ’’آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں جی۔ ملک دلدار صاحب نے مجھے صرف ایک دن کی چھٹی دی تھی۔‘‘

’’کیا تم کسی ضروری کام سے قلعہ تارا سنگھ گئے تھے؟‘‘

’’کام تو ضروری ہی تھا جناب۔‘‘

’’کام کی نوعیت بتاؤ گے؟‘‘

’’وہ جی۔‘‘ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ ’’وہاں قلعہ تارا سنگھ میں میرا ایک سجن رہتا ہے‘ ظہیر احمد۔ اس کی شادی تھی اس دن۔ میں اس کی شادی میں شرکت کرنے وہاں گیا تھا۔‘‘

میں مسلسل اس کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔ اس کے جواب پر میں نے سخت لہجے میں کہا ’’رب نواز! میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ جھوٹ بولنے والوں کے ساتھ میں بہت ناروا سلوک کرتا ہوں۔‘‘

’’جناب! میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔‘‘ وہ نظر چراتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے انداز سے سمجھ لیا کہ وہ کچھ چھپانے کے لیے غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ’’رب نواز! اگر بعد میں تمہاری کوئی بات غلط ثابت ہوئی تو تمہارا حشر پورا بصیر پور دیکھے گا۔‘‘

وہ خاموش رہا اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے حوالدار عید محمد کو مخصوص اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ بوقت ضرورت اسے اپنے ہاتھ پاؤں کو ’’زحمت‘‘ دینا ہوگی۔ عید محمد کرسی سے اٹھا اور رب نواز کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ مہمان اے ایس آئی مشکور علی اطمینان سے کرسی پر بیٹھا یہ تفتیشی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

میں نے رب نواز کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ’’کیا تم حوالدار عید محمد کو جانتے ہو؟‘‘

وہ عید محمد کی طرف شناسا نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ’’جی‘ جانتا ہوں۔‘‘

’’کیسے جانتے ہو؟‘‘

’’میں پہلے عید محمد کے گاؤں میں ہی رہتا تھا۔‘‘

’’گاؤں کا نام کیا تھا؟‘‘

’’جناب ہمارے گاؤں کا نام تھا...... چک گنڈا سنگھ۔‘‘ اس نے بتایا۔

میں رب نواز کو دھیان میں لگانے کے لیے یہ غیر متعلق سوالات کر رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ رب نواز کو باآسانی اپنے تفتیشی جال میں جکڑ لوں۔

’’رب نواز! تم نے کتنا عرصہ قبل عید محمد کا گاؤں چھوڑ دیا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا ’’تقریباً دس سال پہلے۔‘‘

''تم ملک دلدار کے پاس کب سے ہو؟''

''کافی عرصہ ہوگیا ہے جناب۔''

''کافی کتنا؟''

''کوئی آٹھ سال تو ہو ہی گئے ہوں گے جی۔''

میں نے زاویہ سوالات تبدیل کر دیا ''رب نواز! ذرا یہ تو بتاؤ کہ چار روز پہلے جب تم اپنے دوست ظہیر احمد کی شادی میں شرکت کرنے قلعہ تارا سنگھ گئے تھے تو واپسی سے قبل تم اور کہاں کہاں گئے تھے؟''

''مم۔ میں اور کہیں بھی نہیں گیا تھا جناب۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

میں نے حوالدار کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ اس نے میرے اشارے کو فالو کرتے ہوئے رب نواز کی گدی پر ایک زوردار مکا رسید کیا۔ رب نواز کراہ کر رہ گیا۔ میں نے گرجدار آواز میں کہا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا' جھوٹ بولنے والوں کو میں برداشت نہیں کرتا۔''

''مم۔ میں۔ میں نے جھوٹ نہیں......'' وہ ہکلایا۔

اسی لمحے حوالدار عید محمد نے اس کی پنڈلی پر ٹھڈا رسید کرتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا ''خبیث کی اولاد! غلط بیانی سے کام لیتے ہو۔''

میں نے رعب دار آواز میں کہا ''رب نواز! پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی رات تمہیں شام کوٹ میں دیکھا گیا تھا۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''مم۔ میں بھلا کہہ سکتا ہوں جناب۔''

حوالدار نے اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے ایک زناٹے دار جھانپڑ رسید کیا پھر ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا' اوئے بندر کی نسل! ملک صاحب کی بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دو۔''

''جناب' میں شام کوٹ نہیں گیا تھا۔''

''یہ تو جانتے ہو گے' یہ شام کوٹ ہے کہاں پر؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''جناب! شام کوٹ شاد کنگن پور کا کوئی گاؤں ہے۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ میری نگاہ میں پوشیدہ طنز کے ہلکورے لیتے طوفان کا اندازہ نہیں لگا سکا مطمئن کھڑا میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے مبہم سے انداز میں کہا ''اب تم واقعی مجھ سے تعاون کر رہے ہو رب نواز!''

وہ بدستور خاموش کھڑا رہا۔ میں نے پوچھا ''اگر تمہیں اتنا معلوم ہے کہ شام کوٹ کنگن پور کا کوئی گاؤں ہے تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ شام کوٹ میں ایک مالدار بیوہ دلشاد بیگم بھی رہتی ہے؟''

''میں کسی دلشاد بیگم کو نہیں جانتا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

اس کے جواب کی میکانکی نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ ایسا جواب اسی صورت میں ممکن تھا کہ اس بارے میں پہلے سے سوچ سمجھ رکھا ہو۔

میں نے کہا ''میں اس دلشاد بیگم کی بات کر رہا ہوں جس کے مکان میں تم نے نقب لگائی تھی؟''

''میں......نقب......'' وہ مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟''

میں نے دوٹوک لہجے میں کہا ''رب نواز! کان کھول کر اچھی طرح سنو' میں یہ کہہ رہا ہوں کہ پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی شب کے آخری پہر تم شام کوٹ میں رہنے والی مالدار بیوہ دلشاد بیگم کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھے گئے ہو۔ بتاؤ' تم وہاں کیا کرنے گئے تھے؟''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا جناب۔'' وہ نیم احتجاجی لہجے میں چیخا۔

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی حوالدار عید محمد ''عملی میدان'' میں اتر آیا اور رب نواز پر لات گھونسوں کی برسات کر دی۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر رب نواز کی اچھی خاصی درگت بن چکی تھی۔ اگرچہ رب نواز ایک ہٹا کٹا شخص تھا لیکن عید محمد بھی کسی سینڈو سے کم نہیں تھا پھر عید محمد کو اس پر ایک نفسیاتی برتری بھی حاصل تھی۔ ظاہر ہے' رب نواز ایک حوالدار پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا اور وہ بھی تھانے کے اندر۔ اس وقت رب نواز باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

میں نے کڑک کر کہا ''رب نواز' کچھ آیا سمجھ شریف میں یا تھوڑی کوشش اور کی جائے؟''

وہ منت آمیز لہجے میں بولا ''جناب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ خوامخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔'' میں نے اسے گھورا۔

عید محمد نے کہا ''ملک صاحب! آپ اس سور ما کو ایک گھنٹے کے لیے میرے حوالے کر دیں پھر دیکھیں یہ کیسے زبان نہیں کھولتا۔ اس کی تو میں......''

''نہیں عید محمد۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''میں پہلے سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کی کوشش کروں گا۔ اگر خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تو پھر میں اسے ایک گھنٹا نہیں بلکہ پوری رات کے

لیے تمہاری تحویل میں دے دوں گا۔ مجھے معلوم ہے' تم گھی نکالنے کے لیے نہ صرف انگلی ٹیڑھی کرنے کے ماہر ہو بلکہ اگر ضرورت محسوس کرو تو انگلی توڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتے ہو؟''

پھر میں رب نواز کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس سے مخاطب کرتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا ''رب نواز! ہماری معلومات کے مطابق تم پندرہ اور سولہ اگست کی درمیانی رات چوری کرنے کی غرض سے دلشاد بیگم کے گھر میں گھسے تھے اور تم اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے ہو۔'' ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''رب نواز! تم نے دلشاد بیگم کے گھر سے ایک نہایت قیمتی طلائی جڑاؤ کنگن چرایا ہے۔ وہ کنگن صندل کی لکڑی سے بنے ہوئے ایک چھوٹے بکس میں تھا۔ کیا تم اس بات سے انکار کرتے ہو؟''

''میں نے کوئی کنگن نہیں چرایا جناب۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے کہا ''تم جتنا جی چاہے' جھوٹ بول لو مگر میں تمہیں تمہارے گھر تک پہنچا کر آؤں گا۔ میرے شکنجے میں پھنسا ہوا مجرم چھوٹ نہیں سکتا رب نواز' یہ بات ذہن نشین کر لو۔ میں کل صبح اپنے دو آدمی قلعہ تارا سنگھ روانہ کروں گا۔ وہ وہاں سے معلوم کر لیں گے کہ تم کسی ظہیر احمد کی شادی میں شرکت کرنے قلعہ تارا سنگھ گئے تھے یا نہیں اور......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تیز نظر سے رب نواز کو گھورنے لگا۔ وہ میری نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''اور اب بھی وقت ہے' اگر تم سب کچھ سچ بتا دو تو میں تمہارے ساتھ نرمی برتنے کی کوشش کروں گا۔ بتاؤ' وہ قیمتی جڑاؤ کنگن کہاں ہے؟

''میں کنگن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ کمزور سی آواز میں منمنایا۔

میں نے کہا ''مجھے سختی پر نہ اکساؤ رب نواز۔ میں نے پتھروں کو بولنے پر مجبور کیا ہے' تم کہاں کے ماما خان ہو!''

''آپ پتا نہیں کون سے کنگن کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا ''میں شام کوٹ گیا ہوں اور نہ ہی کسی دلشاد بیگم کو جانتا ہوں۔''

''لیکن دلشاد بیگم تو تمہیں اچھی طرح جانتی ہے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا ''اس نے کنگن پور تھانے میں کنگن کی چوری کی رپورٹ درج کرواتے وقت تمہارا

مفصل حلیہ بھی بیان کیا تھا۔ اسی حلیے کی مدد سے ہم تم تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔''

''اچھا یہ بات ہے۔'' وہ طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ''میں تو کچھ اور سمجھا تھا۔''

''تم کیا سمجھے تھے رب نواز؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ بولا ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''

''کس بات سے تم ڈر گئے تھے؟''

''جناب! آپ نے کہا تھا نا کہ دلشاد بیگم مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔'' وہ مطمئن انداز میں بولا ''حالانکہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ دلشاد بیگم نے میرا حلیہ تھانے والوں کو بتایا تھا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے بات گھما دی ''جناب! ممکن ہے' دلشاد بیگم کا کنگن چوری کرنے والا مجھ سے ملتا جلتا کوئی اور شخص ہو۔ دنیا میں ایک جیسی جسامت اور وضع قطع کے کئی افراد ہو سکتے ہیں۔''

''ایسا ہونا ناممکن تو نہیں مگر......''

میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر رب نواز کو ٹٹولنے والی نظر سے دیکھا پھر کہا ''مگر دلشاد بیگم کا کنگن چوری کرنے والا کوئی اور شخص نہیں بلکہ تم ہی ہو رب نواز!''

''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہیں جناب۔'' وہ اپنے لہجے میں مضبوطی بھرتے ہوئے بولا ''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس؟''

''ثبوت!'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا ''ایک ثبوت تو کل دیپال پور سے آ جائے گا۔ یعنی موضوع قلعہ تارا سنگھ سے۔'' میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے مزید کہا ''اس کے علاوہ بھی میرے پاس ثبوتوں کی کمی نہیں ہے رب نواز۔ کنگن کی مالک دلشاد بیگم نے تمہاری صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس نے تمہاری جو نشانیاں بتائی ہیں وہ من وعن تم میں موجود ہیں پھر ایک ماہر کھوجی نے تمہارا کھرا اٹھایا ہے۔ کھوجی خوشی محمد کی رپورٹ ظاہر کرتی ہے کہ تم شام کوٹ یعنی دلشاد بیگم کے گھر سے نکلنے کے بعد سیدھے کنگن پور ریلوے اسٹیشن پہنچے تھے۔ جب تم کنگن پور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ مذکورہ پلیٹ فارم کے ٹی اسٹال سے تم نے چائے پی تھی۔ اس ٹی اسٹال کے مالک منظور احمد نے تمہارے حلیے کی تصدیق کی ہے پھر لیاقت خان نامی ایک قلی سے بھی تمہاری مختصر بات چیت ہوئی تھی جس نے تم سے ٹکٹ وغیرہ کے بارے میں پوچھا تھا۔ قلی لیاقت خان نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ تم کنگن پور سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔ اس ٹرین کا پہلا اسٹیشن یعنی کنگن پور کے بعد پہلا اسٹیشن ہے ''اٹاری''......اور

اٹاری کے بعد آتا ہے بصیر پور۔"

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میری معلومات کے مطابق تم تو بصیر پور کے اسٹیشن پر ٹرین سے اتر گئے تھے یعنی سولہ اگست کو۔" رب نواز نے ہراساں نظر سے مجھے دیکھا' میں نے کہا "بصیر پور کے ریلوے اسٹیشن سے باہر آ کر تم نے ناظم علی کے "نعمت کدہ" سے چائے پانی پیا اور پھر طالب حسین کے کھوکھے سے تم نے......"

اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا پھر ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا "رب نواز! کیا تم سگریٹ پیتے ہو؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا "کون سا برانڈ؟"

"یہ کیا ہوتا ہے جناب!"

وہ برانڈ کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے وضاحت کی "میں یہ پوچھنا چاہ رہا ہوں' تم کون سا سگریٹ پیتے ہو۔ مثلاً ہتھوڑا مارکا' بگلا مارکا' لالٹین مارکا......؟"

میں جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظر سے رب نواز کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ جھٹ سے بولا "جناب' میں تو قینچی مارکا سگریٹ پیتا ہوں۔"

میں نے دانستہ قینچی مارکا سگریٹ کا نام نہیں لیا تھا۔ رب نواز کی تصدیق کے بعد میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"رب نواز! سولہ اگست کو تم نے طالب حسین سگریٹ فروش کی دکان سے قینچی مارکا سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خریدا تھا۔"

وہ سراسیمہ دکھائی دینے لگا۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"میں تو جناب سولہ تاریخ کو دیپال پور سے آیا تھا" وہ کمزور سے لہجے میں بولا "موضع قلعہ تارا سنگھ میں ظہیر احمد کی شادی تھی۔ قلعہ تارا سنگھ سے میں پہلے دیپال پور پہنچا تھا پھر بس میں بیٹھ کر بصیر پور آ گیا تھا مگر آپ تو ٹرین والی کہانی سنا رہے ہے......اور کنگن پور وغیرہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں جناب' میں نے زندگی میں کبھی چوری نہیں کی اور شام کوٹ کی دلشاد بیگم کو تو میں جانتا تک نہیں پھر ان کا کنگن چوری کرنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

میں نے ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "کیا تمہارا ملک دلدار بھی دلشاد بیگم کو نہیں جانتا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب۔"

"تم بہت کچھ کہہ سکتے ہو۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب۔"

"اوئے مطلب کے گھوڑے!" میں نے اسے جھڑکا "تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ تم لگ بھگ آٹھ سال سے ملک دلدار کے پاس ملازم ہو۔ بتایا تھا کہ نہیں بتایا تھا؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"بتایا تھا جی۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے کہا "میں جس دلشاد بیگم کا پوچھ رہا ہوں' تین سال پہلے اس کے شوہر امتیاز علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ امتیاز علی شام کوٹ کا مشہور زمیندار تھا۔ پورے پچاس ایکڑ زمین تھی اس کی......اور یہ امتیاز علی تمہارے ملک دلدار کا دوست تھا۔ ملک دلدار اکثر اس سے ملنے شام کوٹ جاتا رہتا تھا۔ تم تو آٹھ سال سے ملک دلدار کے ساتھ ہو۔ کیا تم اتنے ہی بے خبر ہو......اور اگر واقعی تم اس قدر نالائق ہو تو پھر سمجھ میں نہیں آتا' ملک دلدار نے تمہیں کیوں اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ تمہارا شمار تو ملک دلدار کے قابل اعتماد ساتھیوں میں ہوتا ہے۔"

وہ تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے بولا "آپ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائی ہیں؟"

"کون سی باتیں؟"

"یہی امتیاز علی' دلشاد بیگم والی باتیں۔"

میں نے کہا "رب نواز! تم جتنا بے وقوف نظر آنے کی کوشش کر رہے ہو اتنا ہو نہیں۔ مجھے تو تم بڑے کھوچل دکھائی دیتے ہو۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے کہا "دلشاد بیگم اور امتیاز علی کے بارے میں تمام معلومات خود دلشاد بیگم نے تھانہ کنگن پور کے انچارج کو فراہم کی ہیں اور ملک دلدار کا حوالہ بھی اسی نے دیا ہے۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا پھر الجھے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا "کنگن پور کے تھانے کا بصیر پور کے تھانے سے کیا تعلق ہے؟"

حوالدار عید محمد اس موقع پر چپ نہ رہ سکا' خاصے کھلے ڈلے لہجے میں بولا "ان دونوں تھانوں کا آپس میں وہی تعلق ہے جو تمہاری ماں کا تمہارے باپ سے تھا۔ کیا اتنے قریبی تعلق کو بھی تم بھول بیٹھے ہو......"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے حوالدار کو مزید بدکلامی سے روک دیا ورنہ وہ تو خاصا خطرناک انداز اختیار کر چکا تھا۔ میں نے رب نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اس کو جانتے ہو؟“

اس کے ساتھ ہی میں نے مہمان اے ایس آئی مشکور علی کی طرف اشارہ کر دیا۔ مشکور علی اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ تفتیش کے دوران میں رب نواز نے متعدد بار مشکور علی کی طرف دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر ایک مرتبہ بھی شناسائی کی چمک مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ رب نواز کے لیے اجنبی تھا۔

میری توقع اور اندازے کے عین مطابق وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”نہیں جناب! میں نے آج سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔“ پھر اس نے سوال بھی کر ڈالا ”یہ صاحب کون ہیں؟“

”یہ اسسٹنٹ سب انسپکٹر مشکور علی ہے۔“ میں نے مہمان اے ایس آئی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا ”مشکور علی کنگن پور سے تمہارے پیچھے یہاں پہنچا ہے۔ یہی اس کیس کا تفتیشی افسر بھی ہے۔“

رب نواز کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ”مشکور علی کنگن بازیاب کیے بنا واپس نہیں جائے گا۔ اگر تم کسی بڑے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو شرافت سے وہ مسروقہ جڑاؤ کنگن ہمارے حوالے کر دو...... اور اگر تم نے یہ چوری کسی اور شخص کے ایما پر کی ہے تو بھی بتا دو۔ ممکن ہے‘ ایسی صورت میں کنگن کی بازیابی کے بعد میں تمہارے ساتھ رعایت برتوں۔“

تھوڑی دیر پہلے اس کے چہرے پر جو گھبراہٹ ظاہر ہوئی تھی‘ وہ جاتی رہی اور رب نواز قدرے مضبوط لہجے میں بولا ”تھانے دار صاحب! آپ خواہ مخواہ دباؤ ڈال کر مجھ سے کچھ قبول کرانا چاہتے ہیں۔ میں کئی بار آپ سے کہہ چکا ہوں کہ کنگن کی چوری میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”ایسے کیسے جانے دیں گے تمہیں سرکاری سانڈ۔“ حوالدار عید محمد نے اسے خوں خوار نظر سے گھورا ”ابھی تو ہم نے تمہاری کوئی ”خاطر تواضع“ بھی نہیں کی۔ یہ وہ جگہ ہے بچو! جہاں نہ کوئی اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ ہی یہاں سے کوئی اپنی مرضی سے جاتا ہے۔ ہم خود تمہیں پکڑ کر لائے ہیں‘ جب دل چاہے گا‘ خود ہی چھوڑیں گے۔ ہمیں بھی تو کچھ خدمت کا موقع دو۔ ہم مہمانوں کو روکھا سوکھا تھوڑا ہی جانے دیتے ہیں۔“

”کیا ارادہ ہے رب نواز؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا ”سچ بول کر صحیح سلامت واپس جانا

ہے یا تمہیں ڈرائنگ روم کی سیر کرائی جائے؟“

”میں نے تو اب تک سب سچ ہی بولا ہے جناب۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

حوالدار نے کہا ”ملک صاحب! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ ان پر اسپیشل فارمولا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ میں رب نواز کے مرض کو بخوبی سمجھ گیا ہوں۔ اگر آج کی رات یہ میرے زیر علاج رہا تو انشاء اللہ صبح تک شافی علاج کر دوں گا اس کا۔“

میں نے سوالیہ نظر سے رب نواز کو دیکھا۔ جب اس نے تعاون کے لیے زبان نہیں کھولی تو میں نے حوالدار عید محمد سے کہا ”عید محمد! رب نواز تمہارا پرانا گرائیں ہے۔ کسی زمانے میں یہ بھی چک گنڈا سنگھ میں رہتا تھا۔ ہوسکتا‘ یہ تمہاری ”زبان“ آسانی سے سمجھ جائے۔ میں آج کی رات اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ مجھے صبح تک نتائج چاہئیں..... مفید اور حوصلہ افزا نتائج۔ کیا سمجھے؟“

”بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ملک صاحب!“ حوالدار نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے مہمان اے ایس آئی سے کہا ”مشکور علی! تم نے اپنے تھانے کی تفتیش کے طور طریقے تو بہت دیکھے ہوں گے۔ آج کی رات میرے حوالدار کا اسٹائل بھی ملاحظہ کرو۔ یہ اپنے کام کا اسپیشلسٹ ہے۔ ممکن ہے‘ تمہیں سیکھنے کے لیے کوئی نئی بات مل جائے!“

”شکریہ ملک صاحب۔“ وہ ممنونیت سے بولا ”میں آپ کے اس تعاون کو عمر بھر یاد رکھوں گا۔ آپ نے واقعی سینیر ہونے کا حق ادا کر دیا ہے حالانکہ میرا تعلق آپ کے تھانے سے بھی نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”مشکور علی! تمہارا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے ہے‘ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ ہم سب ایک ہی برادری کے لوگ ہیں‘ تھانہ الگ الگ ہے تو کیا ہوا۔ جس طرح ایک باپ کی چار اولادیں چار مختلف گھروں میں رہتی ہیں لیکن وہ خاندان ایک ہی گنا جاتا ہے بالکل اسی طرح پولیس کا پورا محکمہ ایک خاندان ہے۔ تھانوں وغیرہ کی تقسیم تو انتظامی امور ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد تو مختلف نہیں ہو جاتا۔ ہمارا اول آخر فرض یہی ہے کہ قانون کی سربلندی قائم رکھیں اور جرائم کی بیخ کنی کے لیے اگر ہمیں اپنی جانیں بھی قربان کرنا پڑیں تو دریغ نہ کریں۔“

”آپ بہت عظیم ہیں ملک صاحب۔“ مشکور علی نے جذبات لہجے میں کہا۔

اس کے بعد بھی وہ تعریفی کلمات کی گردان کرتا رہا لیکن میں وہاں سے اٹھ کر اپنے سرکاری کوارٹر میں آ گیا۔

وہ رات میں نے سوچتے جاگتے ہوئے گزار دی۔ اس بے آرامی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی

تھی۔ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد میری آنکھ کھل جاتی۔ جب بھی میں بیدار ہوتا' رب نواز اور ملک دلدار کے بارے ہی میں سوچ رہا ہوتا تھا اور انہی کے بارے میں سوچتا سوچتا میں دوبارہ سو جاتا تھا۔ رب نواز پر میرا شک خاصا پختہ ہو گیا تھا۔ یہ تقریباً دس اور نوے والی صورت حال تھی۔ اس کے چوری نہ کرنے کے امکانات صرف دس فی صد تھے۔ یہ دس فی صد امکانات بھی اس وقت ختم ہو جاتے جب قلعہ تارا سنگھ سے اس بات کی تصدیق ہو جاتی کہ وہ وہاں پندرہ اگست کو نہیں گیا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس نے واقعی وہ طلائی جڑاؤ کنگن چرایا تھا تو آخر کیوں؟ امکانی جوابات میں...... سرفہرست یہ تھا کہ ملک دلدار کے حکم پر۔ یہاں پر نکتہ اٹھتا تھا کہ ملک دلدار کو دلشاد بیگم کا کنگن چرانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ملک دلدار' دلشاد بیگم کے شوہر امتیاز علی کا دوست تھا مگر امتیاز کی آخری عمر میں ان دونوں کے درمیان ناچاقی ہو گئی تھی اور دلدار نے امتیاز علی کے گھر شام کوٹ جانا چھوڑ دیا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے مہمان اے ایس آئی مشکور علی نے بتایا تھا۔ سوئی پھر وہیں آ کر اٹک جاتی تھی کہ ملک دلدار کو بیوہ دلشاد بیگم کے طلائی کنگن میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی ابھرتا تھا کہ کیا اس کنگن کا مستقبل قریب میں ہونے والے الیکشن سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب کبھی ''نہیں'' میں آتا تھا اور کبھی ''ہاں'' میں۔ میں نے اسی شش و پنج میں رات گزار دی۔

اگلی صبح بڑی فیصلہ کن تھی۔

جس طرح ایک دھوبی' کاسٹک سوڈا کی مدد سے انتہائی میلے کپڑے کو بھی اجلا بنا دیتا ہے بالکل اسی طرح گزشتہ رات حوالدار عید محمد نے رب نواز کی دھلائی کی تھی۔ ہماری مخصوص ''تفتیش'' نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے گویا عید محمد نے دھلائی کے بعد اس کی سکھائی بھی کی تھی اور فائنل ٹچ دینے کے لیے اس پر استری بھی پھیر دی تھی۔ میں جب اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا تو حوالدار مسکراہٹ بھرے چہرے کے ساتھ میرے پاس آ گیا اور پرجوش لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! ایک خوشی کی خبر ہے۔''

''کیا خبر ہے بھئی؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ''کوششیں'' رنگ لے آئی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے' خبر کا تعلق رب نواز سے ہے۔''

''بالکل جناب۔'' وہ تیز آواز میں بولا ''رات کو کمان کی طرح ٹیڑھا نظر آنے والا رب نواز

اب تیر کی طرح سیدھا ہو چکا ہے۔''

''کیا اس نے اقبالِ جرم کر لیا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا کہتا ہے وہ؟''

''اس نے کنگن کی چوری کا اقرار کر لیا ہے ملک صاحب۔'' حوالدار نے بتایا ''مگر وہ اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ اس نے وہ کنگن ملک دلدار کے حکم پر چوری کیا ہے۔''

میرے سینے سے اطمینان کی ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ میرے اندازے بالکل درست ثابت ہو رہے تھے۔ گویا بندہ پٹڑی پر آ گیا تھا۔ میں نے حوالدار سے پوچھا ''کیا تم نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی ''مہمان داری'' تو نہیں کر دی؟''

''ملک صاحب! بندہ اوپر سے جتنا ٹیڑھا نظر آتا تھا' اندر سے اتنا ہی بودا نکلا۔'' حوالدار نے بتایا ''ابھی میں نے دوسرا فارمولا ہی آزمایا تھا کہ اس کی زبان کھل گئی۔ کہنے لگا' اگر میں اس سے وعدہ کروں کہ ملک دلدار کے سامنے اس کا نام نہیں لوں گا تو وہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔ ایسا وعدہ کرنے میں ہمارا بھلا کیا جاتا ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تو نہ صرف اسے فوراً رہا کر دیا جائے گا بلکہ کسی بھی معاملے میں اس کا نام نہیں آئے گا۔''

چالاک مجرموں سے ان کا جرم اگلوانے کے لیے بعض اوقات ہمیں ایسے جھوٹے وعدے بھی کرنا پڑتے ہیں۔ میں نے حوالدار سے کہا ''رب نواز کو میرے پاس لے آؤ۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد رب نواز میرے سامنے موجود تھا۔ وہ رات والے رب نواز سے خاصا مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ حوالدار عید محمد نے مبالغہ آرائی کرتے ہوئے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ رب نواز کی ''خاطر تواضع'' اور ''مہمان داری'' میں کسی قسم کی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کی طبیعت خاصی ''سیر'' نظر آتی تھی۔

میں نے اس مرتبہ رب نواز کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور حوالدار سے کہا کہ وہ باہر چلا جائے۔ جب عید محمد وہاں سے رخصت ہو گیا تو میں رب نواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''تو تم نے بالآخر سیدھے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر ہی لیا رب نواز۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

وہ شکایتی لہجے میں بولا ''تھانے دار صاحب! آپ کے حوالدار نے میرے ساتھ بہت زیادتی

کی ہے۔"

"اگر تم شرافت کی زبان سمجھ جاتے تو پھر تمہیں یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا" جتنی نرمی سے میں نے تم سے پوچھ تاچھ کی تھی' ایسے تو کوئی ماں بھی اپنے بچے سے نہیں کرتی۔"

"بس جی! مجھ سے غلطی ہوگئی" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا" مجھے آپ کی بات مان لینا چاہیے تھی۔ اس ٹوٹ پھوٹ سے تو بچ جاتا۔"

میں نے کہا" شکر کرو' حوالدار نے صرف توڑنے پھوڑنے پر ہی اکتفا کرلیا ورنہ تمہیں معلوم نہیں وہ اپنی آئی پر آ جائے تو کتنا جلاّد ثابت ہوتا ہے۔"

"جناب! جب میں چک گنڈا سنگھ میں ہوتا تھا تو عید محمد اتنی سخت طبیعت کا تو نہیں ہوتا تھا۔" رب نواز نے مجروح لہجے میں کہا" میں نے رات اسے بار بار چک گنڈا سنگھ کا واسطہ بھی دیا اور ایک گاؤں کا ہونے کے ناتے اس سے خصوصی رعایت کی اپیل بھی کی مگر اس نے میری ایک نہیں سنی اور مار مار کر مجھے ادھ موا کر دیا...... وہ تو جناب میں نے زبان کھولنے کا فیصلہ کرلیا ورنہ ہوسکتا تھا' وہ مجھے ختم ہی کر دیتا۔"

مجھے حوالدار کی اس ادا نے متاثر کیا تھا کہ رب نواز کا چک گنڈا سنگھ سے تعلق ہونے کے باوجود بھی اس نے کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا تھا۔ عید محمد خود بھی مذکورہ چک کا رہنے والا تھا۔ اس عمل سے عید محمد کی فرض شناسی ظاہر ہوتی تھی ورنہ "ڈاک خانہ ملتے ہی" عموماً لوگوں کے رویے میں تبدیلی آ جاتی ہے۔

میں نے رب نواز کی شکایت آمیز فریاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا" تم نے بتایا ہے بلکہ اقرار کیا ہے ملک دلدار کے حکم پر تم نے دلشاد بیگم کا طلائی کنگن چرایا تھا جو کہ صندل کے ایک بکس میں رکھا گیا تھا اور تم نے سولہ اگست کو وہ بکس ملک دلدار کے حوالے کر دیا تھا؟"

"جناب! حقیقت یہی ہے مگر حوالدار صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ مجھے کسی مصیبت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا" وہ منت آمیز لہجے میں بولا" میں نے آپ کو سب کچھ سچ بتا دیا ہے' اب آپ لوگ بھی اپنا وعدہ پورا کریں اور مجھے یہاں سے جانے دیں۔"

"تم اس وقت تک' یہاں سے نہیں جاؤ گے جب تک میں وہ صندلی بکس برآمد نہیں کرلیتا" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا" ہاں' یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر تم اسی طرح قانون کے ساتھ تعاون کرتے رہے

تو کسی بڑی سزا سے بچ جاؤ گے۔"

وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا" کیا مجھے مزید تعاون بھی کرنا ہوگا؟"

"ابھی تم نے کیا ہی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"سب کچھ تو بتا دیا ہے" وہ روہانسا ہوگیا" اپنے جرم کا اقرار کرلیا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کروں؟"

میں نے کہا" رب نواز! سب سے پہلے تو تم یہ بتاؤ گے کہ ملک دلدار نے وہ کنگن تم سے کس مقصد کے لیے چوری کروایا ہے؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!"

"یہ تو جانتے ہو گے کہ اس وقت وہ کنگن کہاں ہوگا؟"

"نہیں جناب' مجھے نہیں پتا" وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔

"کمال ہے رب نواز!" میں نے اسے گھورا" تم ملک دلدار کے اتنا قریب ہو اور کنگن کی چوری کا سبب نہیں جانتے...... نہ ہی تمہیں یہ معلوم ہے کہ ملک دلدار نے وہ کنگن کہاں رکھا ہوگا؟"

وہ گلوگیر آواز میں بولا" اللہ پاک کی قسم' میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ جو حقیقت تھی وہ میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ اب آپ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔"

میں نے کہا" کنگن کا سراغ تو میں لگا ہی لوں گا رب نواز لیکن تمہاری جان اسی وقت چھوٹے گی جب تم ہمارے ساتھ تعاون جاری رکھو گے۔"

"اب آپ مجھ سے مزید کیا چاہتے ہیں؟"

"کنگن کی بازیابی کے بعد میں ملک دلدار کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچاؤں گا کیونکہ یہ واردات تم نے اسی کے اشارے پر کی ہے" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا" اور اس سلسلے میں تمہیں عدالت میں گواہی دینا ہوگی۔"

"آپ کا مطلب ہے' ملک دلدار کے خلاف گواہی؟"

"ہاں' میرا یہی مطلب ہے؟"

"وہ...... وہ تو میری اس حرکت پر مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے" رب نواز نے ہراساں لہجے میں کہا۔

میں نے کہا" اگر تم نے یہ "حرکت" نہ کی تو میں تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑوں گا۔ کم از کم

سات سال کے لیے تو تمہیں جیل میں سڑنا ہی ہوگا۔"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ مجھے چھوڑ دیں گے۔"

"تمہاری رہائی اور آزادی ہمارے ساتھ یعنی قانون کے ساتھ تعاون سے مشروط ہے" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"میں تو بری طرح پھنس گیا ہوں تھانے دار صاحب!" وہ روہانسی آواز میں بولا "ایک طرف کنواں ہے، دوسری جانب کھائی۔ سمجھ میں نہیں آتا کس سمت چھلانگ لگاؤں؟"

میں نے کہا "اُلو کی دم! جب برے کام کرو گے تو ظاہر ہے، بری ہی طرح پھنسو گے نا۔ رات کے آخری پہر، ایک بیش قیمت جڑاؤ طلائی کنگن چرانے کے "کارنامے" پر کیا تمہیں ٹرافی سے نوازا جائے گا؟"

وہ بے بسی سے نفی میں سر پٹخنے لگا۔ میں نے اسے دوبارہ حوالدار کے حوالے کیا اور کہا "عید محمد! رب نواز اب بیبا بندہ بن چکا ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔ مزید کسی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ اسے پرسکون فضا مہیا کرنا۔"

حوالدار نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گا۔

میں نے مہمان اے ایس آئی کو اپنے پاس بلا لیا۔ مشکور علی میرے کمرے میں آیا تو میں نے کہا "رب نواز نے کنگن کی چوری کا اقرار تو کرلیا ہے لیکن اب مسروقہ کنگن کو بازیاب کروانے کا مرحلہ باقی ہے۔ جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ملک دلدار اس وقت اپنی حویلی میں موجود نہیں ہے۔ آج اکیس اگست ہے۔ ملک کی واپسی کے امکانات کل شام تک ہیں۔ ہم......"

اے ایس آئی قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "یہ تو اچھا اور سنہری موقع ہے۔ ملک دل دار کی غیر موجودگی میں ہم اس کی حویلی کی زیادہ اچھی طرح تلاشی لے سکتے ہیں۔"

"کہہ تو تم بالکل ٹھیک ہی رہے ہو مشکور علی!" میں نے تائیدی انداز میں کہا "مگر میں یہ کارروائی سرچ وارنٹ حاصل کرنے کے بعد ڈالنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے ملک صاحب!" وہ جلدی سے بولا "ابھی تو صرف دس بجے ہیں۔ عدالت کا وقت ختم ہونے میں کئی گھنٹے باقی ہیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک دلدار کی حویلی کا سرچ وارنٹ نکلوایا جاسکتا ہے۔"

رب نواز کے اقبال جرم کے بعد کسی اہلکار کو قلعہ تارا سنگھ (دیپال پور) بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی

چنانچہ میں نے فوری ضروری کاغذی کارروائی کی اور مہمان اے ایس آئی کے ساتھ عدالت روانہ ہوگیا۔

جب میں واپس اپنے تھانے پہنچا تو دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ ہم نے اطمینان سے دوپہر کا کھانا کھایا پھر میں سرچ وارنٹ کے ساتھ ملک دلدار کی حویلی کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت میرے ہم راہ مہمان اے ایس آئی مشکور علی اور عید محمد کے علاوہ چار کانسٹیبل اور بھی تھے۔

حویلی پر ہمارا استقبال ملک دلدار کے چھوٹے بھائی ملک فیاض احمد نے کیا۔ فیاض کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی۔ وہ چوڑے شانوں والا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس نے تلوار مار کو مونچھیں رکھی ہوئی تھیں جو اس کے سرخ وسفید چہرے پر بڑی بھلی دکھائی دیتی تھیں۔

ملک فیاض نے ہمیں بیٹھک میں بٹھایا اور ہماری خاطر تواضع کے لیے سرگرم نظر آنے لگا۔ میں نے اس کی سرگرمی کو دیکھتے ہوئے کہا "ملک فیاض! کسی قسم کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اس وقت سرکاری ڈیوٹی پر ہوں اور ایک نہایت ہی ضروری کام سے ملک دلدار سے ملنے آیا ہوں۔"

میں نے دانستہ یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ مجھے ملک دلدار کے بیرونی دورے کی خبر تھی۔

ملک فیاض نے کہا "بھائی صاحب تو اس وقت گھر میں موجود نہیں ہیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے قریب کھڑے ایک ملازم صورت شخص کو کوئی اشارہ کیا۔ مذکورہ شخص چراغی جن کے مانند حویلی کے اندرونی حصے میں غائب ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ ملک فیاض نے ہمارے لیے کھانے پینے کی کوئی چیز منگوائی تھی۔

"میں نے کہا تھا نا، کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے" میں نے ملک فیاض کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "جناب تکلف کی کیا بات ہے۔ شدید گرمی کا موسم ہے۔ بس ٹھنڈا پانی منگوایا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد وہی ملازم ایک ٹرے اٹھائے حاضر ہوا۔ وہ خاصا پرتکلف "ٹھنڈا پانی" لے کر آیا تھا۔ ہم نے خوش رنگ ذائقے دار مشروب سے اپنی پیاس بجھائی۔ غالباً وہ بادام کا شربت تھا جس میں چند دیگر اشیا بھی ملائی گئی تھیں جو گرمی کے توڑ کے لیے اکسیر تھیں۔ مشروب کی سطح پر تخم بالنگا بھی تیر رہا تھا۔

میرے استفسار پر ملک فیاض نے بتایا "بھائی صاحب! اردگرد کے علاقوں کے دورے پر ہیں تھانے دار صاحب! آپ کو تو پتا ہی ہے، الیکشن سر پر آگئے ہیں۔ بس اسی سلسلے میں بھاگ دوڑ جاری

ہے۔"

"بڑے ملک صاحب کی واپسی کب تک ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"انشاء اللہ کل شام تک وہ واپس آ جائیں گے۔"

میں نے مہمان اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔ ملک فیاض نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا "خیریت تو ہے ناتھانے دار صاحب! آپ بھائی صاحب سے کس سلسلے میں ملنے آئے تھے؟"

"سلسلہ خاصا گمبھیر ہے فیاض احمد!" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے بتائیں، بات کیا ہے؟" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "ہو سکتا ہے میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

میں نے کہا "فیاض احمد! میں اس وقت تمہاری حویلی کی تلاشی لینے آیا ہوں جسے قانونی زبان میں خانہ تلاشی کہا جاتا ہے؟"

"ہماری حویلی کی تلاشی" اس نے بہ آواز بلند دہرایا پھر احتجاجی انداز میں بولا "تھانے دار صاحب! آپ ہماری حویلی کی تلاشی کیوں لینا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حویلی میں ایسی کون سی غیر قانونی چیز چھپا رکھی ہے؟"

"مال مسروقہ!" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مال مسروقہ!" وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا "یہ کیا آپ کہہ رہے ہیں جناب!"

یہ آپ کیا کہہ رہے جناب' اس نے اس طرح ادا کیا تھا جیسے کہہ رہا ہو' کیا آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

میں نے کہا "میں وہی کہہ رہا ہوں فیاض احمد جو تم نے سنا ہے۔"

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا "ہم نے اپنی حویلی میں کون سا مال مسروقہ چھپا رکھا ہے؟"

"ایک نہایت ہی قیمتی جڑاؤ طلائی کنگن!" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا "جو شام کوٹ کی رہنے والی ایک بیوہ مسماۃ دلشاد بیگم کی ملکیت ہے اور تمہارے بھائی صاحب بڑے ملک دلدار نے اسے اپنے قریبی ملازم رب نواز کی مدد سے چوری کروایا ہے۔ بات آئی سمجھ میں؟" پھر میں نے اسے تفصیلاً بتا دیا۔

ملک فیاض احمد کے چہرے پر الجھن کی لکیروں کا جال سا پھیل گیا۔ وہ بے یقینی کے سے انداز میں بولا "آپ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب!" پھر وہ زیر لب بڑبڑایا "بھائی صاحب...... شام کوٹ...... دلشاد بیگم...... طلائی کنگن...... رب نواز...... رب نواز" اس نے

چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا "رب نواز کل رات سے غائب ہے، کہیں وہ آپ کے قبضے میں تو نہیں ہے؟"

"تم بالکل ٹھیک جگہ پر پہنچے ہو" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "رب نواز اس وقت ہماری تحویل میں ہے۔ اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ اب ہمیں اس حویلی سے مسروقہ کنگن بازیاب کرنا ہے۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولا "اور اس مقصد کے لیے آپ ہماری حویلی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں؟"

"اگر تمہیں اپنی حویلی کی تلاشی دینا پسند نہیں ہے تو پھر خود ہی ہماری مطلوبہ چیز ہمارے حوالے کر دو" میں نے تیکھے لہجے میں کہا "ہم تلاشی کا خیال دل سے نکال دیں گے اور خاموشی سے طلائی کنگن لے کر یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"آپ بار بار طلائی کنگن کا تعلق اس حویلی سے جوڑ رہے ہیں" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا مطلوبہ مسروقہ کنگن اس حویلی میں نہیں ہے۔"

"یہ یقین تم کس بنا پر دلا رہے ہو؟" میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولا "آپ کے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ بھائی صاحب نے کسی دلشاد بیگم کا کنگن چوری کروا کے اس حویلی میں چھپا رکھا ہے؟"

"سب سے بڑا ثبوت رب نواز کا اقبالِ جرم ہے" میں نے متحمل لہجے میں کہا "پھر ابھی ہم خانہ تلاشی میں جب وہ مسروقہ کنگن برآمد کر لیں گے تو اس ثبوت کی توثیق ہو جائے گی یعنی رب نواز کے کے بیان پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔"

وہ برہمی سے بولا "آپ بار بار حویلی کی تلاشی کی بات کر رہے ہیں۔ کیا آپ اپنے ساتھ خانہ تلاشی کا وارنٹ لے کر آئے ہیں؟ اتنا قانون تو میں بھی جانتا ہوں کہ آپ عدالت کی اجازت کے بغیر ہماری حویلی کی تلاشی نہیں لے سکتے۔ پہلے آپ عدالت کا اجازت نامہ دکھائیں پھر آگے بات ہوگی۔"

"مجھے خوشی ہوئی ہے فیاض احمد کہ تم کم از کم اتنا قانون تو جانتے ہو" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں کچا کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے پہلے عدالت سے سرچ وارنٹ حاصل کیا ہے اس کے بعد ہی تمہاری حویلی کا رخ کیا ہے" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "اور یہ بات کان کھول کر سن لو میں حویلی کی تلاشی لیے بغیر یہاں سے

جاؤں گا نہیں۔ مجھے امید ہے' میں مال مسروقہ ضرور برآمد کرلوں گا۔"

وہ میرے لہجے کی سنگینی کو بھانپ گیا اور اس میں پوشیدہ دھمکی کو محسوس کرتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے' آپ بہ خوشی ہماری حویلی کی تلاشی لیں لیکن اس سے پہلے میں سرچ وارنٹ دیکھنا چاہوں گا۔"

"یہ تمہارا حق ہے فیاض احمد!" میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "تم قانوناً مجھ سے سرچ وارنٹ دیکھنے کا مطالبہ کرسکتے ہو۔ میں ابھی تمہیں خانہ تلاشی کا عدالتی اجازت نامہ دکھاتا ہوں۔"

پھر میں نے اپنی جیب میں سے سرچ وارنٹ نکال کر ملک فیاض احمد کے سامنے کردیا۔ وارنٹ کا جائزہ لینے کے بعد اس کی مدافعت دم توڑ گئی۔ کم زور سے لہجے میں بولا۔

"ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ آپ بہ خوشی حویلی کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔"

"میں بھی یہاں یہی کرنے آیا ہوں' ملک فیاض احمد!" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ پوری طرح میری بات کو سمجھ نہیں سکا یا ہوسکتا ہے' اس نے میری بات توجہ سے نہ سنی ہو' حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا "آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

"دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی" میں نے پرزور لہجے میں کہا۔

وہ برا سامنہ بنا کررہ گیا۔

اگلے ہی لمحے میرے ساتھ آئے ہوئے پولیس اہلکار ملک دلدار کی حویلی میں پھیل گئے۔ زنان خانے کو ہم نے ٹچ نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ حویلی کا کون کونا اور ہر کونے کا چپا چپا چھان مارا۔ ہمارا نشانہ خصوصاً ملک دلدار کے استعمال کی وہ جگہیں تھیں جہاں کنگن کو چھپائے جانے کے امکانات زیادہ تھے۔ چھوٹا ملک فیاض احمد ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ دو گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد آخر ہمیں کامیابی حاصل ہوگی۔

وہ حویلی کا ایک بیرونی کمرا تھا اور ان دنوں "الیکشن آفس" کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ ملک دلدار روزرات کو وہاں سیاسی میٹنگ کرتا تھا۔ مذکورہ کمرا ہال نما تھا جس میں دیواروں کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب ملک کی اپنی نشست تھی' وہ کرسی صدارت قسم کی ایک آرام دہ نشست تھی۔ ملک دلدار کی کرسی کے پیچھے ایک آہنی الماری تھی۔ اسی الماری کے ایک خفیہ خانے سے ہمیں ہمارا مطلوبہ صندلی بکس مل گیا تھا۔

میں نے جب صندل کی لکڑی سے تیار کردہ وہ "6x6x4" انچ کا بکس کھولا تو میری حیرت کی

انتہا نہ رہی۔ انتہائی بیش قیمت طلائی جڑاؤ کنگن میری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کررہا تھا۔ صندلی بکس پرکندہ نقش ونگار بھی ماہرانہ فن کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ کنگن میں جڑے ہوئے قیمتی پتھر جگمگا رہے تھے۔ وہاں پرموجود ہر شخص اس منظر سے حیرت زدہ تھا۔ ملک فیاض احمد کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ مسروقہ طلائی کنگن واقعی اس کی حویلی سے برآمد ہوسکتا تھا۔

میں نے کنگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فیاض احمد سے پوچھا "چھوٹے ملک صاحب! اب آپ کیا کہتے ہیں اس کنگن کی برآمدگی کے بارے میں؟"

"مجھے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آرہا" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "اب یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے فیاض احمد! چوری کا مال تمہاری حویلی سے برآمد ہوا ہے۔ ہماری تحویل میں ایک ایسا شخص موجود ہے جو اس کنگن کی چوری کا اقرار کرچکا ہے۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ کنگن کو چرانے کی واردات بڑے ملک دلدار کے ایما پر کی گئی ہے۔ اب تم خود اندازہ لگالو موجودہ صورت حال میں تمہارے بھائی صاحب کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں۔"

وہ ہونقوں کی طرح ایک ایک کی شکل دیکھ رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مہمان اے ایس آئی نے صندلی بکس کے کسی خفیہ خانے کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ کنگن کے نیچے اس خانے میں کوئی قیمتی دستاویز بھی موجود ہے۔ میں نے سب کے سامنے خفیہ خانے کی تلاشی لینا مناسب نہ سمجھا اور بکس کو اپنے قبضے میں لیتے ہوئے فیاض احمد سے کہا۔

"چھوٹے ملک جی! جب آپ کے بھائی صاحب سیاسی دورے سے واپس آئیں تو انہیں سیدھا میرے پاس تھانے بھیج دیں۔ اگر انہوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا تو میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

وہ "بھرپور تعاون" کا مطلب یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ میں نے ان سے کوئی موٹی رقم توڑنے کے موڈ میں ہوں۔ وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔

"آپ فکر ہی نہ کریں تھانے دار صاحب! ہم آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہیں۔ میں بھائی صاحب کو ساری بات اچھی طرح سمجھادوں گا۔"

میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "وہ تمہاری بات سمجھ جائیں تو ان کے حق میں بہتر ہی رہے گا" میں نے یہ جملہ ذومعنی انداز میں ادا کیا تھا تاکہ اس کی غلط فہمی برقرار رہے اور وہ کسی قسم کی ہوشیاری یا

چالا کی دکھانے کی کوشش نہ کرے۔

چھوٹا ملک فیاض احمد حالات کی سنگینی کو محسوس کر چکا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی ملک دلدار واپس حویلی پہنچے گا' وہ اسے اپنے ساتھ لے کر سیدھا میرے پاس تھانے آ جائے گا۔

مگر میں اس کے وعدے پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا عقل مندی کا یہی تقاضا تھا کہ میں اپنے طور پر ملک دلدار کو چھاپنے کا کوئی تسلی بخش بندوبست بھی کروں۔ اس کے لیے میرے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پا چکا تھا۔

ہم جب واپس تھانے پہنچے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ میں نے فوری طور پر چار سادہ لباس اہل کاروں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ ملک دلدار کی حویلی کے آس پاس موجود رہیں۔ وہ جیسے ہی حویلی میں داخل ہو' فوراً مجھے اطلاع دی جائے۔ وہ چاروں میرے بھروسے کے آدمی تھے' نہایت ہی موقع شناس اور ہوشیار قسم کے۔ نگرانی کے کاموں میں انہیں خاص مہارت حاصل تھی۔ میں پہلے بھی ان کی صلاحیتوں کو آزما چکا تھا اور میں نے انہیں اے ون پایا تھا۔

رب نواز میرے تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ میں نے اسے کنگن کی برآمدی کے بارے میں بتانا ضروری نہ سمجھا اور سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔ حوالدار عید محمد کو میں نے خصوصی ہدایت کر دی تھی کہ فی الحال رب نواز کو حویلی والی کارروائی سے بے خبر ہی رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔

مہمان اے ایس آئی مشکور علی میرے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ میں نے اپنے کمرے پر موجود کانسٹیبل کو تاکید کر دی تھی کہ جب تک میں نہ کہوں' کسی کو اندر نہ بھیجا جائے۔ دراصل میں پورے اطمینان سے صندلی بکس کے خفیہ خانے کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ اے ایس آئی اس کیس کا تفصیلی افسر تھا اس لیے اس کی موجودگی میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے مشکور علی کے سامنے صندلی بکس کو کھولا۔ طلائی کنگن کی چکا چوند حیران کر دینے والی تھی۔ کسی سنار نے بڑی محنت اور کاری گری سے اسے تیار کیا تھا۔ میں کنگن کو ہاتھ میں لے کر اس میں جڑے ہوئے قیمتی جواہرات کا جائزہ لینے لگا اور اسی جائزے کے دوران میں اچانک مجھے چونک جانا پڑا۔ میری نگاہ جونہی کنگن کی اندرونی سطح پر پڑی' مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

کنگن کی اندرونی جانب ایک مختصر سی تحریر کندہ کی گئی تھی...... ''میری جان کے لیے دلدار!''

اس تحریر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کنگن دلدار نامی کسی شخص نے اپنی کسی محبوبہ کو تحفتاً دیا تھا۔ ایسا تحفہ جو یادگار کی حیثیت رکھتا تھا۔ مشکور علی بھی وہ تحریر پڑھ چکا تھا۔ اس نے تیز آواز میں مجھے مخاطب

کیا۔

''یہ کیا چکر ہے ملک صاحب!''

''جو بھی چکر ہے تمہارے سامنے ہی ہے مشکور علی!'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا'' میں تو دلدار نامی صرف ایک ہی شخص کو جانتا ہوں اور وہ ہے ملک دلدار آف بصیر پور یہ مسروقہ کنگن بہ قول تمہارے شام کوٹ کی وسنیک بیوہ دلشاد بیگم کی ملکیت ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں' میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عین ممکن ہے' یہ کنگن کبھی ملک دلدار نے دلشاد بیگم کو تحفے میں دیا ہو۔ تم بتا ہی چکے ہو' ملک دلدار دلشاد بیگم کے مرحوم شوہر کا دوست رہا ہے۔''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا'' آپ کی بات میں وزن ہے لیکن میں کسی اور زاویے سے بھی سوچ رہا ہوں۔''

''مثلاً کون سے زاویے سے؟''

وہ بولا'' میری جان کے لیے' دلدار...... کے الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ ملک دلدار کے دلشاد بیگم سے کسی دوسری ہی نوعیت کے مراسم تھے۔ آپ میرا اشارہ سمجھ رہے ہیں نا!''

''تمہارا اشارہ بڑا واضح ہے مشکور علی!'' میں نے کہا اور پھر پوچھا'' کیا دلشاد بیگم نے اس سلسلے میں کوئی خاص بات تمہیں بتائی تھی؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا'' اس نے ایسی کوئی بات مجھے نہیں بتائی تھی'' پھر قدرے بیزار سے لہجے میں بولا'' خیر چھوڑیں اس بات کو۔ میرا خیال ہے' ہمیں صندلی بکس کا خفیہ خانہ کھول کر دیکھنا چاہیے۔''

مجھے اے ایس آئی کا یہ رویہ عجیب سا لگا۔ کنگن اور دلشاد بیگم کے ذکر سے پہلو تہی کرتے ہوئے وہ اچانک خفیہ خانے کی جانب مڑ گیا تھا۔ مشکور علی کے اس عمل پر میں نے کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر نہیں کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے بکس کا خفیہ خانہ کھول لیا۔

اے ایس آئی نے کہا'' دلشاد بیگم نے بتایا تھا کہ خفیہ خانے میں کوئی اہم دستاویز رکھی ہوئی ہے۔''

''ہاں بھئی' یہاں کچھ رکھا ہوا نظر تو آ رہا ہے'' میں نے خفیہ خانے میں نگاہ ڈالتے ہوئے کہا پھر تہ شدہ چند کاغذ باہر نکال لیے۔

اے ایس آئی حیرت آمیز لہجے میں بولا'' یہ کیا ہے ملک صاحب؟''

''ابھی کھول کر دیکھتے ہیں'' میں نے کہا اور تہ شدہ کاغذات کو کھولنا شروع کر دیا۔

وہ عام سائز کے چار کاغذ تھے جن پر رقم تحریر سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خالصتاً عشقیہ خطوط تھے۔

ہم دونوں نے باری باری ان خطوط کو پڑھا اور صورت حال ہم پر واضح ہو گئی۔ وہ چاروں کے چاروں خطوط ملک دلدار کی جانب سے دلشاد بیگم کو لکھے گئے تھے جن میں ملک دلدار نے اپنی محبت کا کھلم کھلا اظہار کیا تھا۔ تحریر کے مضمون سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ وہ دونوں عشق میں خاصی دور تک سفر کر چکے تھے۔ ملک دلدار کی بے تابی ایک ایک لفظ سے عیاں تھی۔

مشکور علی نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔''

''پھر تم نے معاملے کی تہ میں کیا دیکھا ہے'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا ''اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا ہوں تو کسی زمانے میں ملک دلدار اور دلشاد بیگم میں خصوصی مراسم رہے ہوں گے۔ ممکن ہے اب بھی کسی حد تک باقی ہوں لیکن زیادہ امکان یہی نظر آ رہا ہے کہ فی الوقت ان میں کشیدگی چل رہی ہے۔ ملک دلدار نے یہ طلائی کنگن اپنی محبت کی یادگار کے طور پر دلشاد بیگم کو دیا ہوگا۔ یہ چاروں خط بھی ان دونوں کے تعلقات کو ظاہر کرتے ہیں۔''

''یہاں تک تو بات واضح ہے'' میں نے کہا ''لیکن تم نے اس معاملے کی تہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میرا مطلب ہے...... کنگن کی چوری کے بارے میں۔''

وہ پرزور انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''میں اسی طرف آ رہا ہوں، جناب! اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ ملک دلدار نے اپنے ملازم خاص رب نواز کے ذریعے یہ کنگن چوری کروایا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک یہ بھی جانتا تھا کہ دلشاد بیگم نے اس کے خطوط کہاں رکھے ہوں گے۔ اس نے کنگن اور خطوط حاصل کرنے کے لیے ہی یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا ہوگا۔ وہ اپنے خلاف استعمال ہونے والی ہر چیز کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہو۔ ''خلاف استعمال'' سے آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں'' میں نے اثبات میں سر ہلایا ''تمہارا اشارہ مستقبل قریب میں ہونے والے الیکشن کی طرف ہے نا!''

وہ جلدی سے بولا ''جی ہاں، جی ہاں۔ میں یہی کہنا چاہ رہا ہوں۔ ملک دلدار بڑے طمطراق سے الیکشن میں حصہ لے رہا ہے۔ اسے اپنی نیک نامی کی بڑی فکر ہوگی۔ اپنے کردار کو شفاف ثابت کرنے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کر رہا ہوگا جیسا کہ عام طور پر امیدوار کرتے ہیں۔ اس نازک موقع پر وہ لمحہ بہ

لمحہ پل صراط سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ مخالف امیدوار کسی کی ذرا سی کوتاہی کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے تاکہ اپنے حریف کی ساکھ کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکے۔ اس موقع پر کوئی معمولی سا اسکینڈل یا ماضی کے حوالے سے کوئی ناگوار واقعہ امیدوار کو بڑی سے بڑی مصیبت میں ڈال سکتا ہے''

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''اگر اس نازک موقع پر ملک دلدار اور دلشاد بیگم کا عشقیہ معاملہ منظر عام پر آ جائے تو ملک کو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مخالف پارٹی اس معاملے کو اس قدر اچھالے گی کہ ملک کے لیے جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی۔ انہی حقائق کی روشنی میں ملک نے فیصلہ کیا ہوگا کہ دلشاد بیگم کے پاس اپنی عمر رفتہ کی محبت کے ثبوت کو پہلی فرصت میں حاصل کر لیا جائے تاکہ کسی بھی امکانی خطرے سے بچا جا سکے۔''

اتنا کہہ کر مشکور علی خاموش ہو گیا۔ اس کا تجزیہ حالات و واقعات کے عین مطابق تھا۔ سیاست داں الیکشن کے دنوں میں اسی قسم کی سیاسی چالیں چلتے رہتے ہیں۔ اپنی ساکھ کو مضبوط سے مضبوط تر اور حریف کی ساکھ کو کمزور سے کمزور ترین بنانے کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرتے ہیں۔ دولت، طاقت، بدمعاشی اور مکاری کا بے دریغ استعمال اکثر سیاست دانوں کا طرۂ امتیاز ہے۔''

میں نے مہمان اے ایس آئی سے پوچھا ''مشکور علی! اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''ملک صاحب! سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ ملک دل دار جیسے سیاست دانوں کو سزا ضرور ملنی چاہیے'' مشکور علی نے کہا ''ایسے لوگ الیکشن جیت کر اور زیادہ طاقت ور ہو جاتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب یہ ہے کہ کنگن کی چوری والے معاملے کو منظر عام پر لایا جائے؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

وہ بولا ''جناب! یہ معاملہ اب کیسے چھپا رہ سکتا ہے۔ کنگن چور رب نواز اس وقت آپ کی تحویل میں ہے۔ اس نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے۔ اسی کی فراہم کردہ معلومات پر ہم نے ملک دل دار کی حویلی کی تلاشی لی ہے جہاں سے مال مسروقہ برآمد ہوا ہے۔ ہر چیز باقاعدہ ریکارڈ پر درج ہوتی جا رہی ہے۔ عدالت نے ملک دلدار کی خانہ تلاشی کا اجازت نامہ جاری کیا ہے۔ آپ رب نواز اور ملک دل دار کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے پابند ہیں...... اور جب ان دونوں کے خلاف قانونی کارروائی ہوگی تو یقینی بات ہے یہ معاملہ علاقے کے لوگوں سے چھپا نہیں رہے گا۔ ملک دل دار پر تو لگتا ہے بہت برا وقت آن پڑا ہے۔ اس نے بہت زیادہ سیانا بننے کی کوشش کی تھی۔ اب یہی کوشش اسے لے ڈوبے گی۔''

''مجھے بھی ایسا ہی نظر آ رہا ہے مشکور علی!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''بہر حال ہمیں کوئی نیا قدم اٹھانے سے پہلے ملک دلدار کی واپسی کا انتظار تو کرنا ہی ہوگا۔''

مشکور علی نے کہا ''اس کی واپسی میں اب کون سی دیر رہ گئی ہے جناب! آج اکیس تاریخ تو گزر رہی گئی ہے۔ وہ بائیس اگست یعنی کل شام واپس آ جائے گا۔''

میں نے کہا ''تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''اگر آپ اجازت دیں تو میں صبح پہلی گاڑی سے کنگن پور چلا جاتا ہوں۔'' مشکور علی نے کہا ''آپ جانتے ہیں جناب' یہ میرا پہلا کیس ہے۔ یوں سمجھ لیں' بطور تفتیشی افسر یہ میری پہلی کامیابی ہوگی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت بہت زیادہ خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ میری اس کامیاب خوشی میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں پہلی فرصت میں اپنے تھانہ انچارج رانا جمشید صاحب کو یہ خوشخبری سناؤں انشاءاللہ میں کل شام سے پہلے ہی واپس بصیر پور آ جاؤں گا۔''

مشکور علی کی خواہش پوری کرنے میں مجھے کوئی حرج نظر نہ آیا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا ''کوشش کرنا کہ کل سہ پہر تک واپس آ جاؤ'' پھر میں نے میز پر رکھے ہوئے جیولری بکس کی جانب اشارہ کیا ''یہ مال مسروقہ فی الحال میرے پاس امانت کے طور پر رہے گا۔ ضروری قانونی کارروائی کے بعد ہی یہ تھانہ کنگن پور کے حوالے کیا جائے گا۔''

''جی ملک صاحب' آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں'' وہ تائیدی لہجے میں بولا ''آپ مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار پولیس افسر ہیں۔ آپ جو مناسب سمجھیں' وہ کریں۔ میں رانا صاحب کو اب تک کی کارروائی کی رپورٹ دے دوں گا۔''

دوسری صبح یعنی بائیس اگست کو جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ اے ایس آئی مشکور علی کنگن پور جا چکا تھا۔ میں روزمرہ کے کاموں کو نمٹانے لگا۔ طلائی کنگن والے منقش صندلی بکس کو میں نے کل رات ہی ایک انتہائی محفوظ مقام پر رکھ دیا تھا۔ یہ چھوٹا سا بکس اپنے اندر اتنا بڑا طوفان رکھتا تھا جو اگر منظر عام پر آ جاتا تو ملک دلدار کی ایسی کم تیسی کر سکتا تھا۔ عام حالات میں اس بکس اور اس میں پائی جانے والی اشیا کی وہ اہمیت نہیں تھی جو الیکشن کے اس نازک ترین موقع پر تھی۔ یہ ایک ایسی چنگاری تھی جو ملک دلدار کے سیاسی نشیمن کو پلک جھپکتے میں جلا کر خاکستر کر سکتی تھی۔ اس سلسلے میں ملک کی کوئی وضاحت' کوئی تاویل کام آنے والی نہیں تھی۔ مخالف پارٹی بھی اس کی ٹکر کی تھی اور ملک کی معمولی سے معمولی کمزوری کو حاصل کرنے کے لیے ہر لحظہ کوشاں تھی۔

آنے والے حالات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ ملک دلدار کا بھٹا بیٹھنے والا ہے' اس کا باجا بجنے والا ہے اور اس کا جلوس نکلنے والا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی ایشو نہیں تھا۔ ملک دلدار نے دلشاد بیگم کا طلائی کنگن چوری کروا کے اپنی تباہی و بربادی کے پروانے پر دستخط کر دیے تھے۔

دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے مجھے ذرا فرصت ہوئی تو میں نے حوالات میں بند رب نواز کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ حوالات میں گزاری ہوئی دو راتوں نے اس کی رعنائی کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں اس وقت کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ جھجکتے ہوئے سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔

''اب تو تمہیں کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس رات کے بعد سے تمہیں کسی نے نہیں مارا نا!''

''مارا تو کسی نے نہیں جناب۔'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا ''مگر میں پل پل اپنے وجود کے اندر مر رہا ہوں۔ آپ مجھے جلدی سے باہر نکال دیں تاکہ میں بصیر پور چھوڑ کر کہیں دور نکل جاؤں۔''

''تم بصیر پور کیوں چھوڑنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جناب' آپ نے تو مجھے نہیں بتایا لیکن میں نے اڑتی اڑتی سن لی ہے۔'' وہ قدرے خوف زدہ لہجے میں بولا ''آپ نے ملک دلدار کی حویلی میں چھاپا مار کر مسروقہ جیولری بکس برآمد کر لیا ہے اور ملک صاحب کو بھی آپ چھوڑیں گے نہیں۔ میں جب ان کے خلاف گواہی دوں گا تو وہ میرے کھلے دشمن بن جائیں گے پھر مجھے جان بچانا مشکل ہو جائیگی۔ میں اسی لیے یہاں سے بہت دور چلے جانا چاہتا ہوں۔''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تمہیں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے رب نواز۔ تم نے اب تک قانون سے تعاون کیا ہے۔ اگر آئندہ بھی تعاون کا ایسا ہی مظاہرہ کرتے رہے تو میں تمہارے تحفظ کا ضرور بندوبست کروں گا۔ ملک دلدار تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گا۔ اب تو وہ ایسی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے کہ اسے اپنا آپ بچانا مشکل ہو جائے گا۔''

''آپ کی باتوں سے مجھے تھوڑا حوصلہ مل رہا ہے۔'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا ''ورنہ ملک صاحب کے قہر سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔''

میں نے اسے کریدنے کی خاطر پوچھا ''رب نواز! سچ سچ بتانا' تم نے یہ چوری ملک دلدار کے کہنے پر کی تھی نا؟''

''رب دی سوں (قسم) ملک صاحب!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ''میں نے آپ

سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ ملک دلدار نے جو حکم دیا' میں نے اس کے مطابق عمل کیا تھا۔''

میں نے پوچھا ''کیا تم نے راستے میں کنگن والے بکس کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی؟''

''نہ جناب! میں ایسی غلطی کیسے کر سکتا تھا۔'' وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ''ملک صاحب نے خاص طور پر مجھے تاکید کی تھی کہ بکس کو کھول کر دیکھنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔''

''اس کا مطلب ہے' تم نہیں جانتے کہ اس منقش بکس کے اندر کیا کیا موجود تھا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''طلائی کنگن کے بارے میں تو آپ ہی نے مجھے بتایا تھا۔ میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ بکس کے اندر کوئی قیمتی چیز ہوگی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا ''تھانے دار صاحب! کیا کنگن کے علاوہ بھی بکس میں کچھ اور تھا؟''

''ہاں' بہت کچھ تھا۔'' میں نے مبہم سا جواب دیا پھر موضوع کو بدلتے ہوئے پوچھا ''کیا تم عدالت میں بڑے ملک کے خلاف گواہی دینے کے لیے تیار ہو؟''

''اب میں آپ کی پناہ میں ہوں جناب۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا ''ملک دلدار تو ویسے بھی اس واقعے کے بعد میری جان کا دشمن ہو جائے گا۔ آپ جو کہیں گے' میں ضرور کروں گا پھر ملک دلدار کے خلاف گواہی دینا تو کوئی غلط بات نہیں ہوگی۔ اس نے مجھ سے بکس چوری کروایا ہے' یہ ایک حقیقت ہے۔ جب انسان کے سامنے دو راستے ہوں۔ ایک سچائی کا اور دوسرا برائی کا اور ساتھ ہی موت اس کے سر پر کھڑی ہو تو اسے ہمیشہ سچائی کا راستہ اپنانا چاہیے تاکہ اگر مقدر سے وہ زندہ بچ جائے تو اسے اپنے کیے پر کوئی پشیمانی نہ ہو۔''

''یہ تو تم نے بڑی دانش مندانہ بات کی ہے رب نواز۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''بس جی' میں تو ان پڑھ دیہاتی قسم کا بندہ ہوں۔'' وہ انکسار سے بولا ''مجھ میں دانش مندی کہاں سے آئے گی۔ ایک بات ذہن میں آئی تھی وہ میں نے زبان سے کہہ دی۔''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک کانسٹیبل پھولی ہوئی سانس کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں اطلاع دی ''ملک صاحب! ملک دلدار تھانے کی طرف آ رہا ہے۔''

''ملک صاحب!'' میں نے چونکتے ہوئے دہرایا ''کیا وہ شام سے پہلے ہی بصیر پور پہنچ گیا ہے؟''

کانسٹیبل نے بتایا ''جناب! ملک دلدار اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ چند افراد بھی ہیں۔'' ایک

لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''وہ بڑے غصے میں نظر آتا ہے ملک صاحب!''

''اوئے بزدل کی اولاد۔'' میں نے کانسٹیبل کو ڈانٹ پلائی ''ملک دلدار کوئی قیامت تو نہیں جو تو اس قدر گھبرایا ہوا ہے۔ آنے دو اس تیس مار خان کو۔ میں دیکھ لوں گا' وہ کتنا بڑا پھنے خان ہے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ وہ خود ہی اس طرف آ رہا ہے۔ مجھے حویلی تک جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے ملک دلدار کی نگرانی پر چند سادہ لباس پولیس اہلکار مامور کر رکھے تھے۔ پتا نہیں ان کو کیا ہوا تھا کہ اب تک کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہی سوال جب میں نے اطلاع لانے والے کانسٹیبل سے کیا تو اس نے بتایا ''ملک صاحب! وہ سب بھی ملک دلدار کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ دراصل ملک دلدار نے یہ اقدام اتنی تیزی سے کیا ہے کہ ان کو پیشگی اطلاع دینے کی مہلت نہیں مل سکی۔''

اس دوران میں' میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کی رب نواز کی حالت خاصی غیر ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی اور آنکھوں میں خوف و ہراس کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں نے رب نواز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا امتحان آن پہنچا ہے رب نواز۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا تھانے دار صاحب؟'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

میں نے کہا ''تمہیں سچ کی صدا بلند کرنا ہوگی۔'' میں نے کھوجنے والی نگاہ سے اس کا جائزہ لیا پھر سمجھانے والے انداز میں کہا ''رب نواز! تم جو بھی کہو گے' سچ کہو گے اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہو گے۔ ایک طرح سے تم یہ سمجھ لو کہ عدالت کے روبرو کھڑے ہو اور جج کے سامنے تمہاری گواہی ہو رہی ہے۔''

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ملک دلدار دندناتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بھائی ملک فیاض احمد بھی تھا جس کی موجودگی میں' میں نے حویلی کی تلاشی لے کر منقش جیولری بکس برآمد کیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے چند حواری بھی اس کے ساتھ تھے۔ برآمدے میں موجود پولیس اہلکاروں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی تاہم وہ ہر رکاوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے آندھی طوفان کے مانند اندر گھس آئے تھے۔

ملک دلدار کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس کی کاٹھی خاصی مضبوط دکھائی دیتی تھی۔ تاہم خط و خال سے وہ ایک غصیلا' منہ پھٹ اور لڑاکا نظر آتا تھا۔ ان ''صفات'' کا اس نے فوراً عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ترش و تلخ لہجے

میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے بصیر پور میں یہ کیا اندھیر مچا رکھی ہے؟''

مجھے پہلے اس کی آمد اور ازاں بعد اس کا انداز تخاطب سخت ناگوار گزرا تاہم موقع کی مناسبت سے میں نے ضبط کا مظاہرہ کیا اور معتدل لہجے میں کہا ''ملک صاحب! میں نے کیا اندھیر مچانا ہے۔ خیر تو ہے' آپ بڑے طیش میں نظر آ رہے ہیں؟''

وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ''کہاں ہے وہ تخم بد رب نواز جس نے میرے خلاف یہ سازش بُنی ہے۔ میں اس نمک حرام کی بوٹی بوٹی کر کے چیل کووؤں کو کھلاؤں گا۔''

پھر اس کی نظر ایک جانب کھڑے رب نواز پر پڑ گئی۔ ملک دلدار کی آمد کی خبر سن کر وہ کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا تھا۔ ملک دلدار نے قہر آلود نظر سے رب نواز کو دیکھا پھر اس پر جھپٹنے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کوشش میں اسے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میرے اشارے پر اے ایس آئی خورشید خان نے اسے شانوں سے پکڑ کر روک دیا تھا۔ ملک دلدار کے ساتھ ہی میرے تھانے کے عملے کے چند افراد بھی اندر آ گئے تھے۔ اب لحاظ بہت ہو چکا تھا۔ میں ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔

میں نے سخت لہجے میں ملک دلدار کو مخاطب کیا ''ملک دلدار! یہ تھانہ ہے' تمہاری حویلی نہیں جہاں تم من مانی کر سکو۔ یاد رکھو' اگر اب تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو میں طاقت استعمال کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ تم اس وقت کس گرداب میں گھر چکے ہو۔ تمہارے خلاف پہلے ہی میں بہت مال مسالا جمع کر چکا ہوں۔''

''کیا کیا میں نے؟'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

''تم نے اپنے ایک ملازم رب نواز سے چوری جیسا سنگین جرم کروایا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے۔'' وہ حلق کے بل چیخا۔

''تمہارا ملازم اقرار جرم کر چکا ہے ملک دلدار۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''تمہارے انکار سے صورتِ حالات مزید تمہارے خلاف ہو جائے گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ شرافت سے اپنا جرم قبول کر لو۔''

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' وہ دہاڑا ''یہ سراسر مجھ پر الزام ہے۔''

''تم کیا کہتے ہو رب نواز؟'' میں نے رب نواز سے پوچھا۔

وہ اپنے لہجے میں ہمت بھر کر بولا ''سچ یہ ہے جناب کہ ملک صاحب نے ہی مجھ سے کنگن کی چوری کروائی ہے۔ میں انہی کے حکم پر شام کوٹ گیا تھا پھر دوسرے روز میں نے کنگن ان کے حوالے کر دیا تھا' میرا مطلب ہے میں نے کنگن والا بکس ان کو دیا تھا۔ اب یہ مکر رہے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تم بکواس کرتے ہو......'' ملک دلدار نے رب نواز کو ایک ناقابل اشاعت گالی سے نوازا ''میں تمہارا لہو پی جاؤں گا۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ رب نواز پر جھپٹا مگر اس مرتبہ حوالدار عید محمد اس کے راستے میں آ گیا۔ میں نے عید محمد سے کہا کہ وہ رب نواز کو وہاں سے لے جائے۔ عید محمد نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی اور رب نواز کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں ملک دلدار کی طرف متوجہ ہو گیا ''ملک دلدار! میں تم سے یہی کہوں گا کہ تم قدم قدم پر اپنی مشکلات میں اضافہ کر رہے ہو۔'' پھر میں نے اسے کنگن کی چوری' امتیاز علی سے اس کی دوستی' ناچاقی اور بعد ازاں لاتعلقی' دلشاد بیگم سے اس کے خفیہ مراسم' معاملات عشق و محبت اور چار عشقیہ خطوط کی برآمدی کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور کہا ''تمہارے لیے اس صورت حال میں یہی بہتر ہو گا کہ اپنے سارے جرائم کا اقرار کر لو ورنہ بری طرح پچھتاؤ گے۔''

''یہ سب جھوٹ ہے' بکواس ہے بہتان اور الزام ہے۔'' وہ تھرتھراتے لہجے میں بولا ''مجھے تو یہی لگتا ہے کہ رب نواز میری مخالف پارٹی کے ہاتھوں بک گیا ہے اور یہ سب کچھ میری ساکھ خراب کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے لیکن میں ثابت کر دوں گا کہ سچ اور جھوٹ میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا تم دلشاد بیگم سے اپنے تعلقات سے انکار کرتے ہو؟''

''میں کسی دلشاد بیگم کو نہیں جانتا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے کہا ''مگر وہ تو تمہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ وہ تمہیں اپنے شوہر کا سابق دوست بتاتی ہے پھر کنگن پر کندہ تحریر......عشقیہ خطوط......وغیرہ کو تم کس کھاتے میں فٹ کرو گے۔''

وہ غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا ''میں سمجھ گیا' یہ بشیر جٹ کی شرارت ہو گی۔''

''کون بشیر جٹ؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا سیاسی حریف۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا ''اسی نے چند لوگوں کو خرید کر میرے خلاف یہ سازش کی ہو گی ورنہ دلشاد بیگم کا مجھ سے کیا واسطہ۔''

''اگر تم دلشاد بیگم سے تعلق سے انکار کرو بھی تو رب نواز کی گواہی کو کیسے جھٹلاؤ گے۔'' میں نے

تیکھے لہجے میں کہا ”یہ تو تمہارا پرانا اور بااعتماد ملازم ہے نا؟“

وہ بولتا بعد میں تھا اور لڑائی پہلے کرتا تھا۔ اس کے رویے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک غصہ ور، انا پرست اور جھگڑالو شخص تھا۔ میرے سوال پر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ پہلے اس نے بشیر جٹ کو مغلظات میں تولا پھر دلشاد بیگم اور رب نواز کو اس نے ناپاک جانور گردانتے ہوئے بے ہودگی سے کام لیا۔ آخر میں بڑے دھڑلے سے بولا ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ آپ کو چاہیے کہ سازشی عناصر کو گرفتار کر کے عبرت ناک سزائیں دیں لیکن آپ تو الٹا مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔“

”میں الٹا نہیں بلکہ تم پر بالکل سیدھا اور سچا الزام لگا رہا ہوں۔“ میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا ”تمہارے ملازم رب نواز کی گواہی ہی تمہارے لیے کافی ہے پھر مال مسروقہ تمہارے چھوٹے بھائی کی موجودگی میں تمہاری حویلی سے برآمد کیا گیا ہے۔ تمہیں گرفتار کرنے کے لیے میرے پاس کافی مواد ہے ملک دلدار!“

”تم مجھے گرفتار کرو گے؟“ وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔

”کیوں، تم میں کوئی سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو تمہاری گرفتاری کرتے ہوئے مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔“ میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا ”یا تم کسی ریاست کے راجا، مہاراجا ہو؟“

وہ میرے طرز تخاطب پر سلگ اٹھا۔ بھڑک کر بولا ”شاید تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں تھانے دار۔ میرا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا۔“

میں نے کہا ”اور میرا پکڑا ہوا صرف پناہ مانگتا ہے۔“

”میں تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔“ وہ پرغرور لہجے میں بولا ”بس ایک دن ٹھہر جاؤ۔“

”یہاں سے جاؤ گے تو کچھ کرو گے نا؟“

”تم روکو گے مجھے؟“

”ہاں، میں روکوں گا تمہیں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”جس طرح تمہارے نمک خوار رب نواز کو روکا ہے...... حوالات کی سلاخوں کے پیچھے۔“

میرے اس جملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ چیخ کر بولا ”وہ خبیث شخص میرا نمک خوار نہیں بلکہ نمک حرام ہے۔“ ایک لمحے کو رک کر وہ کف اڑاتے ہوئے دہاڑا ”ملک صفدر حیات! میں نے تمہارے جیسے بہت تھانے دار دیکھے ہیں۔ تمہیں بھی چھٹی کا دودھ یاد نہ دلایا تو میرا نام بھی ملک دلدار نہیں۔ تم نے مجھے حوالات میں بند کرنے کی بات کی ہے نا۔“ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا ”تم سے تو

میں بعد میں نمٹ لوں گا، پہلے ایک بہت ضروری کام کر لوں۔“

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی برآمدے کی جانب لپکا۔ اس کا انداز بڑا پھرتیلا تھا۔ میں سمجھا وہ تھانے سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ میرے اشارے پر اے ایس آئی خورشید خان نے آگے بڑھ کر بیرونی راستہ ہلاک کر دیا مگر ملک دلدار نے اچانک ایک ایسی حرکت کی، جو ہم میں سے کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

وہ بجلی کی سرعت سے مڑا اور تھانے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کا رخ حوالات کی طرف تھا، پھر سب کچھ پلک جھپکتے ہو گیا ”ٹھائیں، ٹھائیں، ٹھائیں۔“ تین گولیاں چلیں اور رب نواز کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح حوالات کے فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے سینے سے نکلنے والا خون اس کے تڑپتے پھڑکتے وجود کو بھگونے لگا۔ اس پر جان کنی کا عالم طاری تھا۔ وہ سانس لینے سے عاری تھا۔

چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا تھا پھر اس سناٹے کو ملک دلدار کی مجنونانہ آواز نے توڑا۔ وہ ریوالور ہاتھ میں پکڑے ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا۔

”میں نے مار دیا اس کتے کو۔ ایک حرامی کو ختم کر دیا میں نے...... اب کسی کو غداری کرنے کی جرأت نہیں ہو گی، کوئی نمک حرامی نہیں کرے گا۔“

ملک دلدار پر جنونی کیفیت طاری تھی۔ اسے اس بات کا مطلق ہوش نہیں تھا کہ وہ قتل ایسے سنگین جرم کا ارتکاب کر چکا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ہی سنک میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کو بھی بار بار لہرا رہا تھا۔

”میں سب کو دیکھ لوں گا۔ ایک ایک سے نمٹ لوں گا۔ دلشاد بیگم، بشیر جٹ، ملک صفدر حیات...... سب کو ختم کر دوں گا۔“

ملک دلدار اس وقت اپنے حواس گم کر بیٹھا تھا۔ وہ انا گزیدہ شخص غصے کی آخری ڈگری کو چھو رہا تھا مگر ملک صفدر حیات تھانے دار پوری طرح چاق و چوبند تھا اور اپنے فرائض سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوا تھا۔

میں نے باز کے مانند جست بھری اور ملک دلدار کو عقب سے دبوچ لیا۔ اس کے دونوں بازو میرے جن جپھے میں مقید ہو چکے تھے۔ میری دیکھا دیکھی میرے تھانے کے مستعد عملے نے ملک دلدار کے چھوٹے بھائی اور ان کے حواریوں کو حراست میں لے لیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ سب حوالات میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ وہ حوالات نہیں تھی جہاں رب نواز کا بے جان لاشہ ایک خون آلود گٹھری کے

مانند پڑا ہوا تھا۔

ملک دلدار نے میری گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی مگر میں نے زور لگا کر اس کے بازوؤں کی ہڈیوں کے کڑاکے نکال دیے۔ تکلیف کی شدت سے وہ کراہ کر رہ گیا۔ ناکامیابی اور بے بسی کے احساس نے اس کے منہ سے گالیوں کا فوارہ چھوڑ دیا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اسے ہتھکڑی پہنا دی۔

تھانے میں' آخری دس منٹ میں جو کچھ ہوا تھا' وہ سب کی توقع کے خلاف تھا۔ یہ اس سارے کیس کا ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ چوری کروانے کے جرم میں تو ملک دلدار کو شاید چھوٹی موٹی سزا ہو جاتی مگر قتل عمد کے ذیل میں وہ سیدھا سیدھا پھانسی چڑھ جاتا اور قتل بھی اس نے تھانے میں گھس کر ایک ایسے حوالاتی کا کیا تھا جو اس کے جرم کا عینی اور عملی گواہ بھی تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے مہمان اے ایس آئی مشکور علی تھانے پہنچ گیا۔ وہ یہاں پیش آمدہ حالات سے بے خبر تھا۔ جب میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تو حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! یہ سب تو حیرت ناک اور ناقابل یقین ہے۔''

میں نے کہا ''مشکور علی! جو بھی ہوا' اس میں قدرت کی کوئی مصلحت ہو گی۔ اللہ کے کام نرالے ہیں۔ اس کو یہی منظور ہو گا کہ ملک دلدار کو کوئی چھوٹی موٹی نہیں بلکہ لمبی چوڑی سزا پائے۔ ہم اس کے کام میں مداخلت کرنے والے کون ہوتے ہیں۔''

مشکور علی نے کہا ''ویسے ملک صاحب! اس غیر متوقع واقعے نے کام آسان کر دیا ہے۔ دلشاد بیگم کا مسروقہ مال برآمد ہو گیا اور اس واردات کے دو مجرموں میں سے ایک حادثاتی موت مر گیا' دوسرا پہلے کے قتل کے الزام میں پھانسی چڑھ جائے گا۔ شاید اسی کو کہتے ہیں...... خس کم' جہاں پاک۔''

میں نے اے ایس آئی مشکور علی کے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

دوسرے روز میں نے ضابطے کی ضروری کارروائی کر کے مال مسروقہ اے ایس آئی مشکور علی کی تحویل میں دے دیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی خوشی کنگن پور روانہ ہو گیا۔

ملک دلدار کا معاملہ بڑا واضح تھا۔ میں نے اس کے خلاف قتل عمد کا چالان تیار کر کے اسے عدالت کے حوالے کر دیا۔ دن دہاڑے تھانے میں گھس کر درجن بھر پولیس اہل کاروں کے سامنے اس نے قتل کیا تھا۔ واقعات و شوہدا کی روشنی میں سیشن کورٹ نے اسے موت کی سزا سنا دی۔ ملک دلدار

نے اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے پر سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کر دی مگر ہزار سر پٹخنے کے بعد بھی خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہوئے۔ ہائی کورٹ نے سیشن کورٹ کے فیصلے کی توثیق کر دی تھی۔

بظاہر یہ کہانی یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ ملک دلدار اور دلشاد بیگم کا قصہ اختتام پذیر ہو چکا مگر کاتب تقدیر کو ابھی کچھ اور تماشے منظور تھے۔ ایک سال کے بعد مجھے ایک خط موصول ہوا جس نے ماضی کے صفحات پر جم جانے والی گرد کو ہٹا دیا۔

وہ ایک عام سا لفافہ تھا جو ڈاک کے ذریعے آیا تھا اور مجھے تھانے کے پتے پر موصول ہوا تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا اور اندر سے برآمد ہونے والا تہ شدہ خط کھول کر پڑھنے لگا۔ نسوانی تحریر میں لکھا گیا تھا۔

''تھانے دار صاحب!

ہم زندگی میں کبھی نہیں ملے مگر غائبانہ طور پر ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ شاید میں آپ سے کبھی رابطہ نہ کرتی مگر ضمیر کی خلش نے میری راتوں کی نیند اور دن کا چین غارت کر کے رکھ دیا ہے۔ میں نہ سو سکتی ہوں' نہ جاگ پاتی ہوں' کھانا پینا مجھ پر حرام ہو گیا ہے۔ اب اتنا سا حلق سے اتار لیتی ہوں کہ زندگی برقرار رہے حالانکہ مجھے زندہ رہنے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

''آپ بھی سوچتے ہوں گے' میں عجیب عورت ہوں۔ ایک ہی وقت میں دو مختلف قسم کی باتیں کرتی ہوں۔ یقین جانیں' میں ایسی تھی نہیں بلکہ ہو گئی ہوں اور اس کا سبب ہے...... رب نواز کی روح فرسا موت...... اس موت نے میرے حواس' میرے اعصاب اور میری روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔

''ٹھہریں' میں فروعی اور اِدھر اُدھر کی باتوں کو چھوڑ کر ترتیب سے اپنی کہانی آپ کو سناتی ہوں۔ امتیاز علی میرا شوہر ضرور تھا مگر وہ معاملات خلوت کی اہلیت نہیں رکھتا تھا پھر ملک دلدار کا ہمارے گھر آنا جانا شروع ہوا۔ دلدار' امتیاز کا دوست تھا اس لیے اس سے پردہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کی میل ملاقات کے بعد میں بہک گئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دلدار نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مجھے بہکا دیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے ٹرانس میں آتی گئی۔ وہ مجھ سے عشق کا دعوے دار تھا۔ سچی بات تو یہ ہے مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی تھی۔

''دلدار روز اول ہی سے بدنیت تھا۔ میں اس کی محبت کے سنہری جال میں پھنس کر رہ گئی۔ ایک روز اسی محبت کے سائے میں دلدار نے مجھے حاصل کر لیا پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ وہ بار بار مجھے حاصل کرتا

رہا اور میں اس کی جھوٹی محبت میں اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کرتی رہی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ امتیاز ہمارے تعلقات سے بالکل ہی بے خبر ہو۔ پھر ایک روز اس نے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنے مار آستین دوست اور اپنی بے وفا بیوی کو اسی وقت ختم کر دیتا مگر امتیاز بہت بزدل مرد تھا۔ بے غیرتی کی حدود کو چھوتا ہوا بزدل۔ وہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے بجائے خود ہی مر گیا۔ ہمیں قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ......

''امتیاز کی موت کے بعد میں نے دلدار سے شادی کا تقاضا کیا تو اس نے آنکھیں پھیر لیں اور شام کوٹ کا راستہ بھول گیا۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہمارے درمیان جو کچھ ہوتا رہا' اس میں سراسر دلدار قصور وار ہے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ میں برابر کی خطاوار تھی مگر امتیاز کی موت کے بعد دلدار کی طوطا چشمی نے میرا دل خون کر دیا۔ مجھے مرد ذات سے نفرت ہو گئی۔ امتیاز علی اگر بزدل اور بے غیرت ثابت ہوا تھا تو دلدار نے پیٹھ دکھا کر اپنی مردانگی کے چہرے پر کالک مل لی تھی۔ اس نے محبت میں مجھے دھوکا دیا تھا۔ میرے دل میں اس کے لیے نفرت کا طوفان امڈ آیا۔ میں دلدار سے بھیانک انتقام لینے کے لیے کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگی اور بالآخر تین سال بعد مجھے وہ موقع مل گیا۔

''الیکشن کی آمد آمد تھی اور میں نے معلوم کر لیا کہ دلدار الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے۔ میں نے دلدار کے خاص ملازم رب نواز کو شیشے میں اتار لیا۔ اس کام میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آپ تو جانتے ہیں کہ عورت کی طاقت کا کوئی حدوشمار نہیں ہوتا۔ وہ جب کسی کام کی ٹھان لیتی ہے تو اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو ٹھوکروں میں اڑا دیتی ہے۔ رب نواز تو میرے لیے نہایت ہی آسان ٹارگٹ تھا۔ میں نے بارہا یہ محسوس کیا کہ وہ مجھے پسندیدہ نظر سے دیکھتا تھا۔ عورت' مرد کی ایک مخصوص نظر کو بخوبی محسوس کر لیتی ہے۔ رب نواز کئی مرتبہ دلدار کے ساتھ ہمارے گھر شام کوٹ آیا تھا۔ میں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ میں نے اپنی اداؤں سے اسے یقین دلا دیا کہ اگر وہ میرا اک کام کر دے تو میں ساری زندگی کے لیے اس کی ہو جاؤں گی۔ کام صرف اتنا تھا کہ طلائی کنگن والا منقش صندلی بکس میرے گھر سے ملک دلدار کے گھر پہنچانا تھا۔ اس کے بعد پیش آنے والے ممکنہ حالات کے بارے میں بھی میں نے اسے بتا دیا تھا۔ وہ پہلے تو اپنے مالک کے خلاف کام کرنے کے سلسلے میں پس و پیش سے کام لینے لگا۔ اس موقع پر میں نے اسے بزدلی کا طعنہ دیا۔ میں نے بڑے واضح انداز میں اسے باور کرایا کہ ایک طرف ملک دلدار سے وفا کر کے اس کے لیے ساری زندگی کی غلامی ہے اور دوسری جانب میری خاطر قربانی دے کر میرے جسم و جان کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار بننے کا

اعزاز ہے۔

''چند لمحے فیصلے کی سولی پر گزار کر بالآخر اس نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا۔ میں اپنے عمل سے ملک دلدار کا سیاسی کیریئر ہمیشہ کے لیے داغ دار کرنا چاہتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ الیکشن میں کامیابی اس کا سب سے بڑا خواب تھا۔ جب رب نواز نے مجھے تعاون کا یقین دلایا تو میں نے اپنی پلاننگ کے لیے اے ایس آئی مشکور علی کو اپنے منصوبے میں شامل کیا۔ مشکور علی کا شمار بھی میرے چاہنے والوں میں ہوتا ہے مگر میں تو دلدار والے واقعے کے بعد سے مردوں سے نفرت کرنے لگی تھی۔ میں نے مشکور سے وعدہ کیا کہ اگر وہ میری پلاننگ کے مطابق تفتیش کرتے ہوئے ملک دلدار کی حویلی سے طلائی کنگن والا بکس برآمد کر کے دلدار کی مٹی پلید کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میں اس سے شادی کر لوں گی۔ میں نے رب نواز اور مشکور علی کو الگ الگ دو کام سونپے تھے اور ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں درحقیقت کون سا کھیل کھیل رہی ہوں۔

''بالآخر میں اپنے کھیل میں کامیاب ہو گئی...... بلکہ توقع سے زیادہ کامیابی مجھے حاصل ہوئی۔ دلدار ایک قاتل کی حیثیت سے جیل چلا گیا۔ رب نواز حوالات میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اے ایس آئی مشکور علی......

''میں مشکور علی کے بارے میں تفصیل میں نہیں جاؤں گی۔ بس چلتے چلتے اتنا ضرور بتاؤں گی کہ طلائی کنگن پر کندہ رومانی تحریر اور صندلی بکس کے خفیہ خانے سے برآمد ہونے والے چار عشقیہ خطوط میرے اپنے ذہن کی پیداوار تھے۔ اس میں دلدار کا چنداں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اپنے منصوبے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں نے یہ بیج لگایا تھا جو میری توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لگ بھگ ایک سال بعد میں خط کے ذریعے آپ تک یہ معلومات کیوں پہنچا رہی ہوں...... تو تھانے دار صاحب! یہ معلومات نہیں بلکہ میرے مجروح ضمیر کی چیخیں ہیں جو میں باوجود کوشش کے بھی اپنے اندر نہیں روک سکتی۔ میں اب ایسی جگہ پر ہوں جہاں آپ مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ میں عرصہ ہوا شام کوٹ چھوڑ چکی ہوں۔ شام کوٹ ہی کیا' میں تو کنگن پور بلکہ ضلع قصور ہی چھوڑ چکی ہوں۔

''میں زندہ ہوں مگر مردوں سے بدتر۔ میرا ضمیر مجھے ہر پل کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ میں نے انتقام کی خاطر جو کچھ کیا' وہ کسی بھی طرح سراہے جانے کے قابل نہیں۔ میں اس خط میں اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے' اس نکاسی کے بعد میرا مردہ ضمیر

جاگ اٹھے کیونکہ مردہ ضمیر کے ساتھ زندہ وجود سب سے بڑی سزا ہے جو قدرت کی طرف سے مجھے ملی ہے۔

''مجھے امید ہے' اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش نہیں کریں گے اور میری تحریر کو ضائع کر دیں گے۔ میں یہ خط مکمل کرنے کے بعد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نئے سرے سے جنم لے رہی ہوں۔

''تھانے دار صاحب! میں نے زندگی میں مردوں سے بہت دھوکے کھائے ہیں اور آپ بھی ایک مرد ہی ہیں۔ مردوں کی ازلی سر بلندی قائم رکھنے کے لیے مجھے یقین ہے' آپ ایسی کوئی حرکت' ایسا کوئی عمل نہیں کریں گے جو میرے اعتماد کی آخری سانس کو گھونٹ دے۔ فقط دلشاد بیگم' مقام نامعلوم۔

میں نے دلشاد بیگم کے خط کو دو تین بار پڑھا پھر اسے نذر آتش کر دیا۔ جب میں یہ کر رہا تھا تو میرے ذہن میں صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ اعتماد کی آخری سانس کو ختم نہیں ہونا چاہیے۔ اعتماد تو اس دنیا کی اساس ہے۔ جس طرح کشش ثقل کے بغیر زمین اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی بالکل اسی طرح اعتماد کے بغیر زندگی' زندگی نہیں رہتی بلکہ شرمندگی میں بدل جاتی ہے۔

معلوم نہیں' میں نے غلط کیا یا صحیح؟ ہاں' مجھے یہ اطمینان ضرور حاصل ہے کہ میں نے زندگی کو شرمندگی سے بچالیا۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

❖ ❖ ❖

ستم نصیب:

موسم گرما کی ایک ابر آلود صبح تھی۔ ماہ جولائی اختتام پذیر تھا اور ساون اپنے جوبن پر نظر آتا تھا۔ میں حسبِ معمول تھانے پہنچا تو پتا چلا علی الصباح ایک شدید زخمی عورت کو مقامی سرکاری اسپتال میں لایا گیا تھا۔ وہ بے ہوش تھی اور اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔

اطلاع ملتے ہی میں نے ایک اے ایس آئی کو ساتھ لیا اور فی الفور مذکورہ اسپتال پہنچ گیا۔ بارش سے بچاؤ کے لیے ہم اپنے ساتھ چھتریاں لانا نہیں بھولے تھے۔ عورت کو اسپتال پہنچانے والے شخص کا نام عظمت علی تھا۔ عظمت علی اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہ علی الصباح اپنے ساتھی کے ہمراہ ٹریکٹر ٹرالی پر شہر کی جانب جا رہا تھا کہ راستے میں دریا کے کنارے اس نے ایک عورت کو بے ترتیب پڑے ہوئے دیکھا چنانچہ اس نے اپنے ہمراہی کو جو ٹریکٹر ٹرالی کا ڈرائیور تھا' ٹریکٹر روکنے کو کہا۔ ڈرائیور مراد علی نے فوری طور پر بریک لگائے۔ بعد ازاں انہوں نے سرسری طور پر اس زخمی عورت کا جائزہ لیا اور اسے زندہ پا کر شہر کے سرکاری اسپتال لے آئے تھے۔

جب ہم اسپتال پہنچے تو عظمت علی اور اس کا ڈرائیور ساتھی مراد علی وہاں موجود تھے۔ عظمت علی تیس بتیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس نے خاصی بھاری مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کے مقابلے میں مراد علی کی صحت دگرگوں تھی اور وہ اپنے چہرے مہرے سے صدیوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی عظمت علی تیزی سے آگے بڑھا اور سلام کرنے کے بعد بولا ''سرکار! ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ آپ جلدی سے ہمارا بیان شیان لیں اور ہمیں جانے کی اجازت دیں۔ اگر ہمیں منڈی پہنچنے میں دیر ہوگئی تو چوہدری صاحب ہماری

کھال کھینچ لیں گے۔''

اے ایس آئی نے اسے دبکا مارا ''اوئے چوہدری کے گھوڑے! ذرا چھری کے نیچے دم تو لے، اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ کیا تمہارا چوہدری کوئی قصائی ہے جو کھال کھینچ لے گا؟'' ''اور جناب' آپ چوہدری نبی بخش کو نہیں جانتے۔'' عظمت علی کے ساتھی مراد علی نے خوف زدہ لہجے میں بتایا ''وہ ذرا ذرا سی بات پر بڑی کڑی سزا دیتے ہیں۔''

اے ایس آئی نے استہزائیہ انداز میں کہا ''اچھا بھئی' پھر تو تمہارے اس جلاد چوہدری سے بھی ملنا ہی پڑے گا۔''

میں نے عظمت علی سے استفسار کیا ''عظمت علی! تم جس زخمی عورت کو اسپتال لائے ہو وہ کون ہے؟''

میں لڑکی کو نہیں جانتا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا' تو وہ کوئی لڑکی ہے؟''

''مجھے تو وہ لڑکی ہی لگی تھی۔'' عظمت علی نے کہا ''اس کی عمر زیادہ دکھائی نہیں دیتی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ سولہ سترہ سال کی ہوگی۔''

میں نے پوچھا ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ اس علاقے کی رہنے والی نہیں ہے؟''

''اگر وہ ہمارے علاقے کی رہنے والی ہوتی تو میں فی الفور اسے پہچان لیتا جناب۔''

عظمت علی نے بتایا ''مجھے یقین ہے' وہ کسی دوسرے علاقے سے یہاں پہنچی ہوگی۔''

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا تھا' ممکن ہے مذکورہ لڑکی یا عورت کو عظمت علی کی ٹریکٹر ٹرالی سے ہی حادثہ پیش آ گیا ہو اور وہ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے اسے ٹرالی میں ڈال کر اسپتال لے آئے ہوں۔ میں نے اسپتال پہنچتے ہی ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر سے زخمی عورت کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ مذکورہ عورت بے ہوش تھی اور فی الحال بیان دینے کی حالت میں نہیں تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی میں عظمت علی اور اس کے ساتھی کی طرف گیا تھا اور اب ان سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا۔

میں نے کہا ''عظمت علی! تم اتنی صبح کہاں سے آ رہے تھے اور کس طرف جانے کا ارادہ تھا؟''

اس نے جواب دیا ''جناب ہم چوہدری صاحب کی زمینوں کی طرف سے آ رہے تھے اور سیدھے منڈی جا رہے تھے۔''

ڈرائیور مراد علی نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا ''ملک صاحب' ادھر کھیتوں سے ہم ٹرالی پر گنا لاد کر لا رہے تھے جسے منڈی میں پہنچانا تھا۔ خدا کے لیے آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں نہیں تو چوہدری صاحب ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

اس کی رونی صورت دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ چوہدری نبی بخش کتنا ظالم و جابر شخص ہوگا۔ ویسے میں نے چوہدری نبی بخش کے ''کارناموں'' کی خاصی شہرت سن رکھی تھی لیکن ابھی تک براہِ راست میرا اس سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس علاقے میں تعینات ہوئے ابھی مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔

میں نے عظمت علی سے کہا ''تم فکر نہ کرو۔ ہم خوامخواہ وقت ضائع نہیں کریں گے۔ اگر تم ساری بات سچ سچ بتا دو تو تمہیں ابھی جانے کی اجازت مل سکتی ہے۔''

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا ''جناب' ساری بات تو میں نے آپ کو بتا دی ہے۔ اب اور کیا بتاؤں اور رب دی سوں' میں نے ایک بھی جھوٹ نہیں بولا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''تم پورا واقعہ تفصیل سے بتاؤ۔''

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بتایا کہ وہ گزشتہ دو دنوں سے' چوہدری نبی بخش کی زمینوں سے گنا ٹرالی میں لاد کر منڈی پہنچا رہے تھے۔ سبزی منڈی میں چوہدری نبی بخش نے ایک بہت بڑا گودام لے رکھا تھا۔ وہ اپنی زمینوں میں اگنے والے اناج کو اس گودام میں اسٹور کرتا تھا۔ آج حسب معمول عظمت علی گنے سے لدی ہوئی ٹرالی کے ساتھ شہر کی جانب آ رہا تھا کہ دریا کے کنارے اسے ایک عورت لیٹی ہوئی نظر آئی۔ اس نے مراد علی سے کہا ''اوئے مرادے ٹریکٹر روک لے۔ ادھر ایک عورت نظر آ رہی ہے۔''

مراد علی نے بریک لگانے کے بعد ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا ''عظمت علی' تم کس عورت کا ذکر کر رہے ہو؟''

عظمت علی نے دریا کے کنارے کی جانب اشارہ کیا ''وہ دیکھو' اس طرف۔''

''ہاں بھئی۔ ہے تو یہ کوئی عورت ہی۔'' مراد علی نے حیرت آمیز لہجے میں کہا ''پر یہ ادھر کیوں پڑی ہوئی ہے؟''

''آؤ دیکھتے ہیں۔'' عظمت علی ٹرالی سے نیچے اتر آیا۔

مراد علی بھی ڈرائیونگ سیٹ سے نیچے کود پڑا اور تشویش ناک لہجے میں بولا ''عظمت علی' ذرا

احتیاط سے۔ کسی مصیبت میں نہ پڑ جانا۔''

اس دوران میں عظمت علی اس عورت کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ وہ بے ترتیب' بے سدھ پڑی تھی۔ مراد علی نے اس کے قریب آ کر گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا ''میرا تو خیال ہے' یہ مرچکی ہے۔''

عظمت علی نے مذکورہ عورت کی نبض ٹٹولی۔ نبض انتہائی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی اور اب تب میں ڈوبنے والی تھی۔ ''مرادے! یہ زندہ ہے۔'' عظمت علی نے کہا ''چلو اسے اسپتال لے چلتے ہیں۔''

''یار خوامخواہ مصیبت کو دعوت نہ دو۔'' مراد علی نے کہا ''یہ تو سیدھا سیدھا پولیس کیس دکھائی دیتا ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو ہم لمبے ہی لگے جائیں گے۔''

عظمت علی نے کہا ''کچھ نہیں ہوتا مرادے۔ ہماری نیت صاف ہے۔''

''نیت کو آج کل کون دیکھتا ہے۔'' مراد علی نے کہا ''تم پرائے پھٹے میں ٹانگ نہ پھنساؤ۔ ہم اسے اسپتال لے کر جائیں گے تو پولیس پہلا شک ہم پر ہی کرے گی۔''

''انسانیت بھی کوئی چیز ہے مرادے۔''

''انسانیت کا درد اپنے دل سے نکال دو۔'' مراد علی نے کہا ''اس کو یہیں پڑا رہنے دو۔ ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہوچکی ہے۔ پینڈا کھوٹا نہ کرو۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی مراد علی نے ٹریکٹر ٹرالی کی جانب قدم بڑھا دیے۔ عظمت علی شش و پنج میں مبتلا اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ زمین پر پڑی ہوئی بے ہوش لڑکی نے دھیرے دھیرے کراہنا شروع کر دیا۔ عظمت علی نے آواز دے کر مراد علی کو اپنے پاس بلا لیا۔ اسے مراد علی کو راضی کرنے میں خاصی دیر لگی۔ بہرحال انہوں نے اس لڑکی کو ٹرالی میں ڈالا اور اسپتال لے آئے۔

میں نے باری باری دونوں سے مختلف سوال کیے۔ دونوں کے جوابات میں مجھے تضاد نظر نہیں آیا۔ ویسے مجھے وہ دونوں بے قصور دکھائی دیے تھے تاہم میں نے ان کے ساتھ زیادہ نرمی ظاہر نہیں کی۔ بعض اوقات انتہائی معصوم اور بے ضرر دکھائی دینے والے افراد بھی ازاں بعد خاصے خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

میں نے مراد علی سے کہا ''مراد علی! تم ٹریکٹر ٹرالی لے کر جاسکتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا چوہدری تمہاری کھال اتارے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ''اور ہاں' ایک بات یاد رکھنا۔ منڈی سے فارغ ہو کر سیدھا تھانے آ جانا۔ وہاں تمہارا پکا بیان ہوگا۔''

اے ایس آئی نے اسے گھورتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا ''مرادے' کہیں رفو چکر ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ نہ ہو کہ چوہدری تو دیکھتا ہی رہ جائے اور ہم تمہاری کھال......''

''نہیں سرکار۔'' مراد علی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ''مائی باپ' میری کیا مجال جو آپ کے حکم سے ایک انچ بھی ادھر ادھر حرکت کروں۔ میں منڈی سے سیدھا تھانے آؤں گا۔''

''میں بھی جاؤں ملک صاحب!'' عظمت علی نے اجازت طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''تم تھوڑی دیر ادھر ہی ٹھہرو۔'' میں نے کہا ''ابھی تم سے کچھ ضروری باتیں ہونا ہیں۔''

میں عظمت علی کو اے ایس آئی کی نگرانی میں چھوڑ کر زخمی لڑکی کی خبر گیری کے لیے اندر پہنچ گیا۔ عظمت علی کو میں نے اس لیے روک لیا تھا کہ اس کے ساتھ میں جائے وقوعہ کا جائزہ لینا چاہتا تھا...... وہ جگہ جہاں وہ لڑکی انہیں ملی تھی۔

میں نے اس لیڈی ڈاکٹر سے ملاقات کی جس نے زخمی لڑکی کا طبی معائنہ کیا تھا۔ وہ دبلے پتلے جسم کی مالک ایک ادھیڑ عمر عورت تھی تاہم اس کی خوب صورتی اور خوش اخلاقی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ اپنے پیشے میں بھی خاصی ماہر دکھائی دیتی تھی۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا ''ملک صاحب! لڑکی کو بڑی بے دردی سے زدوکوب کیا گیا ہے۔ اس کے جسم پر جابجا تشدد کے نشانات پائے گئے ہیں۔ دست درازی اور مار پیٹ کے علاوہ اس پر مجرمانہ حملہ بھی کیا گیا ہے اور بڑی درندگی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔''

''اوہ!'' میرے سینے سے ایک افسوس ناک سانس خارج ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا ''کیا میں اس کا بیان لے سکتا ہوں؟''

''فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ''اس کی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہے۔ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے نیند کا انجکشن دیا ہے۔ اس کا فوری طور پر ہوش میں آنا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ شدید ترین جذباتی و ذہنی صدمے سے دوچار ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے' ابھی وہ بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ممکن ہے' شام تک اس کی حالت کچھ سنبھل جائے۔ ویسے میں نے ضروری ٹریٹ منٹ شروع کر دیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا ''میں اس کا بیان لینے شام کو آؤں گا۔''

''ہاں' یہ مناسب رہے گا۔''

میں نے پوچھا ''لڑکی کے بارے میں کچھ پتا چلا یہ کون ہے؟''

''ابھی تک تو کچھ پتا نہیں چلا۔'' لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا ''ٹریکٹر ٹرالی والوں کا کہنا ہے کہ یہ اس علاقے کی رہنے والی نہیں ہے۔''

''ہاں' انہوں نے مجھے بھی یہی بتایا ہے۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''لڑکی کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی تھا؟''

''نہیں' ایسی کوئی چیز میں نے تو نہیں دیکھی۔'' اس نے جواب دیا ''آپ نے ان لوگوں سے پوچھا جو اسے اسپتال لے کر آئے تھے؟''

''ان سے میں سرسری پوچھ گچھ کر چکا ہوں۔'' میں نے کہا ''ابھی تک اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔''

''آپ اپنی تفتیش جاری رکھیں۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ''کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔''

میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا ''ویسے لڑکی کی حالت کیسی ہے؟''

''لڑکی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔'' اس نے جواب دیا ''تاہم اسے جسمانی طور پر فٹ ہونے کے لیے کم از کم دس روز تک اسپتال میں رہنا ہوگا۔''

''اور اس کی ذہنی صحت کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اس کے بارے میں سردست کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' اس نے بتایا ''وہ جتنے بڑے جذباتی صدمے سے دوچار ہوئی ہے اس سے سنبھلنے میں کافی عرصہ لگے گا۔''

میں باہر آیا تو اے ایس آئی' عظمت علی سے سوال و جواب میں مصروف تھا۔ میرے چہرے پر چھائی ہوئی تفکر کی بدلی کو دیکھ کر اے ایس آئی سمجھ گیا کہ صورتِ حال خاصی سنگین ہے۔

''ملک صاحب!'' اے ایس آئی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یہ اپنا عظمت علی تو بڑا بیبا بندہ ہے۔ ہر طرح کے تعاون کے لیے تیار ہے۔ اب آپ کا کیا ارادہ ہے۔ تھانے عظمت علی کو روک رکھا ہے۔''

''کہاں ملک صاحب؟''

میں نے کہا ''موقع پر۔''

ہم نے اسپتال سے باہر نکل کر ایک تانگا پکڑا اور اس میں بیٹھ کر دریا کی جانب روانہ ہو گئے۔ عظمت علی کی راہنمائی میں مطلوبہ پہنچے۔

میں نے اس جگہ کا بغور جائزہ لیا۔ وہ دریا کا کنارہ تھا۔ دریا کے ساتھ ساتھ ایک کچی سڑک شہر کی جانب جاتی تھی۔ عظمت علی کی ٹریکٹر ٹرالی اسی سڑک پر جا رہی تھی جب اسے دریا کے کنارے وہ لڑکی پڑی ہوئی دکھائی دی تھی۔ میں نے وقوعہ کی زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ بارش کے باعث زمین نم آلود تھی اور قدموں کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نشانات ان افراد کے ہوں گے جو وہاں سے گزرتے رہے تھے۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ زخمی لڑکی ننگے پاؤں تھی۔ اس کے قدموں کے نشانات کا اندازہ لگانا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ ننگے پاؤں کے نشانات کے ساتھ ساتھ کسی مردانہ پاؤں کے نشانات بھی بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ مراد پاؤں اور زنانہ ننگے پاؤں کے نشانات دریا کے کنارے واقع جھاڑیوں کے اندر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان نشانات سے پتا چلتا تھا کہ مذکورہ لڑکی خود کو بچانے کے لیے جھاڑیوں میں چاروں طرف دوڑتی پھری ہوگی۔ جھاڑیوں میں ایک جگہ خون کے قطروں کے نشانات بھی پائے گئے تھے جو یقینی طور پر زخمی لڑکی کے خون کے نشانات تھے۔ ایک بات تو یقینی تھی کہ اسپتال میں بے ہوش پڑی اس اجنبی لڑکی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا' ان ہی جھاڑیوں میں ہوا تھا۔

میں نے گھوم پھر کر گرد ونواح کا جائزہ لیا۔ ان جھاڑیوں میں سے دو راستے نکلتے تھے۔ ایک پگڈنڈی نما راستہ قریبی گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا عظمت علی اور مراد علی جہاں کے رہائشی تھے اور چوہدری نبی بخش جس گاؤں کا مطلق العنان فرماں روا تھا۔ دوسرا راستہ ریلوے اسٹیشن کی جانب جاتا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا مین لائن سے ہٹ کر واقع تھا۔ یہاں سے دن بھر میں اکا دکا ٹرینیں ہی گزرتی تھیں۔

عظمت علی اور اس کا ساتھی مراد علی اس بات کی تصدیق کر چکے تھے کہ وہ مذکورہ لڑکی کو نہیں جانتے اور یہ کہ وہ اس گاؤں کی رہنے والی بھی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک سوال نے سر ابھارا۔ ممکن ہے' لڑکی کسی دوسرے گاؤں یا شہر سے یہاں آئی ہو اور ناگہانی صورتِ حال سے دوچار ہو کر اسپتال پہنچ گئی ہو۔ میں نے اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے لڑکی کے قدموں کا کھرا ڈھونڈنا شروع کیا۔ میں لڑکی کے ننگے پاؤں کے نشانات کی راہ نمائی میں جھاڑیوں میں چلتا رہا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد مجھے ایک جھاڑی میں ایک دوپٹا الجھا ہوا دکھائی دے گیا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ دوڑتے ہوئے اس لڑکی کا دوپٹا اس جھاڑی میں اٹک گیا ہوگا۔ اسی جھاڑی کے نزدیک

مجھے ایک زنانہ سینڈل بھی پڑی مل گئی۔

میں نے قدموں کے نشانات کا تعاقب جاری رکھا۔ اب ننگے پاؤں کے نشانات معدوم ہو گئے تھے البتہ زنانہ سینڈل اور مردانہ جوتے کے نشانات پہلو بہ پہلو بڑے واضح نظر آ رہے تھے اور دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ قدموں کے نشانات ریلوے اسٹیشن کی جانب سے جھاڑیوں کی طرف آ رہے تھے۔ اب اس بات میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ لڑکی ایک مرد کے ساتھ ریلوے اسٹیشن سے ان جھاڑیوں کی سمت آئی تھی۔ ان ہی جھاڑیوں میں اس کی عصمت کو تار تار کیا گیا تھا۔ اس بات کی وضاحت ہونا باقی تھی کہ آیا لڑکی کو برباد کرنے کے بعد زخمی کیا گیا تھا یا اس پر مجرمانہ حملہ کرنے سے پہلے اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ جب تک لڑکی ہوش میں نہ آتی اور میں اس کا بیان نہ لے لیتا اس وقت تک کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں تھا۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کی جانب سے جھاڑیوں کی طرف آنے والے قدموں کے نشانات بڑے ہموار اور پہلو بہ پہلو تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ لڑکی اپنی مرضی سے اس مرد کے ساتھ جھاڑیوں میں پہنچی تھی لیکن جھاڑیوں کے اندر پہنچ کر قدموں کے نشانات میں بے ترتیبی اور افراتفری پائی جاتی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہاں جو کچھ بھی پیش آیا تھا وہ لڑکی کے لیے غیر متوقع تھا۔

میں نے جائے وقوعہ کا تفصیلی نقشہ تیار کیا۔ ضابطے کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے اپنی ابتدائی تفتیش کا آغاز کر دیا۔ سب سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی اور کس علاقے سے یہاں پہنچی تھی۔ اس کا ساتھی مرد کون تھا اور ان جھاڑیوں میں اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے۔ اب یہ بات تو واضح ہو چکی تھی کہ وہ دونوں اسٹیشن سے اس طرف آئے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ وہ دونوں کسی دوسرے شہر سے یہاں پہنچے ہوں گے۔

میں نے عظمت علی کو جانے کی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ علاقہ چھوڑ کر کہیں نہ جائے اور ضروری کاموں سے نمٹ کر، تھانے آ کر اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کروائے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔

میں نے لڑکی کے دوپٹے اور سینڈل کو اپنے قبضے میں کیا اور اے ایس آئی کے ساتھ تھانے آ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بعد از دوپہر اسپتال جاؤں گا۔ اگر اس وقت تک مذکورہ لڑکی بیان

دینے کے قابل نہ ہوئی تو ریلوے اسٹیشن سے باقاعدہ تفتیش کا آغاز کر دوں گا۔

☆☆☆

اس روز خلافِ معمول میں تھانے میں اس قدر مصروف رہا کہ دوپہر میں اسپتال جانے کا وقت نہیں مل سکا۔ شام کو میں اسپتال پہنچا تو ایک اندوہ ناک خبر میری منتظر تھی۔ وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ صبح جس زخمی لڑکی کو وہاں لایا گیا تھا، وہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ میرے استفسار پر ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے بتایا ”ملک صاحب! ہم نے اس کی جان بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی مگر اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔“

میں نے پوچھا وہ لیڈی ڈاکٹر کہاں ہے جس نے صبح اس لڑکی کا طبی معائنہ کیا تھا؟“

”اس کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔“ اس نے جواب دیا ”اگر کوئی بہت ہی ضروری کام ہو تو اسے بلایا جا سکتا ہے۔ اس کی رہائش اسپتال سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”اسے گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟“

ڈاکٹر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے جواب دیا ”میرے خیال میں وہ ایک گھنٹا قبل اسپتال سے نکلی تھی۔“

”اس کے بعد سے آپ ڈیوٹی پر ہیں؟“

”جی ہاں، وہ میرے آنے کے بعد ہی گئی تھی۔“

میں نے پوچھا ”جب سے آپ ڈیوٹی پر ہیں، اس لڑکی نے کسی قسم کی کوئی بات کی تھی۔ اپنے بارے میں کوئی بات، خود کو پیش آنے والے حالات کے بارے میں کوئی اشارہ یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات؟“

”نہیں جناب۔“ ڈاکٹر نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا ”جب سے میں آیا ہوں، یہ مسلسل بے ہوش تھی۔ کوئی آدھا گھنٹا پہلے نرس نے مجھے بتایا کہ لڑکی کی نبض ڈوب رہی ہے۔ میں نے فوری طور پر اس کا معائنہ کیا لیکن میرے آنے سے پہلے ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔“

”اوہ!“ میرے سینے سے ایک تشویش ناک سانس خارج ہوئی ”یہ تو بہت برا ہوا۔“ میں نے اضطراری لہجے میں کہا پھر پوچھا ”لیڈی ڈاکٹر نے آپ کو اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ میرا مطلب ہے، اس لڑکی نے اسپتال میں موجودگی کے دوران میں اپنے بارے میں کچھ بتایا ہو؟“

ڈاکٹر نے بتایا ”مجھے تو لیڈی ڈاکٹر نے ایسی کوئی خاص بات نہیں بتائی۔ ٹھہریں، میں لیڈی ڈاکٹر کو اسپتال بلواتا ہوں۔ ممکن ہے، اس سے مل کر آپ کا مسئلہ حل ہو جائے۔“

پھر وہ اسٹاف روم کی جانب بڑھ گیا تا کہ لیڈی ڈاکٹر کو بلوانے کے لیے کسی کو اس کے گھر بھیج سکے۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے کانسٹیبلوں میں سے ایک کو بھیج کر سرکاری فوٹو گرافر کو بلوالیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد مذکورہ لیڈی ڈاکٹر اسپتال میں موجود تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا ''لڑکی بے ہوشی کے دوران میں دو تین مرتبہ کراہی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھی کہ زخموں کی تکلیف کی وجہ سے کراہ رہی ہے۔ میں نے اسے ایک اور سکون آور انجکشن لگا دیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر کراہی میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی ہو۔''

مجھے یاد آیا کہ صبح عظمت علی نے بھی اس لڑکی کے کراہنے کا ذکر کیا تھا۔ جب اس نے ٹریکٹر ٹرالی سے اتر کر لڑکی کا جائزہ لیا تھا تو وہ ایک دو مرتبہ ہولے ہولے کراہی تھی۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے سوال کیا۔

''آپ نے سننے کی کوشش کی' لڑکی کیا کہنا چاہتی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا ''میں نے اس کے کپکپاتے ہونٹوں کے نزدیک کان لگا کر سننے کی کوشش کی تھی۔ میں واضح طور پر تو کچھ سننے میں کامیاب نہیں ہو سکی تاہم اس کی نحیف و نزار آواز میں مجھے ایک نام کی تکرار محسوس ہوئی تھی۔''

''کیسا نام؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''شاید وہ میاں خلیل کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''میاں خلیل!'' میں نے زیرلب دہرایا۔

''ہاں' وہ کچھ اسی قسم کا لفظ تھا'' لیڈی ڈاکٹر نے بتایا ''یا شاید وہ کچھ اور کہنا چاہ رہی تھی۔ میں نے جو سمجھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ میرا اندازہ ہے' وہ میاں خلیل ہی کہہ رہی تھی۔ آواز میں چونکہ بے انتہا نقاہت تھی۔ اس لیے اس کے ہونٹوں سے 'مائیں یاں خالیل' جیسے الفاظ ادا ہو رہے تھے۔ میں نے پوری توجہ سے سننے کی کوشش کی تو میری سمجھ میں آیا' شاید وہ ''میاں خلیل'' کہنا چاہ رہی ہے۔''

میں نے لیڈی ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور اس نام کو اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ اس وقت تک سرکاری فوٹو گرافر اسپتال پہنچ چکا تھا۔ میں فوٹو گرافر کے ساتھ اسپتال کے مردہ خانے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی کی لاش کو ابھی تک سرد خانے میں منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ایک چرمی کاؤچ پر سفید چادر کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی۔ میرے ایما پر اسپتال کے عملے کے ایک فرد نے لاش کے اوپر سے چادر ہٹا دی۔

میں اس نامعلوم لڑکی کی لاش کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ انیس بیس سال کی ایک حسین وجمیل لڑکی تھی۔ اس نے سوتی کپڑے کا پھول دار جوڑا پہن رکھا تھا۔ اسپتال والوں نے اس کا لباس تبدیل کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ اس کے کپڑوں پر خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے جسم پر زخموں کے متعدد نشانات ہوں گے۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر بھی زخموں کے نشانات واضح نظر آ رہے تھے جس کا مطلب تھا' اس نے حملہ آور کے وار بچانے کی بھرپور کوشش کی ہوگی۔

میرے اشارے پر فوٹو گرافر نے مختلف زاویوں سے چند تصاویر بنا ڈالیں۔ وہ نامعلوم لڑکی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی مگر اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ موت نے اس کے حسن و جمال کو متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور وضع قطع سے خالص دیہاتن لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے جسم پر واحد زیور سونے کی ایک نتھنی تھی جو اس کی ناک کے ایک نتھنے میں موجود تھی۔ اس نتھنی میں دو سفید موتی بڑے خوب صورت دکھائی دیتے تھے۔

نامعلوم مضروبہ اور مظلومہ اب مقتولہ میں تبدیل ہو چکی تھی اس لیے مجھے مزید قانونی کارروائی کرنا پڑی۔ اس سلسلے میں لیڈی ڈاکٹر اور ڈیوٹی نرس کا بیان بھی شامل تھا۔ دوپہر میں مراد علی اور عظمت علی نے تھانے آ کر اپنا باقاعدہ بیان نوٹ کروا دیا تھا۔ ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال ہی میں چھوڑا اور اپنے ماتحت عملے کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔

☆☆☆

دوسرے روز میں نے نامعلوم مقتولہ کی ایک تصویر ایس آئی صابر حسین کو دے کر آس پاس کے علاقوں میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے بھیج دیا۔ ایس آئی کے ساتھ میں نے دو کانسٹیبلوں کو بھی روانہ کر دیا تھا۔ ان کے روانہ ہونے کے بعد میں نے اے ایس آئی اسلم وڑائچ کو ساتھ لیا اور ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس وقت مقتولہ کی دو تین تصویریں میری جیب میں موجود تھیں۔

میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ ایک چھوٹا سا قصباتی ریلوے اسٹیشن تھا۔ چونکہ وہ مین لائن پر واقع نہیں تھا اس لیے وہاں ٹرینوں کی آمد و رفت زیادہ نہیں تھی۔ ایسے اسٹیشنوں پر عملہ بھی خاصا آرام طلب ہوتا ہے اور کسی ٹرین کی آمد پر ہی وہ اسٹیشن پر نظر آتے ہیں ورنہ کہیں نہ کہیں پڑے آرام فرما رہے ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھ گچھ کا آغاز نچلے طبقے سے کیا۔ یعنی پلیٹ فارم پر موجود ٹھیلے والوں' پھیری

والوں اور قلیوں وغیرہ سے۔ وہ صبح کا وقت تھا اور اس وقت پلیٹ فارم پر اچھی خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر میں کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ میں نے مختلف لوگوں کو نامعلوم مقتولہ کی تصویر دکھائی اور اس کے بارے میں استفسار کیا لیکن سب نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میری تلاش مایوسی کی حدوں کو چھونے ہی والی تھی کہ امید کی ایک کرن دکھائی دی۔ ایک پھیری والے لڑکے نے تصویر کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ اس لڑکے کی عمر لگ بھگ بارہ سال ہوگی۔ وہ صورت ہی سے ایک غریب اور پس ماندہ لڑکا نظر آتا تھا۔ اس نے گلے میں ایک چھابڑی لٹکا رکھی تھی جس پر وہ بچوں کے کھانے کی چھوٹی موٹی چیزیں فروخت کرتا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا ''میں نے کل شام اس کڑی کو ادھر دیکھا تو تھا جی۔''

''کیا تمہیں یقین ہے' تم نے اسی لڑکی کو دیکھا تھا؟'' میں نے دوسری تصویر نکال کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔

وہ یقین سے بولا ''موجو کو کبھی دھوکا نہیں ہوا جناب۔ مجھے چنگی طراں یقین ہے' یہ اسی لڑکی کا فوٹو ہے۔ اس نے مجھ سے ٹافیاں بھی خریدی تھیں۔''

''موجو تمہارا نام ہے؟'' میں پوچھا۔

اس نے بتایا ''نام تو مجیب ہے جی' پر لوگوں نے بگاڑ کر موجو بنا دیا ہے اور میرا خیال ہے' یہ نام مجھ پر بڑا فٹ بیٹھتا ہے۔ میں ہوں ہی من موجی۔''

میں نے پوچھا ''کاکا موجو! یہ لڑکی اکیلی ہی تھی یا اس کے ساتھ کوئی مرد شرد بھی تھا؟''

وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد بولا ''مرد تو کوئی نہیں تھا۔ میں نے تو اسے ادھر اکیلے ہی بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔''

''ادھر کدھر؟''

اس نے ایک بینچ کی جانب اشارہ کیا ''ادھر بیٹھی تھی۔''

میں نے پوچھا ''اس نے تم سے ٹافیاں خریدتے وقت کوئی بات بھی کی تھی؟''

''بڑی خاص بات کی تھی جناب۔'' موجو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''کیا خاص بات؟''

اس سے پہلے کہ موجو میرے سوال کا جواب دیتا' ایک ٹرین وسل بجاتے ہوئے پلیٹ فارم

میں داخل ہوئی۔

''لو جناب' میں تو چلا۔'' موجو نے تیز آواز میں کہا ''باقی گلاں باتاں بعد میں۔''

میرے روکنے کے باوجود بھی ٹرین کی جانب لپک پڑا۔ اس وقت اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی ''دال سویاں' نکیاں' ٹافیاں' خستہ پتیسا لو...... ریوڑی' بسکٹ' کھٹی میٹھی املی لو......''

اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھے۔ میں نے اے ایس آئی اسلم وڑائچ کو ہدایت کی کہ وہ موجو پر نظر رکھے اور اسے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اسلم نے موجو کے تعاقب میں قدم بڑھا دیے۔ میں پلیٹ فارم کی بینچ پر بیٹھ کر گاڑی کے روانہ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ ایک پسنجر ٹرین تھی۔ رش زیادہ نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین حرکت میں آئی تو اے ایس آئی موجو کو لے کر میرے پاس آ گیا۔ میں نے چھوٹتے ہی اس سے پوچھا۔

''ہاں بھئی کاکا موجو! اس لڑکی نے کون سی خاص بات تم سے کی تھی؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''اس کے پاس ایک لفافہ تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ اگر میں وہ لفافہ اس کی ماں تک پہنچا دوں تو وہ مجھے پورا ایک روپیہ بطور انعام دے گی۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے پوچھا ''کیا تم نے وہ لفافہ اس کی ماں تک پہنچا دیا تھا؟''

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا ''نہ جی' میں اس طرح کے کام نہیں کرتا۔ میرے ابا نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔''

''تو اس کا مطلب ہے' تم نے اس لڑکی کو بھی انکار کر دیا تھا؟''

''آہو جی' میں نے چٹا جواب دے دیا تھا۔''

''پھر اس نے کیا کہا؟''

''اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے دو روپے انعام دے گی لیکن میں نے پھر بھی اس کی بات نہیں مانی۔ وہ مایوس ہوگئی اور بینچ سے اٹھ کر ادھر ویٹنگ روم میں چلی گئی تھی۔''

میں نے پوچھا ''کیا تم نے اس لڑکی سے پوچھا تھا کہ اس کی ماں کہاں رہتی ہے؟''

''او جناب تھانے دار صاحب! جس پنڈ نہیں جانا' اس کا راستہ کیا پوچھنا۔''

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا ''موجود پہلوان' تم خاصے سمجھ دار لگتے ہو۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟''

"تین جماعتیں پاس ہوں جناب۔" وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلا کر بولا "آگے پڑھنے کا شوق تو بہت تھا جناب لیکن ابا نے کہا کہ پڑھنے میں کیا رکھا ہے' کوئی کام کاج کروتا کہ گھر میں خوش حالی آئے۔ پھر انہوں نے کسی ریلوے کے ملازم سے بات کر کے مجھے یہاں چھابڑی لگانے کی اجازت دلا دی۔ اس وقت سے یہیں کام کر رہا ہوں۔"

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا "موجو! تم نے بتایا ہے کہ وہ لڑکی اکیلی ہی پلیٹ فارم پر بیٹھی تھی لیکن ہماری معلومات کے مطابق اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا۔"

"ہوگا جی' پر میں نے دیکھا نہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔" میں نے نرم لہجے میں پوچھا "وہ کسی ٹرین سے اتری تھی یا کسی ٹرین کا انتظار کر رہی تھی؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا "جناب! میرا خیال ہے' وہ کسی ٹرین سے اتری ہی ہوگی کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں ایک ٹرین آئی تھی۔"

"جس وقت تم نے اسے بینچ پر بیٹھے ہوئے دیکھا' وہ ٹرین روانہ ہو چکی تھی یا پلیٹ فارم پر موجود تھی؟"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں جناب۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا "اگر ٹرین پلیٹ فارم پر موجود ہوتی تو میں بھلا اس کے پاس کیسے جا سکتا تھا۔ ٹرین کے روانہ ہونے کے بعد جب میں پلیٹ فارم پر پھیری لگا رہا تھا تو اس نے اشارہ کر کے مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ پہلے مجھ سے ایک روپے کی ٹافیاں خریدیں پھر لفافہ پہنچانے کی بات کی تھی۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے' وہ کسی دوسری ٹرین کا انتظار کر رہی ہو؟"

"ناممکن جناب۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"جناب' جس ٹرین کا میں نے آپ کو بتایا ہے نا' وہ اس اسٹیشن پر آنے والی آخری ٹرین ہے۔ اس کے بعد صبح تک نہ کوئی ٹرین آتی ہے اور نہ ہی جاتی ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ ٹرین سے اتری ہی ہوگی۔"

میں نے پوچھا "آخری ٹرین کتنے بجے اسٹیشن پر آتی ہے؟"

"قریب قریب شام کی اذان کے وقت۔" اس نے جواب دیا۔

ان دنوں مغرب کی اذان لگ بھگ سوا سات بجے شام کو ہوتی تھی اس کا مطلب یہی تھا کہ جب موجو نے اس نامعلوم لڑکی کو دیکھا تو ساڑھے سات کا وقت ہوگا۔ موجو کے بیان کے مطابق وہ اکیلی تھی' اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا لیکن حالات و واقعات بتاتے تھے کہ دریا کے قریب جھاڑیوں میں اس کے ساتھ نہ صرف دست درازی کی گئی تھی بلکہ اسے تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد اس کی عزت سے بھی کھیلا گیا تھا یا اسے ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد زدوکوب کیا گیا تھا۔ اس کی روح اور جسم پر اتنی کاری ضربات لگائی گئی تھیں کہ وہ اس جذباتی و روحانی صدمے کو جھیل نہیں سکی تھی اور ہمیشہ کے لیے ہر دکھ تکلیف اور اذیت سے نجات پا گئی تھی۔ اس کے ساتھ پیش آمدہ حالات کا ذمے دار کوئی مرد ہی ہو سکتا تھا۔ جو ریلوے اسٹیشن سے اس کے ساتھ ان جھاڑیوں میں پہنچا تھا۔

جھاڑیوں کی جانب آنے والے قدموں کے نشانات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مقتولہ اس شخص کے ساتھ اپنی رضامندی سے آئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اس شخص کو اچھی طرح جانتی تھی یا یوں کہہ لیں کہ مذکورہ شخص اسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا یا پھر ممکن ہے مقتولہ کی کوئی مجبوری' کوئی کمزوری اسے جھاڑیوں تک لے آئی تھی لیکن جھاڑیوں کے اندر جو لرزہ خیز واقعہ پیش آیا تھا اس کی مقتولہ کو توقع نہیں ہوگی۔ اب تک کی تفتیش سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ مقتولہ کو ہوس کی بھینٹ چڑھانے والا اس کا شناسا تھا اور ریلوے اسٹیشن سے اس کے ساتھ وہ جھاڑیوں میں پہنچی تھی۔

میں نے موجو سے ایک اہم سوال کیا "کاکا! تم نے اس لڑکی کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی دیکھا تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے' اس کے پاس ایک چھوٹی سی گٹھری تھی جو اس نے اپنی گود میں اٹھا رکھی تھی۔"

"اس کے علاوہ اور کچھ؟"

"اور تو کچھ نہیں تھا جناب۔"

میں نے پوچھا "موجو! تم نے بتایا ہے کہ جب تم نے اس لڑکی کا لفافہ اس کی ماں تک پہنچانے سے انکار کر دیا تھا تو وہ مایوس ہوگئی تھی اور پلیٹ فارم کی بینچ سے اٹھ کر اندر ویٹنگ روم میں چلی گئی تھی۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

"اس کے بعد کیا ہونا تھا جی۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا "جب وہ ویٹنگ روم میں چلی گئی تو

میں بھی اپنے گھر چلا گیا تھ۔ آخری گاڑی کے گزرنے کے بعد پلیٹ فارم ویران ہو جاتا ہے اس لیے میں کام ختم کر کے گھر چلا جاتا ہوں۔''

میں نے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے موجو! وہ لڑکی رات ویٹنگ روم میں ہی رہی ہوگی یا کہیں چلی گئی ہوگی؟''

میں گھما پھرا کر ایسے سوال محض اس لیے کر رہا تھا کہ موجو اگر کوئی اہم بات جانتا تھا تو اس کے منہ سے وہ بات نکل جائے۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جناب تھانے دار صاحب! میں بھلا کیسے بتا سکتا ہوں وہ ویٹنگ روم میں رہی تھی یا چلی گئی تھی۔ میں تو اپنے گھر چلا گیا تھا۔''

''ذرا سوچ کر بتاؤ۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''اس لڑکی سے بات کرنے کے بعد اور گھر جانے سے پہلے تم نے پلیٹ فارم پر کسی اور شخص سے کوئی بات کی تھی؟''

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے' بکھرے ہوئے لہجے میں بولا ''پتا نہیں جناب' آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔''

اس کے انداز سے میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا ''دیکھ موجو' میں تھانے دار ہوں ذرا دوسری قسم کا۔ دن رات جھوٹوں کے سرداروں سے میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ میں جھوٹ بولنے والوں کے ساتھ بڑا سخت برتاؤ کرتا ہوں۔ تم میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے ہو یا تھانے لے چلوں؟''

اے ایس آئی اسلم وڑائچ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا ''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے بچو۔ تھانے کی مار بڑی خوف ناک ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑے طرّم خانوں کا پیشاب خطا ہو جاتا ہے۔ تم تو ایک رات ہی میں چیں بول جاؤ گے۔''

وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''تھانے دار صاحب! میں نے ابھی تک آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ مجھے معاف کر دیں جناب۔ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ مجھے تھانے نہ لے کر جائیں۔ جو کچھ پوچھنا ہے' یہیں پوچھ لیں۔''

''اگر تم تھانے کی مار سے بچنا چاہتے ہو تو ملک صاحب جو پوچھتے ہیں' اس کا سولہ آنے صحیح جواب دو۔ اے ایس آئی نے سخت لہجے میں کہا ''تھانے جا کر تو تمہارا کچومر نکل جائے گا۔ ایک ہی رات میں نانی دادی خواب میں آ جائے گی۔''

''پوچھیں ملک صاحب!'' وہ رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولا ''میں سب کچھ سچ سچ بتاؤں گا۔''

میں نے پوچھا ''تو پھر بتاؤ' کل شام گھر جانے سے پہلے تم نے پلیٹ فارم پر کسی شخص سے بات کی تھی اور کیا بات کی تھی؟''

اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا اور پر خیال انداز میں بولا ''جب میں گھر جانے کے لیے اسٹیشن سے نکل رہا تھا تو باؤ فدا نے مجھے روک لیا تھا۔''

''یہ باؤ فدا کون ہے؟''

''فدا حسین ٹکٹ باؤ ہیں جناب۔'' موجو نے جواب دیا ''ادھر اسٹیشن پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے ٹکٹ دیتے ہیں۔''

میں سمجھ گیا' موجو بکنگ کلرک فدا حسین کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''ٹکٹ بابو فدا حسین نے تمہیں کیوں روک لیا تھا؟''

وہ بولا ''فدا باؤ مجھ سے اس لڑکی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔''

''کون سی لڑکی؟'' میں نے چونک کر سوال کیا۔

''یہی جناب' جس کی تصویر آپ نے مجھے دکھائی ہے۔'' موجو نے جواب دیا ''اور جو کل رات بینچ سے اٹھ کر ویٹنگ روم میں چلی گئی تھی۔''

موجو کے جواب نے میرے اندر اُمید کی ایک کرن جگمگا دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اہم سراغ میرے ہاتھ لگنے والا ہے۔ میں نے دلچسپ نظروں سے موجو کو دیکھا اور ملائمت آمیز لہجے میں سوال کیا۔

''ٹکٹ بابو فدا حسین تم سے اس لڑکی کے بارے میں کیا پوچھ رہا تھا موجو؟''

موجو نے جواب دیا ''باؤ فدا حسین نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ لڑکی مجھ سے کیا کہہ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ میرے ذریعے کوئی لفافہ اپنی ماں تک پہنچانا چاہتی ہے اور اس کا معاوضہ بھی دینے کو تیار ہے۔ میں نے باؤ کو جب یہ بتایا کہ میں نے اس لڑکی کا کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مایوس ہو کر ویٹنگ روم میں چلی گئی ہے تو باؤ فدا نے مجھے جھاڑ پلائی اور کہا کہ میں جھلا ہوں۔ مجھے اس لڑکی کا کام کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا بلکہ باؤ فدا حسین نے اصرار کیا کہ میں اس لڑکی کے پاس جا کر اس سے مذکورہ لفافہ لے آؤں لیکن میں نے باؤ کے بصد اصرار

کے باوجود بھی جب اس کی بات نہیں مانی تو اس نے کہا' اچھا ایسا کرو۔ تم اس لڑکی کو بلا کر میرے پاس لے آؤ۔ میں اس کا لفافہ اس کی ماں تک پہنچا دوں گا۔ مجھے اس کام میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی اور میں نے باؤ فدا کا پیغام اس لڑکی تک پہنچا دیا۔''

وہ میرے تجسس کو ہوا دے رہا تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

''اس کے بعد کا مجھے پتا نہیں جناب۔''

اے ایس آئی نے اسے کالر سے پکڑ کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور سخت لہجے میں پوچھا ''سچ سچ بتاؤ' تمہارا پیغام سننے کے بعد وہ لڑکی ٹکٹ بابو فدا حسین کے پاس آئی تھی؟''

وہ رونی صورت بنا کر بولا ''دیکھیں تھانے دار صاحب! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں سچ بولوں گا تو مجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اب یہ سپاہی مجھے پکڑ کر مارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنا وعدہ یاد رکھیں جناب۔''

''ہمیں اپنا وعدہ یاد ہے۔'' اے ایس آئی نے خوں خوار نظروں سے اسے گھورا ''اگر تم ملک ہوراں کے سوال کا صحیح جواب دو گے تو تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ بتاؤ' وہ لڑکی فدا حسین سے ملنے ویٹنگ روم سے باہر نکلی تھی؟''

''سوہنے رب دی سوں' میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' وہ گڑگڑانے لگا ''مجھے کچھ پتا نہیں' وہ لڑکی ویٹنگ روم ہی میں بیٹھی رہی تھی یا باؤ فدا کے پاس لفافہ دینے گئی تھی۔ اللہ پاک کی قسم' میں تو باؤ فدا کا پیغام اس لڑکی کو دے کر سیدھا گھر چلا گیا تھا۔ آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں' میں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔''

اس کے لہجے سے سچائی ٹپک رہی تھی۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا ''ٹھیک ہے موجو' میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہوں مگر یاد رکھو اگر بعد میں تمہارا بیان جھوٹا ثابت ہوا تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ پھر کوئی تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانے سے نہیں روک سکے گا۔''

''اگر میں جھوٹ بولوں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے کہا ''بس ایک آخری سوال۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا ''جب کل شام ٹکٹ بابو فدا حسین سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی تو وہ کہاں کھڑا تھا۔ میرا مطلب ہے' وہ ٹکٹ گھر کے اندر موجود تھا یا باہر پلیٹ فارم پر کہیں بیٹھا ہوا تھا؟''

موجو نے جواب دیا ''باؤ فدا حسین اس وقت بکی روم کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے موجو کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ''یہ نہ سمجھنا موجو کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہارے بیان پر یقین کر لوں گا۔ میں تمہاری باتوں کی تصدیق بھی کروں گا۔''

''آپ بے شک تصدیق کریں جناب۔'' اس کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔

اے ایس آئی نے کہا ''اگر تمہاری ایک بھی بات غلط ثابت ہوئی تو تھانے میں لمبا لٹا دوں گا اور وہ چھترول کروں گا کہ آنے والی سات نسلیں...... پیدا ہوں گی۔''

موجو سراسیمہ نظروں سے پہلے اے ایس آئی کو اور پھر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے سرزنش آمیز لہجے میں کہا ''ان باتوں کا کسی سے ذکر نہیں کرنا خاص طور پر بابو فدا حسین کو تو اس کی بھنک بھی نہیں ملنا چاہیے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔'' موجو پر اعتماد لہجے میں بولا ''سمجھ لیں کہ ہمارے درمیان کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ میں اپنی جیب (زبان) میں جندرا (تالا) لگا لوں گا۔''

میں نے موجو کو پلیٹ فارم پر ہی چھوڑا اور اے ایس آئی اسلم وڑائچ کے ساتھ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اسٹیشن ماسٹر اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے اس علاقے میں تعینات ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔'' میں نے اسٹیشن ماسٹر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ''میں اس علاقے کا نیا تھانے دار ہوں۔'' پھر میں نے اے ایس آئی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''یہ اے ایس آئی اسلم وڑائچ ہے۔''

اسٹیشن ماسٹر نے پرجوش خیر مقدم کیا اور ہمیں بٹھانے کے بعد ٹھنڈا گرم پوچھنے لگا۔

میں نے کہا ''کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے جناب۔ دراصل اس وقت ہم ڈیوٹی پر ہیں۔''

''جی فرمائیں' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' اسٹیشن ماسٹر نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنی آمد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میں اس وقت ایک قتل کی تفتیش کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ امید ہے' آپ قانون سے پورا تعاون کریں گے۔''

''قق...... قتل!'' اسٹیشن ماسٹر اپنی کرسی میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر پرتشویش لہجے میں بولا ''کون قتل ہو گیا ہے؟''

''ایک نامعلوم پردیسن۔''

''لیکن کسی قتل کی تفتیش سے میرا کیا تعلق ہے؟'' اسٹیشن ماسٹر نے پریشان کن لہجے میں سوال کیا۔

میں نے کہا ''جناب! آپ اسٹیشن ماسٹر ہیں۔ اس چھوٹے سے قصباتی ریلوے اسٹیشن کا سارا عملہ آپ کے نیچے کام کرتا ہے۔ ہم کسی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتے ہیں۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی ''ذرا وضاحت فرمائیں گے آپ۔'' آخر کار اس نے کہا۔

میں نے مختصر ترین الفاظ میں اسٹیشن ماسٹر کو کل رات جھاڑیوں میں پیش آنے والے واقعے اور دریا کے کنارے پائی جانے والی زخمی لڑکی کے بارے میں بتایا اور ازاں بعد نامعلوم لڑکی کی موت کا انکشاف بھی کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اسٹیشن ماسٹر نے سوال کیا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا' اس پورے معاملے کا مجھ سے یا میرے عملے سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا ''جناب' ہمیں معلوم ہوا ہے کہ نامعلوم مقتول لڑکی کل شام اس اسٹیشن پر کسی ٹرین سے اتری تھی اور ویٹنگ روم میں آپ کے بکنگ کلرک فدا حسین نے اس سے ملاقات کی تھی۔ پھر اسی رات بدقسمت لڑکی کو بڑی بے دردی سے بے آبرو کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ہمیں آپ کے ٹکٹ بابو فدا حسین پر شک ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس لڑکی کے قتل میں ملوث ہے۔ ہم درحقیقت فدا حسین سے پوچھ گچھ کے لیے یہاں آئے ہیں۔''

''اوہ!'' اسٹیشن ماسٹر کے منہ سے گہری سانس خارج ہوئی ''تو یہ بات ہے۔'' اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا ''اگر ایسا ہے تو میں ابھی فدا حسین کو یہاں بلواتا ہوں۔ آپ کو جو پوچھنا ہو' پوچھ لیں۔''

میں نے کہا ''آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔''

اسٹیشن ماسٹر نے ایک چپراسی صورت شخص کو کمرے میں بلا کر ہدایات جاری کیں کہ وہ فی الفور ٹکٹ بابو فدا حسین کو بلا لائے۔

چپراسی کے جانے کے بعد میں نے پوچھا ''کیا فدا حسین اس وقت ڈیوٹی پر موجود ہے؟''

اس نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ دوڑاتے ہوئے جواب دیا ''ہونا تو چاہیے۔ اس کی ڈیوٹی دن کی ہے۔''

میں نے پوچھا ''اس کی ڈیوٹی کتنے بجے ختم ہوتی ہے؟''

''شام چھ بجے۔''

''کیا کل بھی شام چھ بجے ہی اس نے ڈیوٹی ختم کی تھی؟''

اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا ''جی ہاں' وہ روزانہ اسی وقت ڈیوٹی ختم کرتا ہے۔''

اسی وقت چپراسی صورت شخص نے آ کر بتایا ''جناب' فدا بابو تو آج صبح اپنے پنڈ چلے گئے ہیں۔''

''کیا مطلب!'' اسٹیشن ماسٹر نے برہمی سے کہا ''میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہیں کس نے بتایا کہ وہ اپنے گاؤں چلا گیا ہے؟''

چپراسی نے جواب دیا ''مطلوب صاحب بتا رہے ہیں۔''

''مطلوب کو میرے پاس بھیجو۔'' اسٹیشن ماسٹر نے تحکمانہ انداز میں کہا اور چپراسی ''اچھا سر جی'' کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

''عجیب بے ہودہ لوگ ہیں۔'' اسٹیشن ماسٹر نے غصیلے لہجے میں تبصرہ کیا ''وہ مجھے بتائے بغیر کس طرح گاؤں چلا گیا۔''

تھوڑی ہی دیر میں مطلوب علی نامی وہ شخص اسٹیشن ماسٹر کے سامنے حاضر تھا۔ وہ بھی بکنگ کلرک تھا اور فدا حسین کی جگہ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''فدا حسین کہاں گیا ہے؟''

مطلوب علی نے جواب دیا ''سر! اس کی والدہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی اس لیے وہ اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ میں اسی کے ایما پر اس کی جگہ ڈیوٹی دے رہا ہوں۔''

''مجھے کیوں اطلاع نہیں دی گئی؟'' اسٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

''سر! فدا حسین علی الصباح یہاں سے روانہ ہو گیا تھا۔'' مطلوب علی نے بتایا ''آپ سے اجازت لینے یا آپ کو اطلاع دینے کا وقت نہیں تھا۔ اس وقت آپ اپنے دفتر میں موجود بھی نہیں تھے۔''

''بعد میں مجھے کیوں نہیں بتایا گیا۔'' اسٹیشن ماسٹر نے غضب ناک ہو کر سوال کیا ''میں کتنی دیر سے یہاں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا ہوں۔''

''سوری سر۔'' مطلوب علی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ''میں مصروفیت میں بھول گیا تھا۔''

''تم بہت مصروف رہنے لگے ہو مطلوب علی۔'' اسٹیشن ماسٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا ''لگتا ہے تمہاری ڈیوٹی لاہور جنکشن پر لگا دی گئی ہے!''

وہ معافی تلافی کر کے کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا ''جناب! میرا شک یقین میں بدلتا جا رہا ہے۔ آپ کا ٹکٹ بابو اس نامعلوم لڑکی کے قتل میں براہ راست ملوث ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں ملک صاحب۔'' اسٹیشن ماسٹر کے لہجے میں بے بسی تھی ''اگر وہ یہاں ہوتا تو آپ کے سامنے ساری بات ہو جاتی ہے۔''

میں نے پوچھا ''اسٹیشن ماسٹر صاحب! یہ تو بتائیں' بابو فدا حسین کون سے گاؤں کا رہنے والا ہے؟''

اس نے جواب دیا ''موضع جھاوریاں' تحصیل شاہ پور' ضلع سرگودھا۔''

''اوہ! پھر تو وہ دو چار روز بعد ہی واپس لوٹے گا۔'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا پھر پوچھا ''کیا پہلے بھی وہ آپ کو بتائے بغیر اس طرح غائب ہوا ہے؟''

''نہیں جناب' یہ پہلا واقعہ ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا فدا حسین شادی شدہ ہے؟''

اس نے نفی میں جواب دا' میں نے اگلا سوال کیا ''یہاں پر فدا حسین کی رہائش کس جگہ ہے؟''

''وہ سرکاری کوارٹر میں رہتا ہے۔'' اسٹیشن ماسٹر نے بتایا ''ادھر اسٹیشن کی عمارت کے پیچھے کوئی نصف درجن رہائشی کوارٹر بنے ہوئے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''کیا مطلوب علی بھی انہی کوارٹروں میں رہتا ہے؟''

''جی ہاں' اس کی رہائش بھی ادھر ہی ہے۔''

''مطلوب علی بھی چھڑا چھانٹ ہے یا اس کی شادی ہو چکی ہے؟'' میں نے سرسری لہجے میں سوال کیا۔

اسٹیشن ماسٹر نے بتایا ''مطلوب علی نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ اس کے تین بچے بھی ہیں۔''

میں نے پوچھا ''فدا حسین گاؤں جاتے ہوئے اپنے کوارٹر کی چابی مطلوب علی کو دے گیا ہوگا۔ میں فدا حسین کے کوارٹر کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ آپ اس سلسلے میں مجھ سے تعاون کریں گے یا مجھے عدالت سے سرچ وارنٹ حاصل کرنا ہوں گے؟''

اسٹیشن ماسٹر نے مفاہمانہ لہجے میں کہا ''سرچ وارنٹ کی ضرورت نہیں ہے جناب۔ میں مطلوب علی کو بلا کر چابی کے بارے میں پوچھتا ہوں۔ اگر چابی اس کے پاس ہے تو آپ میری موجودگی میں بے دھڑک فدا حسین کے کوارٹر کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر آپ کو فدا حسین کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اس کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''میں ابھی تھانے جا کر اپنے آدمیوں کو موضع جھاوریاں ضلع سرگودھا روانہ کرتا ہوں۔ وہ فی الفور

اسے پکڑ کر یہاں لے آئیں گے۔ فی الحال تو آپ مطلوب علی کو بلائیں۔''

اسٹیشن ماسٹر نے بکنگ کلرک مطلوب علی کو اپنے کمرے میں بلا کر فدا حسین کے کوارٹر کی چابی کے بارے میں استفسار کیا۔ مطلوب علی نے تھوڑے سے پس و پیش کے بعد اقرار کر لیا کہ مذکورہ چابی اس کے پاس موجود ہے۔ مجھے مطلوب کے رویے نے شک میں ڈال دیا۔ میرے ذہن میں سوال ابھرا' کہیں مطلوب علی بھی تو فدا حسین کے معاملے میں ملوث نہیں۔

میں نے سخت لہجے میں پوچھا ''کہاں ہے وہ چابی؟''

''وہ...... وہ چابی ادھر میرے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسٹیشن ماسٹر سے کہا ''آئیں جناب' جو کچھ بھی ہوگا' آپ کی نگرانی میں ہوگا۔''

ہم سب ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے پچھواڑے بنے ہوئے سرکاری کوارٹروں کی جانب آ گئے۔ وہ تمام کوارٹر چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل تھے۔ مطلوب علی نے اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچ کر کہا۔

''آپ ذرا یہاں رک کر انتظار کریں۔ میں اندر سے چابی لے کر آتا ہوں۔''

مطلوب علی گھر میں داخل ہو گیا تو میں نے اسٹیشن ماسٹر سے پوچھا ''فدا حسین کتنے عرصے سے اس اسٹیشن پر ٹکٹ کلرکی کر رہا ہے؟''

''کم و بیش چار سال ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس دوران میں آپ نے کبھی اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سنی؟''

اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا ''مجھے آج تک اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔''

''میرا مطلب ہے' فدا حسین غیر شادی شدہ ہے اور کوارٹر میں تنہا رہتا ہے۔'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں استفسار کیا ''کبھی اس سے متعلق کوئی گڑبڑ والی شکایت آپ تک پہنچی ہو؟''

وہ میری بات کی تہ میں اترتے ہوئے بولا ''نہیں جناب' فدا حسین اس قماش کا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اس کے بارے میں اس حوالے سے کوئی بات نہیں سنی۔''

وہ گویا فدا حسین کے اچھے کردار کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''اس کے پاس مہمان تو آتے ہوں گے؟''

وہ سوچتے ہوئے بولا ''چند ماہ قبل فدا حسین کی ماں اور چھوٹی بہن اس کے پاس رہنے آئے

تھے۔قریب قریب وہ ایک ماہ اس کے پاس ٹھہرے تھے۔“

اسی دوران میں مطلوب علی، فدا حسین کے کوارٹر کی چابی لے کر باہر آ گیا۔ ہم اس کی معیت میں فدا حسین کے کوارٹر پر پہنچے۔ مطلوب علی نے چابی لگا کر تالا کھول دیا۔ ہم کوارٹر کے اندر داخل ہو گئے۔

وہ چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل کوارٹر تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو بیرونی کمرے کی تلاشی لینے کو کہا اور خود اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ اسٹیشن ماسٹر سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا جب کہ ٹکٹ بابو مطلوب علی اے ایس آئی اسلم وڑائچ کے ساتھ تھا۔

کوارٹر کا حلیہ ویسا ہی تھا جیسا چھڑے چھانٹ افراد کی رہائش گاہ کا ہوتا ہے۔ دیواروں پر فلمی اداکاراؤں کی تصویریں چسپاں تھیں اور کمرے میں موجود ہر چیز میں بے ترتیبی جھلکتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کئی روز سے وہاں صفائی نہ کی گئی ہو۔ میلے کپڑے بستر پر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے مختلف چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے بستر والی چارپائی کے نیچے جھانک کر دیکھا تو دیوار والی سائڈ پر مجھے چند ٹوٹی ہوئی چوڑیاں دکھائی دیں۔

اچانک مجھے اپنے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک چھڑے چھانٹ شخص کے کمرے میں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی موجودگی جو کہانی سنا رہی تھی وہ کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ اسٹیشن ماسٹر بھی چوڑیوں کے ان ٹکڑوں کو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر استعجابیہ تاثرات جم کر رہ گئے تھے۔

میں نے باحتیاط ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑوں کو جمع کیا اور انہیں ایک رومال میں باندھ لیا۔ اس کے بعد میں نے بستر کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ بستر کے اوپر ایک ڈبی دار چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے ہٹایا تو نیچے گدے پر مجھے کچھ زنانہ بال دکھائی دیے۔ بالوں کی لمبائی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی عورت کے سر کے بال تھے۔ ایسے ہی لمبے لمبے بال کمرے کے ایک کونے سے بھی ملے۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں اور زنانہ بالوں کا پایا جانا خالی از علت نہیں تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کمرے میں کسی عورت یا لڑکی نے رات گزاری تھی اور اس کے ساتھ دست درازی بھی کی گئی تھی۔

میں نے معنی خیز لہجے میں اسٹیشن ماسٹر نے کہا ”دیکھ رہے ہیں جناب! اس شریف زادے کے کرتوت؟“

وہ حیرت زدہ لہجے میں بولا ”مجھے آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا۔“

”یہ دنیا ہے جناب۔“ میں نے زنانہ بالوں کو بھی چوڑیوں والے رومال میں باندھتے ہوئے کہا ”یہاں سب کچھ ممکن ہے۔“

میں ان بالوں کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیجنا چاہتا تھا تاکہ اس بات کی تصدیق ہو سکے کہ یہ بال نامعلوم مقتولہ ہی کے تھے۔ ابھی ہمارے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ باہر سے اے ایس آئی کی آواز آئی۔ اس کی آواز اندرونی جوش سے معمور تھی۔

”ملک صاحب!“ وہ اندرونی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا ”دیکھیں، یہ کیا ہے۔“

میں اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دیکھ کر چونک اٹھا۔ میرے ذہن میں موجو کی ایک بات گونج اٹھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ لڑکی اپنی گود میں ایک چھوٹی سی گٹھڑی سنبھالے بیٹھی تھی۔ میں نے اے ایس آئی سے سوال کیا۔

”تمہیں یہ گٹھڑی کہاں سے ملی ہے اسلم؟“

وہ گٹھڑی میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا ”ملک صاحب! یہ ادھر بیرونی کمرے میں ایک دو چھتی پر پڑی تھی۔ سامنے سے دیکھنے پر بالکل نظر نہ آتی۔ وہاں دو چھتی پر خاصا کاٹھ کباڑ جمع ہے۔ میں نے اوپر چڑھ کر جب کاٹھ کباڑ کو ہٹا کر دیکھا تو اس کے نیچے سے یہ برآمد ہوئی ہے۔ اب آپ خود ہی اسے کھول کر دیکھ لیں، اندر کیا ہے۔“

میں نے گٹھڑی کو کھول کر دیکھا۔ اس کے اندر دو زنانہ سوٹ، ایک پرنٹڈ ریشمی رومال، ایک بند لفافہ اور سستی قسم کی میک اپ کی چند اشیا موجود تھیں۔ میری دلچسپی کا سامان وہ بند لفافہ تھا جس پر محراب پور کا ایڈریس لکھا ہوا تھا اور وہ لفافہ کسی ظہور بی بی نامی عورت کے نام بھیجا جا رہا تھا۔ میں موجو کی زبانی اس بند لفافے کا ذکر سن چکا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ لڑکی موجو کے ہاتھ کوئی لفافہ اپنی ماں کو بھجوانا چاہتی تھی۔ اس لفافے کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ لڑکی اپنی ماں ظہور بی بی کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی تھی اور ظہور بی بی محراب پور میں رہتی تھی۔

میں نے کھولے بغیر وہ لفافہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ میں اسے اطمینان سے پڑھنا چاہتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس لفافے میں بند مضمون نامعلوم مقتولہ کے پس منظر پر بھرپور روشنی ڈالے گا۔ اس دوران میں ٹکٹ بابو مطلوب علی بھی اندرونی کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر اور ٹکٹ کلرک کی موجودگی میں فدا حسین کے کوارٹر سے برآمد ہونے والی تمام متعلقہ چیزوں کی فہرست تیار کی اور احتیاط کے طور پر اس پر اسٹیشن ماسٹر اور مطلوب علی کے دستخط کروا لیے تاکہ سند رہے اور یہ

وقت ضرورت کام آئے۔

اس کارروائی کے بعد میں نے ٹکٹ کلرک مطلوب علی کو ہدایت کی کہ وہ اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد سیدھا تھانے آئے اور اپنا بیان نوٹ کروائے۔ اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور بولا۔

''جناب میرے بیان کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کیا قصور کیا ہے؟''

''بیان لکھوانے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ کوئی قصور ہی کیا جائے گا۔'' میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا ''تم فدا حسین کے ساتھ کام کرتے ہو' قریب قریب اس کے پڑوسی بھی ہو۔ وہ تم پر اتنا اعتماد کرتا ہے کہ تمہیں اپنے کوارٹر کی چابی دے کر گیا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ تم اس کے بہت سے پیچیدہ اور پوشیدہ معاملات سے بھی واقف ہو گے۔ تمہارا بیان ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔''

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا ''آپ خواہ مخواہ مجھ پر شک کر رہے ہیں جناب۔ میں فدا حسین کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔''

''تم جس حد تک جانتے ہو وہی بتا دینا۔'' میں نے کہا ''اس میں اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ امداد طلب نظروں سے اسٹیشن ماسٹر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ''سر جی! آپ ہی ملک صاحب کو کچھ سمجھائیں۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ مجھے کورٹ کچہری کے چکر میں نہ ڈالیں۔''

''اوئے بندے دے پتر!'' اسٹیشن ماسٹر نے اسے ڈانٹ پلائی ''ملک صاحب تمہیں بیان کے لیے تھانے ہی بلا رہے ہیں' کوئی پھانسی تو نہیں لگا رہے۔''

وہ قدرے مطمئن ہو گیا لیکن اس کا خوف پوری طرح زائل نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک تشویش کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔

میں نے فدا حسین کے کوارٹر سے باہر نکلتے ہوئے کہا ''مطلوب علی! تم اس کوارٹر کو دوبارہ تالا لگا دو۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ تالا لگا چکا تو میں نے کہا ''اب یہ چابی اسٹیشن ماسٹر صاحب کو دے دو۔''

اس نے بے چون و چرا وہ چابی اسٹیشن ماسٹر کی جانب بڑھا دی۔ میں نے اسٹیشن ماسٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جناب! جب تک فدا حسین واپس نہیں آ جاتا اور اس کیس کے سلسلے میں کوئی حتمی پیش رفت نہیں ہوتی' اس وقت تک یہ چابی آپ کے پاس رہے گی۔ آپ کے پاس یہ قانون کی امانت ہے۔''

اسٹیشن ماسٹر نے تھوڑے پس و پیش کے بعد وہ چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ ہم واپس ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں آئے۔ مطلوب علی تو ٹکٹ گھر کی جانب روانہ ہو گیا اور ہم اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے وہیں پر اسٹیشن ماسٹر کا ایک مختصر سا بیان نوٹ کر لیا۔ اس نے مجھے اس کیس کے سلسلے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر بعد میں اے ایس آئی اسلم وڑائچ کے ساتھ ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر اسپتال کی جانب جا رہا تھا۔

راستے میں اے ایس آئی نے پوچھا ''ملک صاحب! آپ نے مقتولہ کی گٹھری میں سے برآمد ہونے والا لفافہ کھول کر نہیں پڑھا؟''

میں نے کہا ''یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ گٹھری مقتولہ ہی کی ہے؟''

اس نے الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھا ''کیا اب بھی یہ ثابت ہونا باقی ہے؟''

''اب تک کیا ثابت ہوا ہے؟'' میرا لہجہ سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ گڑبڑا گیا' جلدی سے بولا ''اب تک یہ ثابت ہوا ہے کہ مقتولہ کو فدا حسین گھیر گھار کر اپنے کوارٹر میں لے گیا تھا۔ وہاں اس نے لڑکی سے دست درازی کی اور زیادتی کرنے کی کوشش کی۔ لڑکی کسی طرح اس کے ہاتھوں سے بچ نکلی اور دریا کے کناروں جھاڑیوں کی طرف آ نکلی۔ فدا حسین نے اس کا تعاقب کیا۔ اسے قابو کرنے کے بعد اس پر تشدد کے پہاڑ توڑے پھر اسے بے بس کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھائی۔ ازاں بعد اسے دریا کے کنارے ڈال کر رفو چکر ہو گیا۔''

میں نے پوری توجہ سے اس کی تفصیلی بات سنی اور کہا ''مائی ینگ اے ایس آئی! تمہارے تجزیے میں بہت سے جھول ہیں۔ ابھی تمہیں ایک طویل ٹریننگ کی ضرورت ہے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا ''اب آپ اس تھانے میں آ گئے ہیں تو انشاء اللہ میری ٹریننگ بھی مکمل ہو جائے گی۔''

اے ایس آئی اسلم وڑائچ میں یہ خوبی میں نے دیکھی تھی کہ اس میں سیکھنے کی بے انتہا صلاحیت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں تکبر اور بے جا غرور نامی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ مجھے

حیرت تھی کہ سابق تھانے دار نے اس کے جوہر کو پہچاننے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی۔

میں راستے بھر اے ایس آئی اسلم کو اس کی عملی میدان میں کمزوریوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ ساتھ ہی میں اس کی خامیوں کی نشان دہی بھی کرتا جا رہا تھا۔ اسلم کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو تسلیم کر لیتا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت تک کوئی انسان اپنی خامیوں کو دور نہیں کر سکتا جب تک اسے ان کا صحیح ادراک نہ ہو۔

ہم باتیں کرتے ہوئے اسپتال پہنچ گئے۔ میں نے مقتولہ کا پوسٹ مارٹم کرنے والے سرجن سے ملاقات کی اور اسے فدا حسین کے کوارٹر سے ملنے والے بالوں کے بارے میں بتایا۔

اس نے کہا ''ملک صاحب! آپ نے یہ ایک نہایت اہم سراغ پا لیا ہے۔ آپ ان بالوں کو لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھجوا دیں۔ وہاں مقتولہ کے سر کے بالوں سے ان کی میچنگ چیک کر لی جائے گی۔''

میں نے سرجن کا شکریہ ادا کیا' بالوں کو کیمیائی تجزیے کے لیے لیبارٹری میں چھوڑا اور اے ایس آئی کے ساتھ واپس تھانے آ گیا۔ جب ہم تھانے میں داخل ہوئے تو دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

میں نے فوری طور پر اے ایس آئی صابر حسین کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے اندر آ کر مجھے سلیوٹ کیا پھر بولا ''جی حکم ملک صاحب۔''

میں نے کہا ''صابر حسین! تمہیں فی الفور سرگودھا جانا ہوگا۔ اپنے ساتھ دو سپاہیوں کو بھی لے جاؤ۔''

''سرگودھا کس سلسلے میں جانا ہوگا جناب؟''

میں نے اپنی پوری بات بتانے کے بعد کہا ''فدا حسین موضع جھاوریاں' تحصیل شاہ پور کا رہنے والا ہے اور تازہ ترین معلومات کے مطابق وہ اپنے گھر گیا ہے۔ تم نے ہر حال میں اسے پکڑ کر واپس لانا ہے...... یہاں تھانے میں۔''

صابر حسین نے پوچھا ''جناب' فدا حسین کی گرفتاری کے لیے اگر کچھ کارروائی ڈالنا پڑے تو اس کی اجازت ہے؟''

''بالکل اجازت ہے۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا ''لیکن سب سے پہلے ضلع ہیڈ کوارٹر میں اپنی آمد کی غرض و غایت ضرور نوٹ کروا دینا۔''

''یہ کام تو میں سب سے پہلے کرتا ہوں جناب۔''

میں نے کہا ''بس تو اب تم فوری طور پر روانہ ہو جاؤ۔''

وہ دوبارہ سلیوٹ کر کے میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے اطمینان سے اپنی کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور فدا حسین کے کمرے کی دو چھتی سے ملنے والی گٹھری سے برآمد ہونے والے لفافے کو کھول کر پڑھنے لگا۔ وہ ایک طویل خط تھا۔ میں اس میں سے غیر ضروری و غیر متعلقہ باتوں کو حذف کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ لکھا تھا۔

''پیاری امی جان!

آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ آپ تو سمجھ رہی ہوں گی کہ شادی کے بعد میری بدقسمتی کے دن ختم ہو گئے ہوں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میاں خلیل کا منحوس سایہ میری جان سے لپٹ گیا ہے۔ آپ نے اسی میاں خلیل کے توف سے اور مجھے اس کے شر سے بچانے کے لیے عارف علی سے میری شادی کر دی تھی اور عارف علی مجھے لے کر دوسرے گاؤں آ گیا تھا جہاں اس نے کوئی مکان وغیرہ خرید رکھا تھا۔ آپ تصویر بھی نہیں کر سکتیں وہ دوسرا گاؤں کون سا تھا۔ میں آپ کو بتاتی ہوں۔ عارف علی مجھے اپنے ساتھ واپس کنگن وال لے آیا تھا۔ وہی کنگن وال جہاں سے ہم رات کے اندھیرے میں ہجرت کر کے خالہ کے گاؤں محراب پور پہنچے تھے۔ کنگن وال ہمارا آبائی گاؤں ہے۔ یہیں پر میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں اور یہیں پر وہ مردود میری جان کا دشمن میاں خلیل بھی اپنی بے پناہ قوت اور آن بان کے ساتھ رہتا ہے۔ اسی گاؤں میں لیاقت محمود کو موت کے گھاٹ اتارا گیا جو میرا منگیتر تھا اور عن قریب اس سے میری شادی ہونے والی تھی۔ یہ بات میں بھی جانتی ہوں اور آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں بلکہ پورا کنگن وال اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ میاں خلیل نے مجھے حاصل کرنے کے لیے لیاقت محمود کو اپنے واستے سے ہٹایا تھا لیکن کسی کی زبان میں اتنی طاقت نہیں کہ میاں خلیل کے خلاف ایک لفظ بھی ادا کر سکے کیونکہ وہ کنگن وال کا طاقت ور ترین شخص ہے۔ وہ چوہدری صاحب وڈے میاں فضل حسین کا بگڑا ہوا' خود سر اور سرکش بیٹا ہے۔ وہ اتنا منہ زور ہے کہ اس کا باپ بھی اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔

امی جان' میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ عارف علی مجھے اپنے ساتھ کنگن وال لے گیا تھا۔ جس روز ہم عارف علی کے خریدے ہوئے گھر میں پہنچے' اسی شام میاں خلیل آ دھمکا۔ اس نے عارف علی کو ڈرایا دھمکایا اور دباؤ ڈالا کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔ میاں خلیل کا کہنا تھا کہ میرے ابا نے اس

کے ساتھ میری منگنی کر دی تھی لیکن میں ابا کی وفات کے بعد اپنی ماں کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ اس موقع پر عارف علی کا رویہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ وہ میرے تحفظ میں میاں خلیل سے ٹکرانے کے بجائے اس کے آگے گڑگڑانے لگا۔ مجھے عارف علی پر شدید غصہ آیا لیکن میں بے بس تھی۔ بہر حال میاں خلیل نے عارف علی کو صبح تک سوچنے کا موقع دیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ صبح دوبارہ آئے گا۔ اگر عارف علی اس کی خواہش کے مطابق مجھے طلاق دینے پر تیار ہو گیا تو ٹھیک ہے ورنہ ہم پر وہ مصیبتیں نازل کر دے گا اور مجھے زبردستی چھین کر لے جائے گا۔

امی جان! آپ میری داستان الم سن کر یقینی طور پر خون کے آنسو رو رہی ہوں گی لیکن میں اپنا دکھڑا آپ کے سامنے نہ روؤں تو یہ زخمی دل چیر کر کسے دکھاؤں۔ میاں خلیل کے جانے کے بعد میں نے عارف علی پر اپنا غصہ اتارا۔

''تم کیسے مرد ہو عارف۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''میاں خلیل تمہاری غیرت پر ہاتھ ڈال رہا تھا اور تم اس کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔''

وہ جز بز ہو کر بولا ''میں مصلحت سے کام لے رہا تھا شاداں۔ اگر میں میاں خلیل کے سامنے زیادہ اکڑ دکھاتا تو معاملہ خراب ہو جاتا۔ وہ اس گاؤں کا مستقبل کا چوہدری ہے۔ وہ زور زبردستی سے بھی تمہیں چھین سکتا ہے پھر ایک بات اور بھی ہے۔''

''وہ کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

عارف علی نے بتایا ''دراصل یہ مکان میں نے میاں خلیل ہی سے خریدا ہے۔ رقم میں نے ادا کر دی ہے۔ بس لکھت پڑھت باقی ہے۔ اگر وہ مکان کا قبضہ دینے سے انکاری ہو گیا تو میری رقم ڈوب جائے گی۔''

''تو تمہیں اپنی عزت سے زیادہ اس رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہے جو تم اس مکان کی خریداری کے سلسلے میں میری جان کے دشمن اور میری عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے والے شخص کو دے چکے ہو؟'' میرے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''تم بدگمان نہ ہو شاداں!'' وہ لجاجت آمیز انداز میں بولا ''دراصل میں چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں اپنی رقم بھی بچانا چاہتا ہوں اور میاں خلیل سے پیچھا بھی چھڑانا چاہتا ہوں لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا' کروں تو کیا کروں۔''

''میری مانو تو رات کے اندھیرے میں ہم یہاں سے نکل چلتے ہیں'' میں نے تجویز پیش کی

''رقم ڈوبتی ہے تو ڈوب جائے' عزت سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں میاں خلیل کو تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم طاقت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ صبح آئے گا تو سب کچھ روند کر چلا جائے گا۔ ممکن ہے' تمہاری رقم تو ڈوبنے سے بچ جائے لیکن وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہ ایک طویل عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اس پر مجھے حاصل کرنے کی ضد سوار ہے۔ اگر تم نے اس کے راستے میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو وہ زبردستی مجھے چھین لے گا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہو گا شاداں!'' عارف علی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تم صبح کا انتظار کرو۔ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔''

میں نے کہا ''عارف! میاں خلیل سمجھنے والی بوٹی نہیں ہے۔ اگر اس پر کسی بات کا اثر ہونا ہوتا تو ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کیوں چوروں کی طرح چھپتے پھرتے۔ ہماری جمی جمائی زندگی برباد ہو گئی۔''

''تم دل چھوٹا نہ کرو۔'' عارف علی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں سوچ رہا ہوں۔ میاں خلیل سے پیچھا چھڑانے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔''

عارف علی کے لہجے کا کھوکھلا پن مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا' وہ میاں خلیل کے سامنے چند لمحے بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ میاں خلیل اپنی بدمعاشی اور دھونس دھاندلی کے زور پر عارف کو یا تو طلاق دینے پر مجبور کر دیتا یا پھر اسے قتل کر کے زبردستی مجھے اٹھا لے جاتا۔ اسے ایسا کرنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ کنگن وال کا زمینی خدا تھا۔ سب جانتے تھے کہ اس نے اپنے پالتو غنڈوں کے ذریعے لیاقت محمود کو موت کے گھاٹ اتارا تھا لیکن کوئی اس کے خلاف زبان کھولنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد عارف علی تو اطمینان سے لمبی تان کے سو گیا لیکن میں بے قراری سے بستر پر کروٹیں بدلنے لگی۔ یہ ٹھیک ہے کہ عارف کو نیند بہت پیاری تھی اور وہ بہت جلدی سونے کا عادی تھا لیکن ہمیں جو حالات پیش تھے ان کے پیش نظر عارف علی کا مطمئن انداز میں سو جانا مجھے عجیب سا لگا۔

میں آدھی رات تک بے چین رہی اور میاں خلیل کے بارے میں سوچتی رہی۔ میری بے قراری آسمان کو چھونے لگی تو میں نے اٹھ کر صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ عارف علی گھوڑے بیچ کر بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔ اس کی بے فکری پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں صحن میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی کہ بیرونی دروازے کے باہر مجھے دو آدمیوں کے

باتیں کرنے کی آواز آئی۔ وہ دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دروازے کے پاس آئی اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ موضوع گفتگو میں ہی تھی۔

ایک شخص اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا ''فیکے! ہم تو یہاں دروازے پر پہرا دے رہے ہیں۔ کہیں یہ ہنسوں کا جوڑا کسی دوسرے راستے سے نہ نکل جائے۔ اگر یہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تو میاں جی ہماری ہڈیوں کا سرمہ بنا ڈالیں گے۔''

''تو بھی جھلا ہے جھورے۔'' فیکے نامی شخص نے اپنے ساتھی سے کہا ''یہ کہیں نہیں جائیں گے۔ وہ کوچوان کی اولاد اس وقت گہری نیند کے مزے لے رہا ہوگا۔''

عارف علی کا اپنا تانگا تھا اور وہ عارف کوچوان کے نام سے مشہور تھا۔ جھورے نے فیکے سے کہا ''یار، تو بھی کمال کی باتیں کرتا ہے۔ صبح میاں خلیل اس کی بیوی چھیننے والا ہے۔ وہ بھلا مزے کی نیند کس طرح سو سکتا ہے؟''

''یار لگتا ہے، تم پوری بات سے واقف نہیں ہو۔'' فیکے نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا ''یہ تو سب ڈراما ہے۔''

''کیسا ڈراما فیکے؟''

''فیکے نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ''یار، مک مکا ہو چکا ہے۔ صبح سین پارٹ ہو جائے گا۔''

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا فیکے؟'' جھورے کے لہجے سے الجھن آمیز حیرت مترشح تھی۔

فیکے نے کہا ''میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔''

پھر فیکے کی زبانی جو انکشاف ہوا اسے سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساتوں آسمان ایک ساتھ مجھ پر آن گرے ہوں۔ میں ایک سوچی سمجھی سازش کا شکار ہوئی تھی۔ عارف علی، میاں خلیل کے ہاتھوں بک چکا تھا۔ درحقیقت عارف علی نے مجھے چار ہزار روپے میں میاں خلیل کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ دو ہزار وہ وصول کر چکا تھا اور دو ہزار میاں خلیل اسے اس وقت دیتا جب وہ مجھے طلاق دے دیتا۔ عارف علی نے میاں خلیل کے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے مجھ سے شادی کی تھی اور اسی کے ایما پر مجھے گھیر گھار کر کنگن وال لے آیا تھا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی تھی کہ وہ اب تک مجھ سے گریز کیوں کرتا آیا تھا۔ واضح رہے کہ اب تک ہمارے درمیان ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہوئے تھے۔ عارف علی میرا قانونی شوہر اور مجازی خدا تھا لیکن وہ میاں خلیل کے اشاروں پر ناچ رہا تھا۔ فیکے کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ صبح میاں خلیل ایک مولانا کو ساتھ لے کر آئے گا

اور عارف علی مولانا کے سامنے گواہوں کی موجودگی میں مجھے طلاق دے دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھے میاں خلیل کے قبضے میں ہی جانا تھا۔

جب مجھے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں صحن سے اندر کمرے میں آئی جہاں عارف علی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ مجھے تباہی کے گڑھے میں دھکیلنے والا شخص کتنی سکون بھری نیند سو رہا تھا۔ میرا دماغ سلگ اٹھا اور پورے وجود میں انگارے سے بھر گئے۔ میرے جی میں آئی کہ اس بے غیرت شخص کا گلا گھونٹ دوں لیکن پھر میں نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا اور پوری توجہ یہ سوچنے پر لگا دی کہ مجھے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے ان درندہ صفت انسانوں سے بہت دور چلی جانا چاہتی تھی۔

میں نے تمام حالات پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد اپنے استعمال کی چند ضروری چیزیں ایک گٹھری میں باندھیں اور دبے قدموں کمرے سے نکل آئی۔ صحن میں ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ میں اس سیڑھی کے ذریعے چھت پر پہنچ گئی۔ مکان کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی اور اگر اونچی ہوتی بھی تو میں اس وقت کوئی پروا نہ کرتی۔ وہ رات میری عزت پر بہت بھاری تھی۔ میں مکان کے پچھواڑے بہ آہستگی کود گئی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ وہاں سوکھے چارے کا اچھا خاصا ڈھیر جمع تھا اس لیے میں کسی قسم کی چوٹ سے محفوظ رہی۔ مکان کے پیچھے حصلے میں تاحدِ نگاہ کھیتوں کا وسیع سلسلہ پھیلا ہوا تھا، میں چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے کھیتوں میں داخل ہو گئی۔ اس وقت کھیتوں میں قد آدم فصل کھڑی تھی اس لیے مجھے خود کو چھپانے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔''

شاداں نے اپنے خط میں یہ تمام واقعات بے ربط اور انتہائی شکستہ انداز میں تحریر کیے تھے۔ میں نے آپ کی سہولت اور آسانی کے لیے انہیں کہانی کے رنگ میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی، میں نے بعد میں معلوم ہونے والے حالات کی روشنی میں، کمی وبیشی بھی کی ہے اس خط ہی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس مقتولہ کا نام شاداں تھا اور وہ ایک ستم نصیب لڑکی تھی۔ خط کے اختتامی حصے میں شاداں نے تحریر کیا تھا۔

''امی جان! میں کھیتوں کے اندر بے سمت سفر کر رہی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہی ہوں۔ بس میری پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ میں میاں خلیل کی پہنچ سے جلد از جلد دور نکل جاؤں۔ ویسے مجھے ایک بات کا یقین تھا کہ صبح ہونے سے قبل میری گم شدگی کا راز فاش

نہیں ہوگا۔ میں رات کے اندھیرے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔

صبح ہوئی‘ میں بھوکی پیاسی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی۔ تھکن سے میرا برا حال تھا لیکن میں قدم روکنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے کھیتوں سے ذرا فاصلے پر ریلوے لائن نظر آئی اور میں اس لائن کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ دوپہر سے پہلے پہلے میں ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے نزدیک پہنچ گئی۔ میں نے ایک دکان سے کاغذ‘ لفافہ اور قلم خریدا اور پلیٹ فارم کی سنگی بینچ پر بیٹھ کر آپ کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ امی جان! میں نے اب تک خود کو پیش آنے والے حالات کی تفصیل لکھ دی ہے۔ مجھے جیسے ہی موقع ملا‘ میں اس خط کو ڈاک کے حوالے کر دوں گی۔ میں نہیں جانتی آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جو بھی ٹرین اس اسٹیشن پر آ کر رکے گی‘ میں اس میں سوار ہو جاؤں گی۔ جب مجھے یقین ہو جائے گا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں ہے اور میں میاں خلیل کی پہنچ سے بہت دور نکل آئی ہوں تو آپ کو اپنے ٹھکانے سے آگاہ کر دوں گی۔ پھر آپ میرے پاس چلی آنا۔ آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ میں نے ان مشکل حالات میں آپ کے پاس آنے کا فیصلہ کیوں نہیں کیا تو آپ کی تسلی کے لیے بتاتی چلوں کہ میں آپ کو کسی نئی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ میاں خلیل کی خباثت اور شیطنت سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ محراب پور میں آپ کے ٹھکانے سے آگاہ ہے اور وہ میری تلاش میں سب سے پہلے وہیں آئے گے۔ اب میں اس خط کو بند کر رہی ہوں۔ زندگی رہی اور خدا کو منظور ہوا تو کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائے گی۔

آپ کی بدنصیب بیٹی۔ ”شاداں۔“

میں نے ایک گہری سانس لی اور خط کو تہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔ مقتولہ شاداں کے خط نے میرے لیے بہت آسانیاں پیدا کر دی تھیں لیکن بہت سی الجھنیں ابھی تک باقی تھیں۔ شاداں نے مذکورہ خط ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھ کر لکھا تھا اور گاڑی میں بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ یہ ہمارے علاقے کا ریلوے اسٹیشن تو نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ اس اسٹیشن پر شام کے وقت دکھائی دی تھی جب کہ یہ خط دوپہر میں لکھا گیا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ شاداں ٹرین کے ذریعے ہمارے علاقے میں پہنچی تھی۔ اور یہ بات بھی ثابت تھی کہ وہ اس دوران میں لفافہ پوسٹ نہیں کر سکی تھی۔ ہمارے علاقے کے ریلوے اسٹیشن پر اترنے کی کیا وجوہات تھیں؟ وہ خط کو ڈاک کے حوالے کرنے کے بجائے موجو کے ہاتھ کیوں بھیجنا چاہتی تھی؟ اسے معلوم تھا کہ محراب

پور یہاں سے قریب ہی ہے؟ یہ تمام سوالات اور ان جیسے کئی دوسرے سوالات میرے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے جن کے جوابات سردست میرے پاس نہیں تھے۔

بہرحال‘ تسلی بخش بات یہ تھی کہ میں شاداں کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ اب دریا کی نزدیکی جھاڑیوں میں اس کے ساتھ جو اندوہ ناک واقعہ پیش آیا تھا اس کے مجرم کو پکڑنا اور کیفرِ کردار تک پہنچانا میری ذمے داری تھی۔ جب تک صابر حسین‘ ٹکٹ بابو فدا حسین کو گرفتار کر کے نہ لے آتا‘ اس سلسلے میں پیش رفت ممکن نہیں تھی۔ فدا حسین میرا خصوصی ٹارگٹ تھا۔ البتہ ایک بات مجھے تذبذب میں ڈال رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اسپتال میں شاداں نے کراہنے کے دوران میں ”میاں خلیل“ کا نام پکارا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ یا تو میاں خلیل کی دہشت شاداں کے حواس کو پوری طرح اپنے شکنجے میں کسے ہوئے تھی یا پھر اس کی عصمت کو تارتار کرنے میں میاں خلیل پیش پیش رہا تھا۔ اگر اس تھیوری پر سوچا جاتا تو پھر یہ بات واضح تھی کہ میاں خلیل شاداں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا لیکن فدا حسین کے کوارٹر سے جو شواہد میں نے اکٹھے کیے تھے وہ کوئی اور کہانی سنا رہے تھے۔ معاملات بری طرح الجھ گئے تھے۔

جب کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے فی الحال اس سلسلے میں زیادہ سر کھپانا مناسب نہ سمجھا اور اپنا دھیان بٹانے کے لیے دوسرے کاموں میں خود کو مصروف کر لیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور صابر حسین کی واپسی تک میں سوائے انتظار کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ انتظار میرے لیے خاصا تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میرے اندازوں کے عین مطابق تھی۔

مقتولہ شاداں کی موت کا سبب وہ ذہنی و جذباتی صدمہ تھا جو اس کی روح کو لہولہان کر کے پہنچایا گیا تھا ورنہ اس کے جسم پر ایسی کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی تھی جو اس کی موت کی وجہ بن سکتی۔ جس شخص نے بھی اس پر جنسی تشدد کیا تھا وہی درحقیقت اس کی موت کا ذمے دار تھا یا بہ الفاظ دیگر اس کا قاتل تھا۔ شاداں کے طبی معائنے اور لیبارٹری ٹیسٹ کے مطابق اسے وقوعے کی رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان بے آبرو کیا گیا تھا اور اس گہرے صدمے سے نڈھال ہو کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں شاداں کی موت کا وقت پانچ اور چھ بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔ بالوں کے کیمیائی تجزیئے کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ ٹکٹ بابو فدا حسین کے

کوارٹر سے ملنے والے زنانہ بال شاداں ہی کے تھے۔ ان شواہد کی روشنی میں فدا حسین کی ذات پوری طرح مشکوک ہو چکی تھی۔

ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی تھی اور وہ یہ کہ مقتولہ شاداں کو بے ہوشی کی حالت میں جھاڑیوں میں پایا جانا چاہیے تھا جب کہ وہ دریا کے کنارے پڑی ہوئی ملی تھی۔ اس سوال کا تسلی بخش جواب فدا حسین ہی دے سکتا تھا۔

مقتولہ کی ماں کا پتا مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے اگلے روز حوالدار کرم داد کو موضع محراب پور روانہ کر دیا تا کہ وہ شاداں کی ماں کو اس سانحے کی اطلاع دے سکے اور لاش کی وصولی کے لیے وہ اس کے وارثوں میں سے کسی کو ساتھ لا سکے۔

اسی شام اے ایس آئی صابر حسین ہمارے مطلوبہ مشکوک بندے کو اپنے ساتھ لے آیا۔ فدا حسین بہت بوکھلایا ہوا تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چھبیس اور ستائیس سال کے درمیان لگایا۔ وہ ایک صحت مند اور خوب صورت جوان تھا۔ اس کے چہرے سے مکاری یا عیاری ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک شریف انسان نظر آتا تھا لیکن میں اس وقت اسے کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے خلاف میرے پاس اتنا مواد جمع ہو چکا تھا کہ میں اسے اس کے ظاہری تاثر کی بنیاد پر نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

وہ میرے سامنے کھڑا پریشان نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا ”فدا حسین! اگر تم میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو یہیں بیٹھے نظر آؤ گے۔ بہ صورت دیگر پہلے میں تمہیں کھڑا کر دوں گا اور اس کے بعد چھت سے الٹا لٹکا دوں گا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا‘ یہ سب ہو کیا رہا ہے؟“ وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے اسے اس کی گرفتاری کے پس منظر سے آگاہ کیا پھر پوچھا ”سچ سچ بتاؤ‘ اس رات کیا واقعہ پیش آیا تھا؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!“

میں نے فدا حسین کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک ہٹے کٹے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے کالر سے کھینچ کر فدا حسین کو الف سیدھا کھڑا کر دیا۔

”تو اس کا مطلب ہے‘ تمہیں عزت راس نہیں آئی“ میں نے کڑک کر کہا ”اب تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کے تم مستحق ہو۔“

وہ کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں نے کیا جرم کیا ہے جو آپ مجھے گرفتار کر کے یہاں لے آئے ہیں؟“

ہیڈ کانسٹیبل نے اس کی گردن پر ایک زوردار جھانپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”اوئے‘ ملک صاحب سے سوال کرتا ہے۔ جانتا نہیں ہے‘ وہ وڈے تھانے دار ہیں۔“

میں نے پوچھا ”فدا حسین! تم نے شاداں کو برباد کرنے کے بعد اسے کیوں قتل کیا۔ کیا دشمنی تھی تمہاری اس سے؟“

”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا جناب!“ وہ رونی صورت بنا کر بولا۔ ”میں تو کسی شاداں کو جانتا بھی نہیں۔“

”اوئے بہن کے یار‘ تم شاداں کو نہیں جانتے“ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کی کمر پر ایک زوردار لات جمائی ”جس کو پلیٹ فارم سے گھیر کر لائے تھے وہ تمہاری کیا لگتی تھی؟“

فدا حسین نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا لیکن بظاہر مضبوط لہجے میں بولا ”آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ کوئی لڑکی میرے کوارٹر میں آئی تھی۔ آپ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔“

”اب تم ہمیں قانون سکھاؤ گے باگڑ بلے کی اولاد“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ”یہ ہے تمہاری ماں کا خصم ثبوت۔ لو‘ دیکھو۔“

میں نے اس کے سامنے میز پر‘ شاداں کی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور اس کی گٹھڑی سے برآمد ہونے والی اشیا مع جھاڑیوں سے ملنے والا دوپٹا اور سینڈل رکھتے ہوئے خوں خوار لہجے میں استفسار کیا ”ان چیزوں کو پہچانتے ہو؟“

وہ لرزیدہ لہجے میں بولا ”آپ کو یہ سب کچھ کہاں سے ملا؟“

”اوئے سؤر کے تخم‘ پھر سوال کرتا ہے!“ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”ہم نے یہ چیزیں تمہارے کوارٹر سے برآمد کی ہیں اور...... وہاں سے برآمد کی ہیں جہاں تو مقتولہ شاداں کی عزت خراب کر رہا تھا۔“

وہ تھر تھر کانپنے لگا ”جناب‘ آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہے اور نہ ہی کسی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اپنی بے گناہی کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ یقینی طور پر آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

"اوئے غلط فہمی کے گھوڑے!" میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ "شرافت سے اپنے جرم کا اقرار کرلو ورنہ ہمیں زبان کھلوانے کے ایک سو ایک طریقے آتے ہیں۔"

"ملک صاحب! آپ اس گور بجو کو میرے حوالے کریں" ہیڈ کانسٹیبل نے فدا حسین کو کڑے تیوروں سے گھورا "میں دو منٹ میں اس کا باجا بجا دوں گا' پھر یہ کسی ریکارڈر کی طرح بجنے لگے گا۔"

"کیا خیال ہے فدا حسین؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "مجھ سے تعاون کرنے کو تیار ہو یا تمہیں ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دوں؟"

فدا حسین کی سمجھ میں یہ بات تو آ گئی تھی کہ اس کی جان چھوٹنا ممکن نہیں تھا۔ وہ باری باری مجھے اور ہیڈ کانسٹیبل کو سراسیمہ نظروں سے دیکھنے کے بعد بولا "جناب! اگر میں آپ کو سچ سچ سب کچھ بتا دوں تو آپ مجھے معاف کر دیں گے نا؟"

"میں مجرموں سے ایسا وعدہ نہیں کرتا" میں نے سخت لہجے میں کہا "پہلے تم اپنا سچ اگلو۔ اس کو سننے کے بعد میں کوئی فیصلہ کروں گا۔"

"جناب! ایک بات کا تو آپ پکا یقین کر لیں کہ میں نے شاداں کو قتل نہیں کیا۔ بس میں و......"

"ہاں ہاں' بولو......" میں نے کہا "میں تمہاری بات پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ میں جھوٹ نہیں سنوں گا۔ میں اس بات کی تصدیق کر چکا ہوں کہ ویٹنگ روم سے تم مقتولہ شاداں کو بہلا پھسلا کر اپنے کوارٹر میں لائے تھے۔"

"جی ہاں تھانے دار صاحب!" وہ تعاون پر آمادہ نظر آنے لگا "بے شک مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی۔"

میں نے پوچھا "وہ کتنی دیر تمہارے کوارٹر میں رکی تھی؟"

"وہ تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی تھی۔"

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔ اس نے لاتوں اور گھونسوں سے فدا حسین کی ٹھکائی شروع کر دی۔ جب فدا حسین کا حال بے حال ہو گیا تو میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو ہاتھ روکنے کا اشارہ کیا۔ وہ رک گیا۔

فدا حسین بری طرح ہانپ رہا تھا اور اس کی ناک و منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا تھا نا' اب میں جھوٹ نہیں سنوں گا؟"

اس کی حالت خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے پھٹے ہوئے ہونٹ سے بہنے والے خون کو آستین سے صاف کیا اور شکستہ لہجے میں بولا "مائی باپ' مجھے معاف کر دیں۔ میری سات نسلوں کو توبہ' اب میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

میں نے کہا "یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا پھر بولا "آپ اپنے سپاہی کو باہر بھیج دیں۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگ رہا ہے" اس نے دہشت ناک نظروں سے ہیڈ کانسٹیبل کی جانب دیکھا جس نے تھوڑی دیر پہلے اس کی اچھی خاصی دھنائی کی تھی۔

میں نے کہا "اگر تم نے سچ بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر اس کی ضرورت نہیں پڑے گی' پھر میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چلا جائے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اک اچٹتی سی نگا فدا حسین پر ڈالی اور لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں فدا حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ہاں بھئی فدا حسین! تم شاداں کو اپنے کوارٹر میں کیوں لے کر آئے تھے؟"

وہ بولا "میں نے پھیری لگانے والے موجو کو شاداں سے بات چیت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شاداں کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ یا تو وہ گھر سے بھاگی ہوئی کوئی لڑکی ہے یا پھر اپنے ساتھی مسافر سے بچھڑ گئی ہے۔ میں نے موجو سے اس کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ وہ لڑکی موجو کے ہاتھ کوئی لفافہ کہیں بھجوانا چاہتی ہے۔"

"اور تم نے وہ لفاہ پہنچانے کا فیصلہ کر لیا؟" وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے سوال داغ دیا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "آپ یقین کریں تھانے دار صاحب! میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا میں واقعی اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔"

"اور پھر تم اس کے پاس ویٹنگ روم میں پہنچ گئے؟"

"جی ہاں" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اور وہاں پہنچ کر مجھے اس لڑکی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔"

"کیا پہلی ہی ملاقات میں اس نے تمہیں اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا؟"

وہ بولا "میں اس کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی مصیبت زدہ لڑکی ہے۔ میں نے اسے تھوڑا سا کریدا تو میرا اندازہ درست ثابت ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ صبح اس کا لفافہ ڈاک

میں ڈال دوں گا یا اگر وہ کہے گی تو خود جا کر محراب پور پہنچا دوں گا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں' محراب پور یہاں سے کون سا زیادہ دور ہے۔ میں اپنی سائیکل پر آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ یوں رات کے وقت ویٹنگ روم میں بیٹھے رہنا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ وہ کسی مجبوری کے تحت اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی ورنہ اسے جانا تو آگے تھا۔ میں نے کہا' اب تو کوئی ٹرین صبح ہی اس اسٹیشن پر آئے گی۔ اگر وہ چاہے تو میرے کوارٹر میں رات بسر کر لے۔ وہ میری تجویز پر پس و پیش کرنے لگی۔ میں نے قسم کھا کر اسے یقین دلایا کہ وہ میری چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ اسے میرے کوارٹر میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد وہ میرے ساتھ چلنے پر رضا مند ہوگئی۔ دلوں کے حال اللہ جانتا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں اس کے لیے کسی قسم کی کوئی برائی نہیں تھی۔''

فدا حسین کا طویل وضاحتی بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا ''اس کے بعد تم شاداں کو اپنے کوارٹر میں لے آئے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا' میں نے سوال کیا ''فدا حسین! تم چھڑے چھانٹ ہو۔ اپنے کوارٹر میں تنہا رہتے ہو۔ اس کے باوجود بھی تم ایک جوان اور نامحرم لڑکی کو رات گزارنے کے لیے اپنے کوارٹر میں لے آئے۔ کیا تم نے یہ نہیں سن رکھا کہ جب مرد اور عورت کہیں تنہا ہوں تو ان کے درمیان شیطان آ جاتا ہے جو انہیں بہکانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا ''سن تو رکھا تھا لیکن میں چونکہ اسے چھوٹی بہن بنا کر لایا تھا اس لیے اطمینان تھا کہ شیطان میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن۔''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سر جھکا دیا۔ میں سمجھا کہ اب وہ اپنے جرم کا اقرار کرنے والا ہے۔ یہ لمحات بڑے سنسنی خیز تھے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فدا حسین نے سر اٹھایا۔ میں نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا۔

''واقعی کسی نے سچ ہی کہا ہے' نامحرم عورت اور مرد کو تنہائی میں اکٹھا نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے درمیان بھی اس رات شیطان آ گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے اس نے میری عزت رکھ لی۔ اس سے پہلے کہ میں شیطان کا آلہ کار بن جاتا' دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے فدا حسین کی جانب دیکھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''میں نے شاداں کو اپنے کوارٹر کے اندرونی کمرے میں

سونے کے لیے چھوڑ دیا تھا جب کہ میں خود بیرونی کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گیا تھا لیکن اس رات میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ میں مسلسل جاگ رہا تھا اور بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ کوئی ساڑھے گیارہ بجے رات مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں آپ سے باہر ہوگیا ہوں۔ مجھے چاروں جانب شاداں کا سراپا نظر آ رہا تھا اور دل میں ایک ہی خواہش مچل رہی تھی کہ پہلی فرصت میں اسے حاصل کر لوں۔ پتا نہیں' میری ایسی حالت کیوں ہوگئی تھی۔ اب سوچتا ہوں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ شیطان نے میرے حواس پر قبضہ جما لیا تھا۔ میں بار بار اپنے ذہن میں ابھرنے والے منفی خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے ایسا کرنے میں کامیابی نہیں حاصل ہو رہی تھی۔ میں نے خود کو لعنت ملامت بھی کی کہ میں شاداں کو چھوٹی بہن بنا کر اپنے کوارٹر میں لایا ہوں اس لیے مجھے اس کے بارے میں ایسے بے ہودہ جذبات نہیں رکھنا چاہئیں لیکن میرا ذہن اس وقت کوئی دلیل' کوئی نصیحت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ شیطان میرے دل و دماغ پر قابض تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ہم صرف ایک عورت اور مرد ہیں۔ اس کے سوا ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ آخر کار میں شیطان کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنے بستر سے اٹھا اور اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔''

''اور تم نے شاداں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی؟''

''ہاں'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''میں نے کوشش تو یہی کی تھی لیکن میرے خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس نے میری عزت رکھ لی۔''

میں نے پوچھا ''تم نے دروازے پر کسی دستک کا ذکر کیا تھا؟''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں'' وہ سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''میں نے اندرونی کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹی ہوئی شاداں کو اپنی بانہوں میں دبوچنا چاہا۔ وہ اس وقت کچی نیند میں تھی' ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

''بھائی!'' اس کے ہونٹ لرزا اٹھے ''یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟''

اس وقت مجھ پر شیطان پوری طرح سوار تھا' میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اسے اپنی آغوش میں بھرنے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر بستر سے نیچے اتر آئی۔

میں نے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنی جانب کھینچا تو اس کی کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سسکی خارج ہوئی مگر میرے حواس پر شیطان حاوی ہو چکا تھا اور مجھے کچھ بجھائی نہیں دے رہا تھا' سوائے اس کے کہ میں شاداں کو حاصل کر کے اپنے اندر لگی

ہوئی آگ کو بجھا لوں۔ وہ اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ اسی کوشش کے دوران میں وہ ایک مرتبہ کمرے کے فرش پر گر بھی گئی۔

یہی وقت تھا جب مجھے بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا' پھر مجھے ہوش آ گیا جیسے ہی میرے حواس بجا ہوئے' میں شاداں کو وہیں فرش پر چھوڑ کر بیرونی دروازے پر آیا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

باہر سے آواز آئی ''میں شاداں کا گھر والا ہوں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر گھر سے چلی آئی ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اس کوارٹر میں ہے۔ اسے باہر بھیج دو یا مجھے اندر آنے دو۔ میں خود اسے منا کر واپس لے جاؤں گا۔''

میں نے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام عارف علی ہے۔''

میں تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ میرے ذہن میں ایک خیال تو یہ آیا کہ میں شاداں کی وہاں موجودگی ہی سے انکار کر دوں۔ اس کے شوہر سے کہہ دوں کہ یہاں کوئی شاداں واداں نہیں ہے لیکن پھر مجھے میرے ضمیر نے ملامت کی۔ میں اپنے آپ ہی سے الجھ رہا تھا کہ باہر سے شاداں کے شوہر نے کہا۔

''بہتر ہو گا کہ تم مجھے اندر آنے دو۔ وہ مجھ سے بری طرح ناراض ہے اس لیے باہر نہیں آئے گی۔ میں خود اسے منانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں نے کہا ''تم باہر ہی ٹھہرو۔ میں اسے بلاتا ہوں۔''

میں نے اندر آ کر شاداں سے اس کے شوہر کی آمد کا ذکر کیا۔ مارے ندامت کے میں اس کی طرف پیٹھ پھیرے کھڑا تھا۔ اس نے صرف ایک سوال کیا اور وہ بھی سپاٹ لہجے میں۔

''کیا عارف علی اکیلا آیا ہے؟''

میں نے کہا ''میں نے دیکھا نہیں۔ وہ باہر گلی میں کھڑا ہے۔ تم خود معلوم کر لو۔''

اس نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا اور بیرونی دروازے پر پہنچ کر باہر کھڑے ہوئے عارف علی سے باتیں کرنے لگی۔ مجھے اپنی حرکتوں پر اس قدر شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا کہ میں اندرونی کمرے کے دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ اس وقت میں چونک پڑا جب شاداں دروازہ کھول کر

کوارٹر سے باہر نکل گئی۔

میں پتھر کا بت بنا کافی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے سکتہ ہو گیا ہو۔ جب میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے اپنے حالات پر غور کیا۔ مجھ سے جو حرکت سرزد ہوئی تھی اس کے بارے میں سوچ سوچ کر میں زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ شاداں وہاں سے جا چکی تھی۔ وہ لڑکی جسے میں نے اپنی چھوٹی بہن بنایا تھا' مجھ سے میری زیادتی کا گلہ شکوہ کیے بغیر اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی۔

وہ پوری رات میں نے جاگتے ہوئے' پشیمانی کے آنسو بہاتے ہوئے گزار دی۔ صبح ہونے سے پہلے ہی میں تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی بکنگ کلرک سے اپنی ماں کی خرابی طبیعت کا بہانہ کیا اور فی الفور اپنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں کچھ دیر اور یہاں رک گیا تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔''

فدا حسین اپنی صفائی پیش کر چکا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھل کر تروتازہ ہو چکا تھا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنے بیان میں جھوٹ کی ملاوٹ نہیں کی ہو گی۔ میں اس کی طرف سے خاصی حد تک مطمئن ہو گیا تھا لیکن میں نے اپنا اطمینان اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور پوچھا۔

''فدا حسین! کیا تم شاداں کے شوہر عارف علی کو دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں سر ہلایا ''میں نے تو اس کی صورت ہی نہیں دیکھی تھی۔''

''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے'' میں نے سوال کیا ''شاداں نے عارف علی کے ساتھ جانے سے پہلے کسی قسم کی گفتگو کی تھی؟''

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ شاداں کے خط سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے شوہر کی اصلیت سے واقف ہو چکی تھی۔ ایسی صورت میں وہ ایک دلال شوہر کے ساتھ جانے کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا یا تو عارف علی نے اسے اپنی باتوں سے رام کر لیا تھا یا پھر وہ فدا حسین کے رویے کے باعث جلد از جلد اس کوارٹر سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس کی ایک جانب کنواں تھا اور دوسری طرف کھائی۔ شاید اس نے کھائی میں گرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

فدا حسین نے جواب دیا ''جناب! اس وقت میری وہ حالت ہو رہی تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نہیں جانتا' ان دونوں میاں بیوی کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟''

''کیا تم نے شاداں کے جانے کے بعد باہر نکل کر یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ دونوں کس طرف گئے تھے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے بتایا ''اس وقت میری سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔''

میں نے اسے شاداں کو جھاڑیوں میں پیش آنے والے واقع اور اس کی موت کے بارے میں بتایا اور کہا ''فدا حسین! اگر چہ تم نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے لیکن میں تمہارے بیان کی تصدیق کئے بغیر تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ تمہیں کچھ روز تک ہمارا ''مہمان'' رہنا ہوگا۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے'' وہ مفاہمانہ انداز میں بولا ''شاید اسی طرح میرے ضمیر میں چبھی ہوئی پھانس نکل سکے۔ کچھ نہ کچھ سزا تو مجھے ملنا ہی چاہیے۔ میں بہ خوشی حوالات میں رہنے کو تیار ہوں۔''

اسی وقت ایک کانسٹیبل نے آ کر اطلاع دی کہ حوالدار کرم داد محراب پور سے واپس آ گیا ہے۔ میں نے اسے فوری طور پر اندر کمرے میں بلا لیا۔ کرم داد کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت اور ایک ضعیف شخص بھی تھا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت یقینی طور پر مقتولہ شاداں کی ماں تھی جو اپنی بیٹی کی موت پر گریہ زاری کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والا ضعیف شخص خاموش اور سنجیدہ تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام خدا بخش تھا اور وہ شاداں کا خالو تھا جب کہ شاداں کی ماں کا نام ظہور بی بی تھا۔

میں نے فدا حسین کو حوالدار کرم داد کے حوالے کیا اور خاص طور پر تاکید کر دی کہ اس کے آرام کا خیال رکھا جائے۔ حوالدار، فدا حسین کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا تو میں مقتولہ شاداں کی ماں ظہور بی بی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

شاداں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ میں نے مختصر طور پر ظہور بی بی اور خدا بخش کے گوش گزار کیا پھر میں نے شاداں کا خط پڑھ کر انہیں سنایا۔ پوری تفصیل سننے کے بعد ظہور بی بی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اس نے زار و قطار روتے ہوئے، آہوں، سسکیوں اور ہچکیوں کے درمیان مجھے جو معلومات بہم پہنچائیں، میں ان کا خلاصہ یہاں تحریر کر رہا ہوں۔ تا کہ آپ اس کیس کو بہ آسانی سمجھ سکیں۔

☆☆☆

شاداں کا تعلق کنگن وال کے ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ ماسٹر فیروز دین گاؤں کے اسکول میں پڑھاتا تھا۔ شاداں فیروز دین اور ظہور بی بی کی اکلوتی اولاد تھی لیکن وہ اس قدر خوب صورت و حسین و جمیل تھی کہ پورے گاؤں میں اس کے جمال کا چرچا تھا۔

شاداں نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو ماسٹر فیروز دین نے گاؤں ہی کے ایک گبرو جوان لیاقت محمود سے اس کا رشتہ طے کر دیا تا کہ دوسروں کے منہ بند ہو جائیں۔ شاداں خود بھی لیاقت محمود کو دل و جان سے پسند کرتی تھی۔ اس منگنی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گاؤں کے چوہدری وڈے میاں فضل حسین کے اکلوتے اوباش ''فرزند ارجمند'' میاں خلیل کی نظر شاداں پر پڑ گئی اور وہ اس کے حسن کا دیوانہ ہو گیا۔ وڈے میاں خود بھی کچھ کم نہیں تھا لیکن جب سے اسے فالج ہوا تھا، میاں خلیل نے من مانی شروع کر دی تھی۔ وہ کنگن وال کا مستقبل کا چوہدری تھا اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اپنے باپ سے بھی دو چار ہاتھ آگے کی چیز تھا۔

شاداں کی ایک جھلک نے میاں خلیل کو بے خود کر دیا تھا۔ وہ ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے۔ ممکن ہے، میاں خلیل نے اسے پہلے بھی کئی بار دیکھا ہو بلکہ یقینی طور پر دیکھا ہوگا لیکن وہ کہتے ہیں نا، ہر کام کو ایک کا خاص وقت مقرر ہوتا ہے۔ قصہ مختصر، میاں خلیل ایک روز شاداں کے باپ فیروز دین سے ملا۔ فیروز دین اس وقت اسکول سے نکل کر گھر کی جانب آ رہا تھا۔

میاں خلیل نے ماسٹر فیروز دین کو سلام کیا اور کہا ''ماسٹر جی! آپ سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ امید ہے، آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔''

ماسٹر فیروز، میاں خلیل کے کردار اور کرتوتوں سے اچھی طرح آگاہ تھا اور وہ اس کی چوہدرانہ قوت سے بھی واقف تھا لہٰذا نرم لہجے میں اس نے پوچھا۔

''چوہدری صاحب! آپ کو مجھ غریب سے ایسا کیا کام پڑ گیا ہے؟''

''ماسٹر جی!'' میاں خلیل نے اپنے مزاج کے خلاف معتدل لہجے میں کہا ''دراصل مجھے آپ کی بیٹی شاداں پسند آ گئی ہے۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ماسٹر فیروز کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ میاں خلیل کی خودسری سے واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ بھی تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ ماسٹر نے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔ ''میاں صاحب! آپ تو ماشاءاللہ خیر سے شادی شدہ ہیں اور آپ کے دو بچے بھی ہیں۔''

''اسلام میں چار شادیوں کی گنجائش ہے۔'' میاں خلیل نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''میری تو صرف ایک ہی بیوی ہے''

''لیکن......'' الفاظ ماسٹر فیروز دین کے حلق میں اٹک رہے تھے۔

''لیکن کیا ماسٹر جی! ذرا کھل کر بولیں۔''

''میں شاداں کا رشتہ طے کر چکا ہوں۔'' فیروز دین نے کہا۔

''رشتہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔''

''نہیں'' فیروز دین نے نفی میں گردن کو جھٹکا دیا ''میں زبان دے چکا ہوں۔ اب یہ رشتہ نہیں ٹوٹے گا۔''

میاں خلیل کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے وہ اندرونی غصے کے ضبط کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ پھنکارتے ہوئے بولا ''اچھی طرح سوچ لو ماسٹر جی۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔''

ماسٹر فیروز نے ہمت کر کے کہا ''چوہدری صاحب! آپ مجھ پر رحم کریں۔''

''میں تو آپ کو اپنا سسر بنانے کی بات کر رہا ہوں'' میاں خلیل طنزیہ لہجے میں بولا ''اور آپ مجھ سے رحم کی بھیک مانگ رہے ہیں۔''

ماسٹر فیروز دین نے کہا۔ ''آپ اسے بھیک سمجھ کر ہی مجھے دے دیں۔ شاداں کا خیال دل سے نکال دیں۔ اب وہ کسی اور سے منسوب ہو چکی ہے۔''

''جو چیز ہمارے دل میں سما جاتی ہے ماسٹر' ہم اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتے ہیں میاں خلیل تمام لحاظ و مروت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے لوفرانہ انداز میں بولا۔

ماسٹر قدرے نرم لہجے میں بولا ''شاداں کوئی چیز نہیں ہے چھوٹے چوہدری صاحب! وہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے اور اس کی ایک جیتے جاگتے انسان سے منگنی ہو چکی ہے۔''

''اور یہ منگنی ٹوٹ بھی نہیں سکتی؟'' میاں خلیل نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''جی کچھ ایسی ہی صورت حال ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے'' میاں خلیل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''اگر یہ منگنی نہیں ٹوٹ سکتی تو پھر شاداں کے منگیتر کو ٹوٹنا پڑے گا۔''

میاں خلیل یہ دھمکی دے کر چلا گیا ور ماسٹر فیروز دین اپنے ذہن میں فکروں اور اندیشوں کو بسا کر گھر آ گیا۔ وہ اتنا زیادہ پریشان ہو گیا تھا کہ رات بھر سو بھی نہ سکا۔ دوسری صبح اس کے ذہن میں پلنے والے خدشات نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ بیری والے کھوہ کے نزدیک لیاقت محمود کی کٹی پھٹی لاش پائی گئی تھی۔ اسے کلہاڑیوں کے وار کر کے بڑی بے دردی سے ہلاک کیا گیا تھا۔

ماسٹر بخوبی جانتا تھا کہ اس قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔

شاداں رخصتی سے پہلے ہی اجڑ کر رہ گئی تھی۔

چند روز بعد میاں خلیل بہ نفس نفیس، ماسٹر فیروز دین کے گھر آیا اور افسوناک لہجے میں بولا ماسٹر جی' مجھے لیاقت کی موت کا بڑا دکھ ہے لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔''

وہ بظاہر ماسٹر فیروز دین کے پاس تعزیت کے لیے آیا تھا لیکن درحقیقت وہ اس کے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا۔ ماسٹر فیروز دین نے دل شکستہ لہجے میں کہا ''ہاں چوہدری صاحب شاید خدا کو یوں ہی منظور تھا۔''

میاں خلیل فی الفور مطلب پر آ گیا۔ ''اب کیا ارادہ ہے ماسٹر جی؟''

ماسٹر فیروز دین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا' میاں خلیل نے بھونڈے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ''اب تو شاداں کی نسبت ختم ہو گئی ہے۔ آپ کے پاس کوئی اور اعتراض تو نہیں ہو گا۔''

ماسٹر فیروز دین نے فی الحال اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا ''میں سوچ کر جواب دوں گا۔''

درحقیقت اس نے میاں خلیل کو وقتی طور پر ٹال دیا تھا۔

میاں خلیل چلا گیا تو ماسٹر کی بیوی ظہور بی بی اس کے پیچھے پڑ گئی کہ چوہدری ان کے گھر کیوں آیا تھا۔ شاداں اس وقت گھر میں موجود نہیں تھی۔ ماسٹر فیروز دین نے اپنی بیوی کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''اب کیا ہو گا شاداں کے ابا!'' وہ فکر مندی سے بولی۔

''جو خدا کو منظور ہو گا' وہی ہو گا۔'' ماسٹر فیروز دین نے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا'' ویسے مجھے چھوٹے چوہدری کے ارادے ٹھیک دکھائی نہیں دیتے' رب خیر کرے۔''

دونوں میاں بیوی دیر تک سر جوڑے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف رہے لیکن امید کی کوئی کرن دکھائی نہ دی۔

اب میاں خلیل نے آئے روز ماسٹر فیروز دین کے گھر کے پھیرے بھرنا شروع کر دیے۔ ایک دن ماسٹر کی ہمت جواب دے گئی اور اس نے صاف صاف کہہ دیا ''میاں جی! میں کسی بھی صورت شاداں کا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ آپ یہ روز کی آمد و رفت بند کر دیں۔''

میاں خلیل کا چہرہ غضب ناک ہو گیا۔ وہ آپ سے تم پر اتر آیا'' تو اس کا مطلب ہے' تم اس رشتے سے انکار کر رہے ہو؟''

''میری جانب سے چٹا جواب ہی سمجھیں۔''

''ماسٹر! تم چھوٹے آدمی ہو'' میاں خلیل نے حقارت آمیز انداز میں کہا'' اور چھوٹے آدمی کو عزت راس نہیں آتی۔ میں تو تمہاری بیٹی کو اپنی عزت بنانا چاہتا تھا لیکن لگتا ہے' بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔''

ماسٹر فیروز دین نے بے خوفی سے کہا'' میں تمہاری ہوس کاریوں سے واقف ہوں میاں خلیل' اس لیے تمہارے جھانسے میں نہیں آ سکتا۔ تم مجھے عزت نہیں دے رہے بلکہ میری عزت کا جنازہ نکالنے کا پروگرام بنا رہے ہو۔''

میاں خلیل کو حیرت تھی کہ ماسٹر اتنا باہمت کیسے ہو گیا تھا۔ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا'' جو لڑکی مجھے پسند آ جاتی ہے' میں اسے ہر حال میں حاصل کر کے چھوڑتا ہوں۔ تم بخوبی جانتے ہو' میں شاداں کو اٹھوا بھی سکتا ہوں۔''

''تم میری لاش کے اوپر سے گزر کر ہی شاداں تک پہنچو گے میاں خلیل!'' ماسٹر فیروز دین نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ضرورت پڑی تو تمہاری لاش بھی گرا دوں گا۔'' میاں خلیل نے تیز لہجے میں کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ماسٹر فیروز دین کی لاش کھیتوں میں پڑی ملی تھی۔ اسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ آیا یہ ایک اتفاق تھا یا ماسٹر فیروز دین کی موت میں کسی طرح بھی میاں خلیل کا ہاتھ شامل تھا۔

ماسٹر فیروز دین کے تجہیز و تکفین کے بعد میاں خلیل نے شاداں کی ماں ظہور بی بی کو شیشے میں اتارنا شروع کیا۔ ظہور بی بی نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے میاں خلیل سے کہا کہ وہ ماسٹر کے چہلم کے بعد اس سے اس سلسلے میں کوئی بات کرے گی۔ میاں خلیل وقتی طور پر ٹل گیا۔ ظہور بی بی نے حوصلہ افزا انداز میں میاں خلیل سے بات کی تھی اور وہ بھی مطمئن ہو گیا تھا۔

ظہور بی بی درحقیقت کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی اور جیسے ہی اسے موقع ملا' وہ شاداں کو ساتھ لے کر اپنی بہن فضیلت بیگم کے پاس محراب پور چلی آئی۔ خدا بخش اور فضیلت بیگم کو جب

حقیقت حال کا علم ہوا تو انہیں ظہور بی بی اور شاداں کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے انہیں مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لیا۔ جب کچھ عرصہ امن وامان سے گزر گیا تو شاداں کی شادی نہایت سادگی کے ساتھ محراب پور کے ایک نوجوان عارف علی سے کر دی۔ عارف علی خدا بخش کے پڑوس میں رہتا تھا اور شاداں سے شادی کا خواہاں تھا۔ وہ تن تنہا رہتا تھا اور خدا بخش کی نظر میں وہ ایک اچھا لڑکا تھا ازاں بعد عارف علی شادی کے چند روز بعد شاداں کو دوسرے گاؤں لے گیا تھا۔ اس نے کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شاداں کو لے کر کنگن وال جا رہا تھا۔

اس کے بعد کے واقعات شاداں کے خط سے معلوم ہو گئے تھے لیکن پھر بھی اس کیس کی چند بڑی کڑیاں ابھی میری دسترس سے دور تھیں۔ شاداں کی لاش کو خدا بخش اور ظہور بی بی کے سپرد کر دیا گیا تھا جسے وہ اسی روز اپنے ساتھ محراب پور لے گئے تھے۔

میں نے دوسرے روز علاقہ ایس پی سے ملاقات کی اور اسے بالتفصیل صورت حال سے آگاہ کیا۔ ایس پی نے میری اب تک کی کارکردگی کو سراہا اور ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ اسی روز میں نے عدالت سے عارف علی کے وارنٹ گرفتاری حاصل کر لیے۔ فدا حسین کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ شاداں وقوعے کی رات عارف علی کے ساتھ گئی تھی۔ اگر عارف علی میری گرفت میں آ جاتا اور میں اس پر کچھ محنت کرتا تو شاداں کے قتل اور اس کی بربادی کا عقدہ حل ہو سکتا تھا۔ ویسے فدا حسین میرے دائرہ شک سے قریب قریب نکل ہی چکا تھا۔

اب عارف علی میرا خصوصی ٹارگٹ تھا۔ اسی روز میں اس کی گرفتاری کے لیے کنگن وال روانہ ہو گیا۔ کنگن وال میرے تھانے سے ایک دن کی مسافت پر تھا۔

☆☆☆

عارف علی کو میں نے بہ آسانی تلاش کر لیا تھا۔ وہ کنگن وال ہی میں موجود تھا تاہم اس کی گرفتاری میں میاں خلیل نے خاصی رکاوٹ ڈالی تھی۔ میں نے حقیقت حال کو خفیہ رکھتے ہوئے میاں خلیل سے کہا تھا کہ بس معمول کی پوچھ گچھ کے لیے میں عارف کوچوان کو تھانے لے جا رہا ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ یہ تانگے چوری کر کے دوسرے شہروں میں بیچتا ہے۔

میاں خلیل بھاری تن و توش کا مالک ایک بدمعاش صورت شخص تھا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں اور روایتی چوہدریوں کی طرح خاصا رعب داب والا لگتا تھا۔ وہ ایک آوارہ صورت اور مغرور انسان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے عارف علی کو تسلی دی کہ وہ کسی قسم کی فکر نہ کرے۔

اگر اسکے ساتھ کوئی زیادتی کی گئی تو وہ عدالت سے رجوع کرے گا۔

میں عارف علی کو لے کر دوسرے روز تھانے پہنچا اور اسے حوالات میں ڈال دیا۔ اس وقت رات ہو چکی تھی۔ میں دوسری صبح اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔

دوسری صبح میں تھانے پہنچا تو عارف علی کو اپنی گرفتاری کی وجہ معلوم ہو چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تو وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اسے نظروں میں تولتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

"کنجر کی اولاد! ہمیں تمہارے سارے کرتوتوں کا پتا چل گیا ہے۔ اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنی زبان سے اپنے ہر جرم کا اقرار کرلو۔"

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میں نے ایک خوفناک صورت حولدار کو اپنے کمرے میں بلایا اور اسے حکم دیا "اس ماں کے یار نے منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں۔ میں چاہتا ہوں یہ بولے اور فرفر بولے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب!" حوالدار نے عارف علی کو یوں دیکھا جیسے قسائی بکرے کو دیکھتا ہے "میرے علاج سے تو گونگے بھی بولنے لگتے ہیں۔ اس کی ساری گھنگھنیاں تو میں دو منٹ میں نکال دوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ٹرائل روم کی طرف سے عارف کے بلبلانے کی آوازیں آنے لگیں پھر اس نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ ہم پولیس والے بے جا تشدد کے لیے خاصے بدنام ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم عام طور پر بجا سختی کرتے ہیں۔ صبح و شام ہمارا مجرموں سے واسطہ رہتا ہے اور یہ لوگ سیدھے سادے شریف انسان نہیں ہوتے کہ ہم جو پوچھیں، اس کا فوری طور پر ٹھیک ٹھیک جواب دے دیں۔ ان کی زبان کھلوانے کے لیے ہمیشہ ان کی تھوڑی بہت "خاطر تواضع" کرنا پڑتی ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد عارف علی جلاد صورت حوالدار کی زیر نگرانی میرے کمرے میں آیا۔ پہلی ہی نظر میں، میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔ حوالدار کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یس ملک صاحب، بندہ تعاون کے لیے تیار ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا تم نے اس کے منہ کی گھنگھنیاں نکال دیں؟"

"بالکل جناب!" وہ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "میں تو اس کا اور بھی بہت

کچھ نکلنے والا تھا لیکن یہ جلد ہی راہ راست پر آ گیا۔ اب آپ پوچھ لیں جو پوچھنا ہے۔"

میں نے حوالدار کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور عارف علی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اچانک میرے قدموں میں گر کر گڑگڑانے لگا "تھانے دار صاحب! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں بالکل ہی بےقصور ہوں لیکن آپ اتنا یقین کر لیں کہ میں نے شاداں کو قتل نہیں کیا۔"

"پھر شاداں کا قاتل کون ہے۔"

"میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ وعدہ کریں کہ مجھے جیل جانے سے بچا لیں گے۔"

"میں مجرموں سے اس قسم کے وعدے نہیں کرتا۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "اگر تم نے کوئی خطا کی ہے تو تمہیں اس کی سزا بھی ضرور ملے گی۔ البتہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے تمام واقعات کی تفصیل مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دی تو میں تم پر ہلکی دفعہ لگاؤں گا اور تمہاری سزا کو کم سے کم کروانے کی کوشش کروں گا۔"

"یعنی آپ مجھے وعدہ معاف گواہ بنا لیں گے؟"

"اگر تمہاری گواہی اس کیس میں مفید ثابت ہوئی تو میں اس سلسلے میں سوچوں گا۔" میں نے کہا "لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ تم شاداں کو پیش آمدہ حالات کی وضاحت کرو۔"

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے اپنے اور میاں خلیل کا سارا کچا چٹھا کھول کر بیان کر دیا۔ عارف علی نے جو طویل بیان دیا، میں اس میں سے نہایت اہم واقعات کا یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

عارف علی، جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، محراب پور کا رہنے والا تھا اور شاداں کے خالو خدا بخش کا پڑوسی بھی تھا۔ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا اور وہ گھر میں تنہا ہی رہتا تھا۔ عارف علی دن بھر لاری اڈے سے سواریاں اٹھاتا اور محراب پور اور گردونواح کے دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتا۔ تانگا بانی ہی اس کا ذریعہ روزگار تھا۔

کچھ عرصہ قبل وہ لاری اڈے پر واقع ایک دکان سے سگریٹ خرید رہا تھا کہ دو اجنبی اشخاص اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سگریٹ کا پیکٹ لے کر اپنے تانگے کی جانب بڑھنے لگا تو ان میں سے ایک شخص نے پوچھا۔

"عارف علی تمہارا ہی نام ہے؟"

عارف علی نے کہا ''جی بندے کو ہی عارف علی کہتے ہیں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔''

''تم ہمیں کیسے پہچان سکتے ہو؟'' دوسرے شخص نے کہا ''ہم ادھر پہلی مرتبہ آئے ہیں۔''

''آئیں تانگے میں بیٹھیں'' عارف علی نے خوش دلی سے کہا ''آپ جہاں کہیں گے، میں چھوڑ دوں گا۔''

ان میں سے ایک نے کہا ''دراصل ہم تم سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ تم اس اڈے پر اکیلے تانگے والے ہو اس لیے سوچا' پہلے تم ہی سے پوچھ لیا جائے۔''

''آپ کو کس قسم کی باتیں پوچھنا ہیں'' عارف علی نے سوالیہ نظروں سے اجنبی افراد کی طرف دیکھا۔ اس وقت تک وہ باتیں کرتے ہوئے عارف علی کے تانگے کے قریب پہنچ چکے تھے۔

''ہم دو عورتوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں'' ان میں سے دراز قامت شخص سے کہا'' ایک ادھیڑ عمر عورت ہے اور دوسری اس کے ساتھ انیس بیس سال کی ایک جوان لڑکی ہے۔ دراصل ہمیں انکی تلاش ہے۔ ہوسکتا ہے' وہ تمہارے تانگے میں بیٹھ کر کہیں گئی ہوں۔ ہم نے پکا پتا چلا لیا ہے' وہ اسی لاری اڈے پر بس سے اتری تھیں۔''

عارف علی کا دھیان فی الفور اپنے پڑوسی خدا بخش کے مہمانوں کی طرف چلا گیا۔ ان اجنبی افراد نے ان عورتوں کا جو حلیہ بیان کیا تھا' خدا بخش کی مہمان عورتیں اس حلیے پر فٹ بیٹھتی تھیں لیکن سردست عارف نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

''کیوں' کچھ یاد آرہا ہے؟'' عارف علی کو خاموش دیکھ کر پستہ قد شخص نے پوچھا۔

''نن......نہیں' عارف علی نے لکنت زدہ لہجے میں غیر ارادی طور پر انکار کر دیا اور پھر پوچھا'' آپ لوگ ان عورتوں کو کیوں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں؟''

دراز قامت شخص عارف علی کی ہچکچاہٹ سے شک میں مبتلا ہوگیا۔ اس نے کہا ''یہ بڑی خطرناک عورتیں ہیں۔ انہوں نے ہمارے چوہدری صاحب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہم انہیں واپس کنگن وال لے کر جائیں گے بس ایک بار وہ ہمیں نظر آجائیں۔''

کنگن وال کے ذکر پر عارف علی کو یقین ہوگیا کہ ان افراد کو انہی عورتوں کی تلاش ہے جو خدا بخش کے گھر میں ٹھہری ہوئی تھیں کیونکہ خدا بخش نے ایک بار رواروی میں اسے بتایا تھا کہ اس کے گھر کنگن وال سے کچھ رشتے دار آئے ہوئے ہیں۔

عارف علی کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ان افراد کا شک پختہ ہونے لگا۔ دراز قد شخص نے کہا

''ہمارے چوہدری صاحب' ادھر ہی ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ جو شخص ان عورتوں کے بارے میں کوئی اطلاع دے گا' اسے اچھا خاصا انعام بھی دیا جائے گا۔''

عارف علی کے دل میں لالچ نے سر ابھارا' اس نے جلدی سے پوچھا ''آپ کے چوہدری صاحب کس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

عارف علی کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے ان افراد کو یقین ہوگیا کہ وہ ان عورتوں کے بارے میں ضرور کچھ جانتا ہوگا۔ وہ اسے اپنے ساتھ میاں خلیل کے پاس لے گئے جو لاری اڈے پر ایک ہوٹل میں موجود تھا۔ اس کے بعد کا کام میاں خلیل کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ عارف علی نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ میاں خلیل نے عارف علی سے وعدہ کیا کہ اگر وہ شاداں کو یہاں سے نکال کر کسی طرح کنگن وال پہنچا دے تو وہ اسے چار ہزار روپے اور کنگن وال میں ایک مکان رہنے کو دے گا۔

عارف علی نے پوچھا ''اور شاداں کی ماں کا کیا ہوگا؟''

''وہ یہیں رہے گی'' میاں خلیل نے کہا ''ساتھ لے جا کر ہم نے اس کا کیا اچار ڈالنا ہے۔ مجھے صرف شاداں کی ضرورت ہے۔ بولو تو میرا کام کرنے کو تیار ہو یا میں کسی اور شخص کا انتظام کروں؟''

اس کے ساتھ ہی میاں خلیل نے دو ہزار کے نوٹ گن کر عارف علی کے سامنے پھینک دیے اور بولا ''یہ ایڈوانس رکھ لو۔ باقی کے دو ہزار کنگن وال پہنچ کر ملیں گے'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''اور کنگن وال میں ایک مکان بھی تمہارا منتظر ہے۔ اگر سودا منظور ہو تو یہ رقم اٹھا لو ورنہ میں کچھ اور سوچوں۔''

اس زمانے میں دو ہزار روپے اچھی خاصی رقم ہوتی تھی۔ عارف علی دن بھر تانگے کی مزدوری سے بہ مشکل پانچ چھ روپے کما پاتا تھا۔ اسے تو بہ یک وقت ایک سال کی مزدوری مل رہی تھی اور اتنی ہی رقم کام کی تکمیل پر ملنا تھی۔ کنگن وال والا مکان اس کے علاوہ تھا۔ عارف علی لالچ میں آ گیا اور اس نے میاں خلیل کا کام کرنے کی ہامی بھر لی تاہم اس کام کے لیے اس نے کچھ مہلت مانگی جو میاں خلیل نے اسے فراہم کر دی۔ عارف علی کے ذہن میں شاداں سے جعلی شادی رچانے کا خیال آیا۔ اس طرح وہ بہ آسانی اسے محراب پور سے نکال کر کہیں بھی لے جا سکتا تھا۔ میاں خلیل نے اس کے منصوبے کی تعریف کی اور تاکید کر دی کہ وہ اس کی ''امانت'' میں ''خیانت'' نہیں کرے گا۔ اس دوران میں عارف علی نے ایک چکر کنگن وال کا لگایا اور وہ مکان دیکھ آیا جو میاں خلیل نے اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

معاملات طے پاتے ہی عارف علی نے شاداں سے شادی کی عملی کوشش شروع کر دی۔

دوسری جانب ظہور بی بی بھی یہی چاہتی تھی کہ شاداں جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ میں چلی جائے چنانچہ نہایت سادگی سے ان کی شادی ہوگئی۔

اس کے بعد پیش آنے والے واقعات شاداں کے خط میں بالتفصیل درج تھے۔ عارف علی نے مزید بتایا کہ شاداں کے فرار کے بعد میاں خلیل نے عارف علی کے ساتھ اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اور پوچھتے پوچھتے وہ آخر کار اس اسٹیشن پر آن پہنچے یہاں سے شاداں ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔

میاں خلیل کو معلوم تھا کہ وہ ٹرین کس کس اسٹیشن پر رکتی ہوئی آخر کار کہاں تک جائے گی۔ انہوں نے بذریعہ بس سفر کیا اور راستے میں آنے والے ہر اسٹیشن پر پہنچ کر وہ شاداں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ آخر ان کی کوشش کامیاب ہوئی اور ہمارے علاقے کے ریلوے اسٹیشن سے انہیں پتا چل گیا کہ شاداں وہاں اتری تھی۔ اس وقت رات خاصی گزر چکی تھی۔ بار بار بسیں بدلتے ہوئے انہوں نے یہاں پہنچنے میں خاصا وقت لگا دیا تھا۔

اب عارف علی نے میاں خلیل کے منصوبے پر عمل کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ عارف علی شاداں کو پھسلا بہلا کر فدا حسین کے کوارٹر سے باہر نکالے گا۔ اس دوران میں میاں خلیل ایک طرف اندھیرے میں کھڑا رہے گا۔ اتفاق سے اسٹیشن پر مطلوب علی سے ان کی ملاقات ہوگئی تھی جو کسی کام سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اسی کی زبانی انہیں معلوم ہوا تھا کہ شاداں فدا حسین کے کوارٹر میں ہے۔ انہوں نے مطلوب علی کو بتایا تھا کہ شاداں عارف علی کی بیوی ہے جو گھر سے روٹھ کر چلی آئی تھی اور وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ مطلوب علی شاداں کے معاملے سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا تھا اسی لیے وہ میرے سوالوں سے بوکھلا گیا تھا اور تھانے آ کر بیان لکھوانے سے گریزاں نظر آتا تھا۔ تاہم بتاتا چلوں کہ اس نے جو بیان دیا تھا اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں تھا۔

عارف علی نے فدا حسین کے کوارٹر پر دستک دی۔ شاداں دروازے پر آئی تو عارف علی نے اسے بتایا کہ وہ اس کے اچانک چلے آنے سے بہت پریشان ہوگیا تھا اور اسے تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ شاداں نے میاں خلیل کے حوالے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا تو عارف علی نے کہا کہ وہ میاں خلیل پر لعنت بھیج کر واپس آ گیا ہے اور اب اسے ساتھ لے کر واپس محراب پور جائے گا۔ شاداں تھوڑی دیر پہلے جن حالات سے گزر چکی تھی ان کے پیش نظر وہ ایک لمحہ بھی اس کوارٹر میں رکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ تن بہ تقدیر عارف علی کے ساتھ ہولی۔ عارف علی

نے اسے بتایا کہ اس کا تانگا ادھر دریا کے قریب کھڑا ہے۔ وہ اسے ساتھ لے کر جھاڑیوں کی طرف آ گیا۔ میاں خلیل تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کرتا رہا اور جھاڑیوں میں پہنچ کر وہ کھل کر سامنے آ گیا۔

میاں خلیل کو اپنے سامنے دیکھ کر شاداں کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ایک بار پھر اپنے شوہر کی سازش کا شکار ہوگئی تھی۔ اس نے جان بچانے کے لیے جھاڑیوں میں دوڑنا شروع کر دیا لیکن وہ ان دونوں کے مقابلے میں زیادہ دور تک نہ جا سکی۔ میاں خلیل نے عارف علی کی مدد سے اسے دبوچ لیا۔ شاداں نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ شاداں کی اس حرکت نے میاں خلیل کے حواس گم کر دیے اور وہ بے دریغ اسے مارنے لگا۔ شاداں پٹ رہی تھی اور چیخنا چلانا چاہتی تھی لیکن میاں خلیل نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا رکھا تھا پھر عارف علی بھی شاداں کو قابو کرنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔ شاداں جیسی نرم و نازک لڑکی میاں خلیل جیسے گینڈے کی قوت کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکی اور جلد ہی اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

عارف علی نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا ”کہیں یہ مر تو نہیں گئی؟“

میاں خلیل پر ایک جنون طاری تھا۔ اس نے ہوس ناک انداز میں کہا ”اگر یہ مر بھی گئی ہے تو میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔“

”ایک مردے کا کیا کریں گے' میاں جی!“

”میں نے اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنا بہت سارا وقت اور پیسا خرچ کیا ہے“ میاں خلیل نے زمین پر بے سدھ پڑی ہوئی شاداں کو گھورتے ہوئے کہا ”میں ایک ایک پائی اس سے وصول کروں گا۔ میں اس کو مرنے نہیں دوں گا۔“

پھر وہ جھک کر شاداں کی نبض ٹٹولنے لگا اور جنونی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”میں نے کہا تھا نا' یہ نہیں مرے گی...... نہیں مرے گی۔ جب تک کہ میں اپنے ارمان پورے نہیں کرلوں گا۔ آج میں اس کو بتاؤں گا کہ میاں خلیل سے دور بھاگنے کا کیا انجام ہوتا ہے!“

اس کے بعد وہ کسی بھوکے بھیڑیئے کی طرح شاداں پر ٹوٹ پڑا۔ اس رات میاں خلیل نے شاداں کے ساتھ جو کچھ بھی کیا' تہذیب اس کے بیان کی اجازت نہیں دیتی۔ جب میاں خلیل کے ذہن سے جنس کا بھوت اترا تو اجڑی بجڑی شاداں تصویر عبرت بنی جھاڑیوں میں' فرش زمین پر نیم

جاں پڑی تھی...... اور اسے برباد کرنے والا شیطان اپنے ساتھی کے ہمراہ جا چکا تھا۔

☆☆☆

عارف علی نے اپنا بیان ختم کیا تو میں غصے سے بے قابو ہو گیا اور بے اختیار میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے گال پر رسید کیا ''حرام زادے' کتے کے بچے' نطفہ ناتحقیق! اس بے غیرتی کے مظاہرے سے پہلے تمہیں موت کیوں نہ آ گئی؟''

وہ تھر تھر کانپنے لگا ''آپ نے تو وعدہ کیا تھا' مجھ سے نرمی کا برتاؤ کریں گے'' وہ گھگیایا۔

''نرمی کا برتاؤ!'' میں نے اس کے دوسرے گال پر طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا ''تم میرے نزدیک سخت ترین سزا کے مستحق ہو۔ میرا بس چلے تو میں تمہیں......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ عارف علی آنسوؤں سے روتے ہوئے منت سماجت کرنے لگا ''ملک صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں نادانستگی میں میاں خلیل کا آلہ کار بن گیا تھا۔ اصل قصوروار وہی ہے۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے اس کی بات مان لی۔ اب میں کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ آپ جیسا کہیں گے' میں عدالت میں وہی بیان دوں گا۔ میں کورٹ میں میاں خلیل کے ایک ایک ظلم کی داستان سناؤں گا۔''

میں نے اس کی جانب حقارت سے دیکھا ''بچو' یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ وہ تمہاری ماں کا خصم میاں خلیل تو سیدھا پھانسی کے تختے پر پہنچے گا اور بچ تم بھی نہیں سکو گے۔''

وہ میرے قدموں میں گر پڑا اور میری ٹانگوں کو تھامتے ہوئے بولا ''ملک صاحب! میں واقعی اندر سے بدل گیا ہوں۔ آپ آزما کر دیکھ لیں۔ شاداں تو واپس نہیں آ سکتی لیکن میں سلطانی گواہ بن کر اس کی عزت کے لٹیرے اور اس کے قاتل کو قرار واقعی سزا دلوانے میں قانون کی مدد کر سکتا ہوں۔ میں خود بھی میاں خلیل کو عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''چل' اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو جا'' میں نے پاؤں جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے بارے میں' میں بعد میں فیصلہ کروں گا۔''

وہ کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں بولا ''ملک صاحب! اگر آپ نے مجھے سدھرنے کا ایک موقع دے دیا تو میں تمام عمر آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گا۔''

میں نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور حوالدار کو بلا کر اسے ہدایت کی وہ عارف علی کو لے جا کر حوالات میں بند کر دے۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا ''اور سنو'' وہ رک گیا' میں نے کہا ''فدا حسین ٹکٹ بابو کو میرے کمرے میں بھیج دو۔''

تھوڑی دیر کے بعد فدا حسین میرے سامنے حاضر تھا۔ میں نے اسے سخت تنبیہہ کے بعد جانے کی اجازت دے دی اور ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ وہ علاقے سے باہر جانے سے قبل تھانے میں ضرور اطلاع کرے۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔

دوسرے روز میں نے عدالت میں جا کر میاں خلیل کے وارنٹ گرفتاری حاصل کئے اور پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ کنگن وال روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میاں خلیل بہ آسانی گرفتاری نہیں دے گا لیکن میں تھانے سے یہ فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ اسے ہتھکڑی لگا کر ہی واپس لوٹوں گا۔

میری توقع کے مطابق میاں خلیل نے گرفتاری دینے میں کافی پس و پیش کیا۔ پہلے تو وہ مجھے رشوت پیش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے مجھے ایک لاکھ روپے تک دینے کی کوشش کی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ روپے بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ جب میں نوٹوں کی جھلک دیکھ کر بھی نہ پھسلا تو اس نے مجھے اپنے تعلقات کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں لیکن میں نے کسی دھونس دھمکی کی پروا کئے بغیر میاں خلیل کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔

تیسرے روز میں نے چالان تیار کر کے میاں خلیل اور عارف علی کو عدالت میں پیش کر دیا۔ عارف علی وعدہ معاف گواہ کے طور پر عدالت میں حاضر ہوا تھا۔

عارف علی کا جرم اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ اسے سزا کے بغیر چھوڑ دیا جاتا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ واقعی اندر سے بدل گیا تھا اس لیے میں نے اسے سلطانی گواہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کوئی دو سال تک سیشن کورٹ میں میاں خلیل کا مقدمہ چلتا رہا اور آخر کار اسے سزائے موت سنا دی گئی۔ اس نے سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی لیکن میں نے کیس اتنا مضبوط بنایا تھا کہ اس کی بچت کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا تھا۔ ہائی کورٹ نے سیشن کورٹ کے فیصلے کی توثیق کر دی۔

کچھ عرصے کے بعد میاں خلیل کو پھانسی ہو گئی۔

خس کم' جہاں پاک...... میاں خلیل نے اپنی زندگی میں جو کچھ بویا تھا' اس کا پھل اسے مل

گیا لیکن آج تک ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ شاداں کو آخر کن گناہوں کی سزا ملی تھی۔ شاید وہ جنم جنم کی ستم نصیب لڑکی تھی یا اس میں قدرت کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی۔

ایک اور بات کافی عرصے تک میرے ذہن کو الجھاتی رہی۔ شاداں جھاڑیوں کے بیچ میں سے دریا کے کنارے تک کیسے پہنچی تھی۔ وہ خود اپنے قدموں سے چل کر وہاں تک آئی تھی یا یہ بھی قدرت کا کوئی سربستہ راز تھا۔

میرا خیال ہے' اس سارے معاملے میں دستِ قدرت پوری طرح کارفرما رہا تھا۔ قدرت کی مصلحتوں کو سمجھنا انسانی عقل کے بس کی بات نہیں ہے۔